اقتدار کی مجبوریاں
جنرل مرزا اسلم بیگ کی سوانح حیات
کرنل اشفاق حسین
ادبیات

اقتدار کی مجبوریاں

جنرل مرزا اسلم بیگ کی سوانح حیات

کرنل اشفاق حسین

ادبیات
Rahman Market, Ghazni Street Urdu Bazar Lahore. فون: 042-37232788
E-mail: sulemani@gmail.com 042-37361408
www.sulemani.com.pk, facebook.com/sulemani5

کتاب کا نام	اقتدار کی مجبوریاں
موضوع	جنرل اسلم بیگ کی سوانح حیات
مصنف	کرنل اشفاق حسین
ناشر	حکیم عمار وحید سلیمانی
مطبع	حاجی حنیف پرنٹرز
طبع اوّل	جون ۲۰۲۱ء
طبع دوم	جولائی ۲۰۲۱ء
ٹائٹل ڈیزائن	متین فاروقی، اکرام سلہری
تعداد	۱۰۰۰
قیمت	۶۵۰/- روپے

ISBN: 978-969-9864-10-0

دستیابی

ہیڈ آفس: رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور

✆: 042-37232788, 042-37361408

پاک فوج کے سابق چیف آف آرمی سٹاف جنرل مرزا اسلم بیگ کی سوانح حیات جو کئی مہینوں تک کی گئی ملاقاتوں کے دوران تفصیلی گفتگو سے مرتب کی گئی۔ یہ صرف ایک فرد کی زندگی کی کہانی نہیں ہے بلکہ ہماری قومی زندگی کے کئی اہم واقعات کا احاطہ بھی کرتی ہے اور قومی اور بین الاقوامی امور کے ایسے حقائق کو بے نقاب کرتی ہے جو اب تک اسرار کے پردوں میں چھپے ہوئے تھے۔

ان شہیدوں کے نام
جنھوں نے اپنی جانیں دفاع وطن
میں قربان کردیں

فہرست مضامین

باب چہارم:......فوج کے اعلیٰ سلسلہ اختیارات میں شمولیت

باب پنجم:...... مسلح افواج کا اہم ترین فیصلہ

باب ششم:......فوج کی قیادت سنبھالنے کے بعد اہم اقدامات

باب ہفتم:......سیاسی رہنماؤں کے ساتھ معاملات

باب ہشتم:......ریٹائرمنٹ

میسر آتی ہے فرصت فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندۂ حر کے لیے جہاں میں فراغ

باب نہم: ...... ہماری تاریخ کے اہم باب

باب دہم: ...... حالات حاضرہ پر تبصرے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

پاکستان ملٹری اکیڈمی پاک فوج کا وہ مایہ ناز ادارہ ہے جہاں مستقبل کی عسکری قیادت تیار ہوتی ہے۔ یہاں آنے والے کیڈٹ معاشرے کے ہر طبقے سے متعلق ہوتے ہیں' غریب بھی' امیر بھی' متوسط اور پسماندہ گھرانوں سے بھی لیکن یہاں سب سے یکساں سلوک کیا جاتا ہے اور ان کی جانچ پڑتال' ان کی کارکردگی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ کئی مرتبہ یوں ہوا کہ غریب گھرانوں' عام سپاہیوں یا جونیئر کمیشنڈ افسروں کے بیٹوں نے اعزازی شمشیر حاصل کی اور جنرل کے عہدوں تک پہنچے۔ پاک فوج کے ایک سپہ سالار ایک صوبیدار میجر کے بیٹے تھے۔ دو سپہ سالار جوان بھرتی ہو کر آرمی چیف بنے۔ ابتدائی انٹرویو کے بعد انہیں انٹر سروسز سیلیکشن بورڈ (آئی ایس ایس بی) میں جانچا پرکھا جاتا ہے جس کا نظام انتہائی شفاف ہے۔ پاک فوج ہو' پاک بحریہ یا پاک فضائیہ' تینوں افواج میں کمیشن حاصل کرنے کے لئے امیدواروں کو آئی ایس ایس بی کی چھلنی سے گذرنا پڑتا ہے۔

چونکہ انتخاب کا معیار کافی کڑا ہوتا ہے اس لئے کامیاب ہونے والے امیدواروں کی تعداد انتہائی قلیل ہوتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ لڑکوں کی نسبت لڑکیوں کی کامیابی کا تناسب بہتر ہوتا ہے۔ چونکہ مجموعی طور پر کامیابی کا تناسب قلیل ہوتا ہے' اس لئے یہ بات مشہور ہوگئی ہے کہ کسی جنرل کی سفارش کے بغیر آئی ایس ایس بی میں کامیابی ممکن نہیں۔ یہ انتہائی غلط تاثر ہے۔ ہم نے کئی بار سینئر افسروں کے بچوں کو ناکام اور عام سپاہیوں' نان

کیمشنڈ افسروں، جونیئر کیمشنڈ افسروں اور غریب گھرانوں کے بچوں کو کامیاب ہوتے دیکھا ہے۔ میں اپنی مثال پیش کرتا ہوں۔ میرا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ میرے والد ایک چھوٹی سے بیکری چلاتے تھے۔ میں پہلی کوشش ہی میں آئی ایس ایس بی میں کامیاب ہوگیا لیکن میرا بیٹا پہلی کوشش میں ناکام ٹھہرا جبکہ اس وقت میں حاضر سروس لیفٹیننٹ کرنل تھا۔

اس کے بعد طبی معائنے کا مرحلہ آتا ہے جس میں انگ انگ اور جوڑ جوڑ کو بڑی باریک بینی سے دیکھا جاتا ہے۔ اس میں ہر امیدوار کو بڑے نازک مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ طبی معائنے میں کامیابی کے بعد پاک فوج میں کمیشن حاصل کرنے کے خواہشمند افراد کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول، پاک بحریہ کے امیدواروں کو پاکستان نیول اکیڈمی منوڑہ اور پاک فضائیہ کے امیدواروں کو پاکستان ائرفورس اکیڈمی رسالپور بھیجا جاتا ہے۔ ظاہر ہے تینوں سروسز کا دائرہ کار مختلف ہے اس لئے ان کی تربیت گاہیں بھی مختلف ہیں اور تربیتی انداز بھی مختلف ہے۔

پی ایم اے کے کیڈٹ کاکول اور گردونواح کی پہاڑیوں میں خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ نیول اکیڈمی کے کیڈٹ سمندر کے پانیوں میں غوطے کھاتے ہیں اور ائرفورس کے کیڈٹ فضاؤں میں اڑتے ہوئے اپنے انسٹرکٹروں کی طرف سے ایسی زبان میں ڈانٹ ڈپٹ سنتے ہیں جو اس سے پہلے ان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں ہوتی:

کبھی اس مکاں سے گذر گیا، کبھی اس مکاں سے گذر گیا
تیرے آستاں کی تلاش میں، میں ہر آستاں سے گذر گیا
کبھی تیرا در، کبھی در بدر، کبھی عرش پر، کبھی فرش پر
غم عاشقی تیرا شکریہ میں کہاں کہاں سے گذر گیا

انتخاب کے مرحلوں اور پاکستان ملٹری اکیڈمی میں گذرنے والے لمحات کی کہانی ہم نے شگفتہ انداز میں اپنی پہلی کتاب ''جنٹل مین بسم اللہ'' میں بیان کی ہے جو آپ بیتی کی شکل میں دراصل جگ بیتی ہے۔ پاک فوج کے ہر افسر کی کہانی ہے۔ کرنل ہو یا جنرل، کمیشن حاصل کرنے کے لئے انہیں پاکستان ملٹری اکیڈمی کے پل صراط ہی سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کتاب کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ تادم تحریر اس کے اٹھائیس ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اسی حقیقت کے پیش نظر ذہن میں تجویز آئی کہ کیوں نہ پاک فوج کے سربراہوں سے گفتگو کی جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ جب وہ کیڈٹ تھے تو ان پر کیا گزری، اور کمیشن کے بعد فوج کی سربراہی تک کن مراحل سے گزرنا پڑا، کیا کیا تجربات حاصل کئے۔ خیال تھا کہ یہ کہانیاں نہ صرف دلچسپی سے پڑھی جائیں گی بلکہ ہمارے آفیسرز اور جوانوں کے لئے مشعل راہ بھی ثابت ہوں گی کہ کیسی کیسی قد آور شخصیتوں کو کن کن کٹھن گھاٹیوں سے گزرنا پڑا ہے۔

سب سے پہلے جنرل مرزا اسلم بیگ کا انتخاب کیا۔ ان سے پہلے جتنے بھی پاک فوج کے سربراہ رہے، دنیائے فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔ جنرل اسلم بیگ ماشاءاللہ نہ صرف حیات ہیں بلکہ وہ پاک فوج کے پہلے سربراہ ہیں جن کی تربیت پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ہوئی۔ ان سے پہلے کے سپہ سالار یا تو برطانیہ کی رائل ملٹری اکیڈمی سینڈہرسٹ کے تربیت یافتہ تھے یا ان اداروں کے جو برطانیہ نے برصغیر ہند میں قائم کئے۔ قارئین کی دلچسپی کے لئے ان تمام پاک فوج کے سربراہوں کے نام اور تفصیل بیان کی گئی ہے جنہوں نے قیام پاکستان کے بعد بری فوج کی کمان سنبھالی:

پاک فوج کے سربراہ کا نام	عرصہ قیادت	مقام تربیت
جنرل سر فرینک مسروی	۱۵ اگست ۱۹۴۷ تا ۱۰ فروری ۱۹۴۸	رائل ملٹری اکیڈمی سینڈ ہرسٹ' برطانیہ
جنرل ڈگلس گریسی	۱۱ فروری ۱۹۴۸ تا ۱۶ اپریل ۱۹۵۱	ایضاً
فیلڈ مارشل محمد ایوب خان	۱۷ جنوری ۱۹۵۱ تا ۲۶ اکتوبر ۱۹۵۸	ایضاً
جنرل محمد موسیٰ	۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ تا ۱۷ دسمبر ۱۹۶۶	رائل انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون' انڈیا
جنرل آغا محمد یحییٰ خان	۱۸ دسمبر ۱۹۶۶ تا ۲۰ دسمبر ۱۹۷۱	ایضاً
لیفٹیننٹ جنرل گل حسن	۲۰ دسمبر ۱۹۷۱ تا ۳ مارچ ۱۹۷۲	ایضاً
جنرل ٹکا خان	۳ مارچ ۱۹۷۲ تا یکم مارچ ۱۹۷۶	ایضاً
جنرل محمد ضیاء الحق	یکم مارچ ۱۹۷۶ تا ۱۷ اگست ۱۹۸۸	آفیسرز ٹریننگ سکول انڈیا
جنرل مرزا اسلم بیگ	۱۷ اگست ۱۹۸۸ تا ۱۶ اگست ۱۹۹۱	پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول

اپنی کتاب "(Witness to Blunder)(اردو ترجمہ جنٹل مین استغفر اللہ)" لکھتے ہوئے بھی ہم نے جنرل مرزا اسلم بیگ سے رہنمائی حاصل کی تھی اور انہوں نے بڑی شفقت سے مفید مشورے دیے۔ایک خط لکھ کر انہیں ای میل کر دیا اور پی ایم اے کی زندگی کے بارے میں ایک سوال نامہ بھی بھیجا۔دوسرے دن ای میل کی وصولی کی تصدیق کرنے کے لئے میں ان کے سیکرٹری کو فون کیا۔فون جنرل بیگ نے خود اٹھایا۔ایک لمحے کے لئے تو ہم گڑبڑا گئے مگر اپنے حواس کو سنبھالا اور مدعا بیان کیا۔انہوں نے بغیر کسی تامل کے ہاں کر دی اور اسی دن تحریری جواب بھی آ گیا۔

اپریل کے ابتدائی دنوں کی ایک خوشگوار صبح تھی جب ہم اپنے کیمرہ مین محمد امین کو ساتھ لئے ان کے ہاں حاضر ہوئے۔چھوٹے سے لان میں ایک طرف بوگن ویلیا اپنے جوبن پر تھا۔دوسری طرف کیاریوں میں پٹونیا کے رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے۔کینوں کے درخت بھی تھے جن پر موسم نہ ہونے کی وجہ سے ابھی پھل نہ آئے تھے۔

ان کے سیکریٹری صادق حسین صاحب نے ہمارا استقبال کیا اور ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئے۔کیمرہ مین امین ابھی اپنا سازوسامان ترتیب دینے ہی میں مصروف تھے کہ جنرل صاحب تشریف لے آئے۔سفید کرتے شلوار میں ملبوس ان کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ابتدائی علیک سلیک کے بعد انہوں نے پوچھا:"کہاں سے شروع کریں گے؟"

"سر!پی ایم اے سے ذرا پہلے سے'کالج کے دنوں سے'یا بہتر ہوگا پہلے'خاندانی پس منظر سے شروع کریں۔"

انہوں نے دھیمے دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔

یہ نشست تقریباً تین گھنٹے تک جاری رہی۔انتہائی دلچسپ اور سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ہمارا ارادہ تو صرف پاکستان ملٹری اکیڈمی کے قیام کے بارے میں گفتگو کرنا تھا لیکن حکایت چونکہ دلچسپ تھی اس لئے درازتر ہوتی گئی۔پی ایم اے کی باتیں ختم ہوئیں تو کیریئر کے ابتدائی دنوں کا ذکر چھڑ گیا اور پھر یہ سلسلہ جاری رہا۔وہ تھکتے تھے نہ ہمیں تکان ہوئی۔درازی عمر کے باوجود ماشاءاللہ چاق و چوبند ہیں۔ہفتے میں ایک دن ملاقات ہوتی تھی۔

پہلے تو سوال و جواب ہوتے تھے پھر انہوں نے خود ہی زندگی کے مختلف واقعات لکھنے بھی شروع کر دیے جن میں کانٹ چھانٹ کا اختیار انہوں نے بڑی فراخ دلی سے ہمیں دے رکھا تھا اور دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی سے متعلق باتیں ایک بڑی دلچسپ اور سبق آموز داستان بن گئی ہے جو اس کتاب کی تکمیل کے آخری دنوں تک جاری رہی۔ہم نے مختلف مواقع پر ان سے بڑے تلخ سوالات بھی کئے لیکن انہوں نے بڑے تحمل اور بردباری سے جواب دیے اور یوں ان کی سوانح عمری تیار ہو گئی جو نہ صرف ان کی

کہانی ہے بلکہ ان کے عہد کے اہم واقعات سے بھی پردہ اٹھاتی ہے۔ یہ ان کی اپنی پہچان بھی ہے' ایک مخصوص سوچ و فکر اور ایمان و یقین کی دلچسپ داستان ہے جو قومی معاملات کے بعض اہم گوشوں سے بھی پردہ اٹھاتی ہے۔

متن کو ٹائپ کرنے اور ابتدائی مسودے کی تیاری کا کام صادق حسین جعفری نے انجام دیا جو ۱۹۸۷ء سے ان کے سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ کمپیوٹر پر کمپوزنگ اور نوک پلک سنوارنے کا کام محمد علی عمر نے کیا جو فرینڈز کے کمپیوٹر سیکشن میں کام کرتے رہے ہیں۔ میں اور جنرل اسلم بیگ تہہ دل سے ان کے شکر گزار ہیں۔

کرنل اشفاق حسین
15 فروری 2021ء
ashfaq801@hotmail.com
فون نمبر: 0323-5208220

''اقتدار کی مجبوریاں''

وجہ تسمیہ

کرنل اشفاق نے جو کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' پاکستان ملٹری اکیڈمی میں میرے قیام اور کارگل کی جنگ کے حوالے سے مجھ سے بہت سے سوالات پوچھے اور ساتھ ہی مجھے ترغیب بھی دیتے رہے کہ میں اپنی کتاب بھی لکھوں۔ کتاب لکھنا تو مشکل کام ہے البتہ ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ وہ مجھ سے سوالات پوچھتے جائیں اور میں جواب دیتا جاؤں تو شاید ایک کتاب بن جائے۔ یہ تجربہ دلچسپ ثابت ہوا اور کئی مہینوں کی لمبی نشستوں کے بعد انہوں نے اسے کتاب کی شکل دے دی ہے اور اب کرنل اشفاق کی ترمیم و تصحیح کے بعد مسودہ تیار کرنے کی ذمہ داری میرے سیکرٹری صادق حسین کی ہے جن کی اس عرق ریزی کے سبب اس کتاب کو مکمل کرنا میرے لئے بہت آسان ہو گیا ہے۔

کرنل اشفاق نے اس کے خدوخال درست کئے اور کہا کہ ''اس کا عنوان بتایئے۔'' کئی عنوان ذہن میں آئے لیکن مناسب نہ لگے۔ اسی تلاش میں تھا کہ جنرل ضیاء الحق کے یہ الفاظ ذہن میں بار بار آتے رہے: ''اقتدار کی کچھ مجبوریاں'' ہوتی ہیں۔ (باب سوئم' صفحہ 124)

اس وقت تو بات سمجھ میں نہ آئی لیکن اس کتاب کا عنوان سوچتے ہوئے ایک دن ان کا قول یاد آ گیا اور کتاب کے لئے ایک ایسا عنوان مل گیا جس میں ایک پیغام پوشیدہ ہے کہ ہمارے حکمران ''اقتدار کی مجبوریوں'' کے سبب کس قدر بے بس ہو جاتے ہیں کہ قومی غیرت تک کو بھی داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ اقتدار کی ان مجبوریوں کے تحت جو اقدامات کئے گئے ان کی تشریح کتاب میں موجود ہے۔ مثلاً:

☆ جنرل محمد ایوب خان کی مجبوری تھی کہ انہوں نے اقتدار جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر دیا۔ (باب نہم، صفحہ 271)

☆ جنرل یحییٰ خان کی مجبوری تھی کہ وہ 3 مارچ 1971ء کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اجلاس کا اعلان کر کے اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔ (باب نہم، صفحہ 266)

☆ جنرل ضیاء الحق کی مجبوری تھی کہ انہوں نے اپنے وعدے کے خلاف بھٹو کے پروانۂ موت (Death Warrant) پر دستخط کر دیے۔ (باب چہارم، صفحہ 111)

☆ اسی طرح ان کی مجبوری تھی کہ ہماری سفارشات کے باوجود انہوں نے اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل نہیں کیا۔ (باب پنجم، صفحہ 140)

☆ جنرل پرویز مشرف کی مجبوری تھی کہ وہ غیروں کے ساتھ مل کر افغانستان کے خلاف جنگ میں شامل ہو گئے۔ (باب ہشتم، صفحہ 230)

☆ اقتدار کی ہوس میں" ہمارے ارباب فکر و نظر، اندیشہ، سود و زیاں کے تحت اپنی زبان بند رکھتے ہیں۔ حکمرانوں کو روکتے نہیں، ٹوکتے نہیں۔ یہی ہمارا المیہ ہے۔ (باب پنجم صفحہ 232)

اس کتاب میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ میرے علم کی حد تک سچ اور صرف سچ پر مبنی ہے۔ سچائی کی وجہ سے میں نے کئی بار نقصان بھی اٹھایا جس کی تفصیل کتاب میں موجود ہے لیکن حق نے مجھے سرخرو کیا جس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر گزار ہوں۔ میں دعا گو ہوں اور اپنے قارئین سے بھی التماس دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے آخرت میں بھی کامیابیاں عطا فرمائے کہ وہی حقیقی کامیابی ہے۔

مرزا اسلم بیگ

friendscolumn@hotmail.com

یکم مارچ 2021ء

باب اول

آباؤ اجداد اور ابتدائی زندگی

جنرل مرزا اسلم بیگ کے آباؤ اجداد کا تعلق چیچنیا سے تھا، جنہوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں ازبکستان کی جانب ہجرت کی اور وادی فرغانہ میں آ کر آباد ہوئے جو برصغیر ہند میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر کی جائے پیدائش ہے۔ فرغانہ اندیمان کا دارلحکومت تھا۔ بابر ایک جفاکش سپاہی، بہترین منتظم اور سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب طرز ادیب بھی تھے۔ بارہ سال کی عمر میں اپنے والد عمر شیخ مرزا کی وفات پر 5 رمضان 998ھ (بمطابق 6 جون 1494ء) کو تخت نشین ہوئے۔ تخت نشینی کے فوراً بعد ان کی کم سنی کو دیکھتے ہوئے ان کے تایا سلطان احمد مرزا اور ماموں سلطان محمود خان نے ان کی سلطنت کو ہتھیانا چاہا اور شمال اور جنوب کی طرف سے فوج کشی کی لیکن فتح حاصل کرنے میں ناکام رہے۔ بابر نے تزک بابری میں اپنی سلطنت کا جغرافیہ اور خود کو پیش آنے والے حالات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں۔

جنرل اسلم بیگ کے آباؤ اجداد اس مشکل وقت میں بابر کی سپاہ کا حصہ رہے اور انہوں نے قابل قدر خدمات انجام دیں۔ 'مرزا' اور 'بیگ' کے سابقے اور لاحقے انہی دنوں کی یادگار ہیں۔ 'مرزا' فارسی کے لفظ "میرزادہ" کا مخفف ہے، جس کا مطلب ہے کسی شہزادے کا بیٹا اور یہ لقب کسی قبیلے کے سردار، عسکری کمانڈر یا عالم کو دیا جاتا تھا۔ 'بیگ' ترکی کا لفظ ہے جو انہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح چغتائی، بخاری، لودھی، غوری، مغل اور برلاس جیسے لفظ وہ لوگ اپنے ناموں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں جن کے آباؤ اجداد کا تعلق شمالی ایشیائی ریاستوں سے تھا۔ ظہیر الدین بابر خود تخت نشینی سے پہلے مرزا بابر کہلاتے تھے اور ان کا تعلق برلاس قبیلے سے تھا۔ بابر ترکی زبان میں شیر کو کہتے ہیں۔

شہنشاہ جہانگیر کے دور میں اسلم بیگ کے بزرگ مرزا مسلم بیگ کو گنگا جمنا کے سنگم کے قریب اعظم گڑھ شہر سے تقریباً12 کلومیٹر کے فاصلے پر تعینات کیا گیا جو شورش زدہ علاقہ تھا۔ انہیں وہاں جاگیر دی گئی جسے انہوں نے مسلم پٹی کا نام دیا اور وہیں مستقل سکونت اختیار کی۔ یہ آبادی آج بھی موجود ہے۔

1857ء میں جب مسلمانوں اور ہندوؤں نے مغلیہ حکومت کو بحال کرنے کی آخری کوشش کی تو مسلم پٹی کے تقریباً500 جوان ایک توپ لے کر مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کی مدد کے لئے نکلے اور دہلی کی طرف روانہ ہوئے لیکن مقامی لوگوں نے دھوکہ دیا اور مخبری کر دی۔ انگریز فوج نے انہیں گھیر لیا اور دہلی پہنچنے سے پہلے ہی اکثر لوگوں کو شہید کر دیا۔ گنتی کے چند افراد ہی واپس پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ اس واقعے کے بعد مسلم پٹی کی جاگیر مسلمانوں سے واپس لے کر ایک ہندو راجہ کے حوالے کر دی گئی۔ گوگل سے لئے گئے نقشے میں اعظم گڑھ میں واقع جنرل اسلم بیگ کے آبائی گھر، جامع مسجد اور شبلی نیشنل کالج کی نشاندہی کی گئی ہے۔

گوگل کے نقشے پر مسلم پٹی کا مقام طول بلد اور عرض بلد 26.0899896 and 82.9885502

اس راجہ نے اپنی پرجا سے اچھے تعلقات قائم رکھے۔ اس کے پاس کئی ہاتھی بھی تھے جو شادی بیاہ کے موقعے پر لوگ مستعار لے جاتے تھے۔ جنرل اسلم بیگ کو اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد ہے جب ان کے رشتہ داروں میں کسی شادی کے لئے تین ہاتھی ادھار لئے گئے تھے۔ ہاتھیوں کو سجایا گیا' برات روانہ ہوئی تو اسلم بیگ بھی ایک ہاتھی پر سوار تھے۔ واپسی پر رات ہو گئی۔ چاندنی رات کے سناٹوں میں ہاتھیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹیوں کی مترنم آوازیں آج بھی اسلم بیگ کی یادوں میں محفوظ ہیں۔

یہی ہاتھی سزا کے طور پر بھی استعمال ہوتے تھے۔ کوئی آدمی شرارت کرتا' پڑوسیوں کو تنگ کرتا یا نقض امن کا مرتکب ہوتا تو راجہ ایک ہاتھی اس کے گھر پر بھجوا دیتا کہ اس کی دیکھ بھال کرو۔ بچوں کو تو ایک مشغلہ ہاتھ آ جاتا کہ ہاتھی اپنی سونڈ پر بٹھا کر انہیں جھولا جھلاتا لیکن صاحب خانہ پر قیامت گزر جاتی۔ خود کھاؤ نہ کھاؤ لیکن ہاتھی کے چارے پانی کا انتظام لازم ہوتا۔ اب ایک ہاتھی کو ایک دن میں سو کلوگرام کے قریب چارہ چاہیے۔ سبزی خور جانور' گھاس پات' پتے' پھل' درختوں کی چھال پر گذارہ کر لیتا ہے لیکن غربت کے مارے یاسی اس کا انتظام کہاں سے کرتے۔ چند ایک دنوں ہی میں ہوش ٹھکانے آ جاتے اور راجہ سے معافی کے خواستگار ہوتے۔

مرزا مسلم بیگ کے پڑپوتے مرزا کفایت اللہ بیگ کے دو بیٹے' مرزا مصطفیٰ بیگ اور مرزا مرتضیٰ بیگ' بالترتیب 1889ء اور 1891ء میں مسلم پٹی میں پیدا ہوئے جو اعظم گڑھ' صوبہ اتر پردیش بھارت میں واقع ہے (گوگل پر مسلم پٹی کا محل وقوع 26.0899896 اور 82.9885502)۔ وہ ابھی چھ اور آٹھ سال کے ہی تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ ان کے ماموں محمد سمیع نے جو جونپور شہر میں سرکاری افسر تھے' ان کی کفالت کا ذمہ اٹھایا۔ دونوں بچوں نے میٹرک کے امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کئے اور الہ آباد یونیورسٹی پہنچ گئے جہاں انہوں نے 1914ء اور 1916ء میں بالترتیب گریجویشن اور ایل ایل بی کی ڈگریاں لیں۔ مرزا اسلم بیگ کے چچا مرزا مصطفیٰ بیگ نے 1915ء میں اعظم گڑھ میں قانون کی

پریکٹس شروع کی اور اس غرض سے جامع مسجد کے قریب ایک مکان کرائے پر لیا اور وہاں رہنے لگے۔ بدقسمتی سے مرزا مصطفیٰ بیگ ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور انہیں علاج کے لیے المورہ کے ہل اسٹیشن لایا گیا جہاں 9 مئی 1916ء کو ان کا انتقال ہوا۔ ان کی شادی ہو چکی تھی لیکن کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ وہیں پر مدفون ہیں۔

مرزا اسلم بیگ کے والد مرزا مرتضیٰ بیگ نے 23 اگست 1917ء کو قانون کی پریکٹس شروع کی اور اسی مکان میں رہے جو ان کے بڑے بھائی نے کرائے پر لیا تھا۔ ان کی شادی نجیب اللہ بیگ کی صاحبزادی شافیہ بیگم سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں کثیر اولاد عطا کی جن میں آٹھ بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں۔ سخت محنت کر کے انہوں نے اپنے شعبے میں نمایاں مقام حاصل کیا اور ان کا شمار اعظم گڑھ کے چوٹی کے وکلاء میں ہونے لگا۔ انہوں نے الہ آباد ہائی کورٹ میں بھی پریکٹس کی۔

اسلم بیگ کہتے ہیں:

"ہمارے والد صبح دس بجے اپنے چیمبر جاتے اور پانچ بجے واپس آتے۔ تھوڑا آرام کر کے کلب جاتے جہاں ٹینس کھیلتے اور دوست احباب سے ملاقاتیں رہتیں۔ رات کو بارہ بجے تک مقدمات کی تیاری کرتے اور اس کے بعد جاگتے رہتے۔ میرا انتظار کرتے جب تک کہ میں اپنی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی مصروفیات سے فارغ ہو کر گھر واپس نہ آ جاتا۔"

بس اتنا پوچھتے:

"اسلم آ گئے ہو، سو جاؤ"

"جی ابا، آپ کیوں جاگ رہے ہیں، سو جائیے۔"

انہوں نے مجھے کبھی روکا نہیں، ٹوکا نہیں۔ انہیں مجھ پر بھرپور اعتماد تھا۔ ایم ایس ایف کے کام کی اجازت تھی۔

اسلم بیگ کے بڑے بھائی، مرزا ارشد بیگ کراچی میں سیشن جج رہے ہیں۔ ان کے

بڑے صاحبزادے مرزا عادل بیگ وکالت کے پیشے سے منسلک ہیں اور کراچی بار کے صدر بھی رہ چکے ہیں۔ مرزا اشہد بیگ اور مرزا افضل بیگ نے الہ آباد یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ مرزا اشہد بیگ نے کچھ عرصہ تک حبیب بینک کی ملازمت کی لیکن اسے چھوڑ کے ذاتی کاروبار شروع کیا اور کامیاب رہے۔ مرزا افضل بیگ اعظم گڑھ میں ہوتے ہوئے 1948ء میں ڈھاکہ میں آئی ایس ایس بی میں پیش ہوئے اور کامیابی کے بعد انہوں نے پاکستان ملٹری اکیڈمی میں پہلے گریجویٹ کورس میں شمولیت اختیار کی۔ پاسنگ آؤٹ کے بعد انہیں 2 فیلڈ آرٹلری میں پوسٹ کیا گیا۔ بعد میں انہوں نے 74 اینٹی ائر کرافٹ (طیارہ شکن) رجمنٹ کی کمان کی۔ 1971ء کی جنگ میں انہوں نے ماڑی پور ائر بیس کا دفاع کیا۔ دشمن کے جہازوں کو دور رکھا لیکن دشمن بزدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آبادی والے علاقوں پر بم پھینک کر فرار ہوئے۔ ایک بم کرنل افضل بیگ کے اپنے گھر ڈی ایچ اے ون (DHA-1) پر گرا جس سے گھر مکمل طور پر تباہ ہو گیا۔ شاید بھارتی ائر فورس نے انہیں ماڑی پور ائر بیس کے تحفظ کی سزا اس طرح دی۔

کرنل افضل بیگ نے میری سرپرستی کی اور بڑا بھائی ہونے کا حق ادا کیا۔ فوج میں شروع کی زندگی میں ان کی ہدایات میرے لئے بڑی تقویت کا باعث رہیں۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی تنہا محسوس نہیں کیا۔ ان کے بیٹے مرزا شہاب بیگ ایف آر سی ایس (FRCS) پلاسٹک سرجری میں پاکستان کے چوٹی کے سرجنوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

چھوٹے دو بھائی، مرزا اظفر بیگ اور مرزا اظہر بیگ علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئے۔ مرزا اسد بیگ تیرہ برس کے تھے جب اعظم گڑھ میں ایک حادثے میں ان کا انتقال ہو گیا۔ مرزا اسعد بیگ نے کراچی سے ایل ایل بی کیا اور وکالت کی۔ مرزا اظفر بیگ نے نیوکلیئر سائنس میں ایم ایس سی کیا۔ 1962ء میں پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں شمولیت اختیار کی۔ امریکہ سے نیوکلیئر انجینئرنگ میں ایم ایس (MS) کی ڈگری حاصل کی اور امریکہ کے اٹامک انرجی کمیشن سے مخصوص (Specific) ایٹمی پاور پلانٹ چلانے کا لائسنس حاصل

کیا۔1969ء میں پاکستان واپس آئے اور کراچی نیوکلیئر پاور پلانٹ (KANUPP) چلانے والی ٹیم میں شامل ہوئے اور ڈپٹی پلانٹ منیجر کی حیثیت سے کام جاری رکھا۔

1984ء میں چشمہ نیوکلیئر پاور پلانٹ (CHASNUPP) میں ڈیزائن اور انجینئر نگ ٹیم کے سربراہ مقرر ہوئے جو ایک سو(100) اعلیٰ تربیت یافتہ انجینئروں اور سائنسدانوں پر مشتمل تھی۔ بیلجیم سے ایٹمی پاور پلانٹ ڈیزائن کی تربیت حاصل کرنے کے لیے ان کی زیرقیادت چالیس ممبروں پر مشتمل ایک ٹیم منتخب کی گئی جس نے چشمہ پاور پلانٹ کو تکنیکی معاونت فراہم کی۔ 1992ء میں چشمہ نیوکلیئر پاور پلانٹ (سی ون) کے لیے چین کے ساتھ معاہدے پر دستخط ہوئے اور انہیں پراجیکٹ کے جنرل منیجر کے عہدے پر ترقی ملی۔1998ء میں انہوں نے ریٹائر ہونا تھا لیکن منصوبے کی تکمیل کے لیے ان کی سروس میں تین سال کی توسیع کر دی گئی۔ بعد میں چین نے ان کی خدمات حاصل کر لیں اور انہیں کن شان (Qin Shan) کے مقام پر تیار ہونے والے 600 میگاواٹ کے بھاری پانی کے پلانٹ کا کمیشنگ کنسلٹنٹ مقرر کر دیا جو کینیڈا کی ٹیم بنا رہی تھی۔ اب وہ ریٹائرڈ زندگی گذار رہے ہیں۔

میرے چھوٹے بھائی پروفیسر ڈاکٹر مرزا اظہر بیگ 16 جون 1940ء کو اعظم گڑھ' اتر پردیش' بھارت میں پیدا ہوئے۔ان کا تعلیمی کیریئر بہت شاندار ہے۔1953 میں میٹرک اور 1955ء میں شبلی کالج اعظم گڑھ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ ایم ایس سی میں گولڈ میڈل حاصل کرنے کی بنا پر انہیں سکالرشپ ملا۔1960ء میں ہجرت کر کے پاکستان آ گئے اور دو سال تک ایڈورڈ کالج پشاور میں پڑھاتے رہے۔اس کے بعد زرعی یونیورسٹی لائل پور (موجودہ فیصل آباد) میں شعبہ زوالوجی سے منسلک ہو گئے جہاں سے انہیں امریکہ میں پی ایچ ڈی کرنے کی سکالرشپ ملی۔ پانچ سال تک زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں شعبہ سائنسز کے ڈین(Dean) رہنے کے بعد 1989ء میں ریٹائر ہوئے۔

یونیورسٹی میں 39 سالہ سروس کے دوران ان کے سو سے زیادہ تحقیقی مقالے بین الاقوامی

شہرت کے حامل جریدوں میں شائع ہوئے۔ ان کے دس شاگردوں نے پی ایچ ڈی کی سکالرشپ حاصل کی۔ زرعی یونیورسٹی فیصل آباد سے ریٹائرمنٹ کے بعد بارانی یونیورسٹی راولپنڈی سے منسلک ہو گئے جہاں ان کے تین شاگردوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ان کی طویل خدمات کے صلے میں انہیں اعزازات سے نوازا گیا:

☆ تعلیم اور زرعی تحقیق کے لئے ڈاکٹر خان اے رحمٰن ایوارڈ برائے سال 1996ء
☆ تدریس اور تحقیق کے لئے ڈاکٹر زیڈ اے ہاشمی ایوارڈ برائے سال 1997ء

بہنیں سروری بیگم' یاسمیں بیگم اور افسری بیگم نے مدرسہ نسواں سے تعلیم حاصل کی۔ سروری بیگم کو لکھنے پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کی اپنی لائبریری تھی اور وہ کئی رسائل میں لکھتی رہتی تھیں۔ سب بھائی تعلیم مکمل ہونے کے بعد پاکستان آ گئے تھے اور بہنیں بھی شادی کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئیں۔ والدین 1967ء میں پاکستان آئے۔

ہم بہن بھائیوں کی پرورش' تعلیم و تربیت ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی' جسے نبھانے میں ہمارے والدین نے اپنی زندگی وقف کر دی۔ ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ سیر و تفریح کے لئے کہیں گئے ہوں۔ سال میں صرف ایک ہفتے یا دس دن کے لئے گرمی کی چھٹیوں میں آبائی گھر مسلم پٹی جاتے تھے تاکہ عزیزوں اور دوستوں سے مل سکیں اور بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھ سکیں۔ انہوں نے ہماری تعلیم و تربیت کو ہر ضرورت پر ترجیح دی۔ ہمارے لئے ایک معمول تھا کہ جب چھ سال عمر ہوتی تو جامع مسجد کے مدرسے میں داخل کرا دیا جاتا جہاں ہم قرآن وسنہ اور صوم وصلوٰۃ کی تعلیم حاصل کرتے۔ گھر پر مولوی صاحب دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی بھی پڑھاتے۔

میں آٹھویں کلاس میں تھا تو گلستان ختم کر چکا تھا اور ماسٹر صاحب سید آصف حسین' دوسرے مضامین میں ہمیں ٹیوشن دیتے اور ہم بڑی آسانی سے ہر مضمون میں پاس ہو جاتے۔ پڑھنے کے ساتھ ساتھ کھیلوں میں بھی ہم سب بھائی شامل رہے۔ ہاکی ہمارا خاندانی کھیل تھا۔ بڑے بھائی مرزا ارشد بیگ الہ آباد یونیورسٹی کے چیمپئن تھے۔ چھوٹے بھائی

اظہر بیگ علی گڑھ یونیورسٹی کی ٹیم کے ممبر تھے۔ بڑے بھائی افضل بیگ، اشہد بیگ، میں اور چھوٹے بھائی اظفر بیگ کالج کی ٹیم کے ممبر تھے۔ میں شبلی کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان بھی رہا ہوں۔

1959ء میں جب میں ایس ایس جی میں تھا اس وقت میری شادی اسما محمود شوکت انصاری سے طے ہوئی۔ وہ حیدرآباد دکن میں تھیں، پاکستان آئیں اور پشاور میں اپنے چچا کرنل مسعود رفعت انصاری کے ہاں قیام کیا۔ 21 جون 1959ء کو ہماری شادی ہوئی۔ اسما محمود شوکت انصاری کا تعلق حیدرآباد دکن کے انصاری خاندان سے ہے۔ ان کے دادا حمیدالدین انصاری چند کتابوں کے مصنف اور حیدرآباد یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی رہ چکے تھے۔ ان کے والد محمود شوکت انصاری سقوط حیدرآباد کے وقت کرنل کے عہدے پر تھے۔ بعد میں انہوں نے استعفیٰ دے دیا تھا۔ ان کے چھوٹے بھائی مسعود رفعت انصاری پاکستان آگئے تھے اور آرمی سروس کور میں کرنل تھے۔
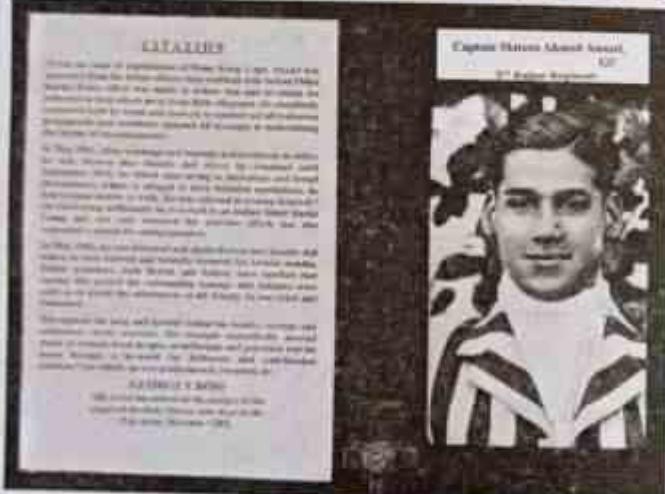
جنرل اسلم بیگ اپنی اہلیہ اسماء محمود شوکت انصاری کے ساتھ

تیسرے بھائی متین احمد انصاری 5/7 راجپوت رجمنٹ میں کیپٹن تھے۔ برما کی جنگ میں جاپانیوں کے ہاتھوں قید ہوئے اور قید کے دوران ہی انہیں بیدردی سے قتل کر دیا گیا

کیونکہ انہوں نے انڈین نیشنل آرمی میں شامل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس جرم میں انہیں قید میں ڈال دیا گیا' قید سے فرار ہونے کی کوشش کی لیکن ان کے ساتھیوں نے دھوکہ دیا' گرفتار کیے گئے اور سخت ترین درجے کی سزائیں دی جانے لگیں۔ وہ قرآن پاک کے حاشیے پر ان سزاؤں کا حال لکھتے رہے۔ یہ قرآن پاک ان کے بڑے بھائی کرنل مسعود رفعت انصاری نے ہمارے جی ایچ کیو کے میوزیم کو دے دیا ہے۔ بالآخر جاپانیوں نے تنگ آکر کیپٹن متین احمد انصاری کو تہہ تیغ کر دیا۔

وہ ہانگ کانگ کے سٹینلے قبرستان میں مدفون ہیں۔ 1996ء میں بیجنگ سے واپسی پر ہم دونوں ہانگ کانگ گئے اور ان کی قبر پر فاتحہ پڑھی۔ دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر انگریزوں نے انہیں بعد از مرگ جارج کراس (George Cross) کا تمغہ عطا کیا جس کی Citation تصویر کے ساتھ درج ہے۔

کیپٹن متین احمد انصاری اور جارج کراس کی سفارش

ہماری شادی 21 جون 1959ء کو ہوئی۔ 2020ء میں ہماری رفاقت کو اکسٹھ سال ہو چکے ہیں۔ فوجی زندگی کے نشیب و فراز' متعدد پوسٹنگز اور خصوصاً 1971ء میں جب ہمارا

ڈویژن تمام فیملیز کو کھاریاں چھوڑ کر مشرقی پاکستان چلا گیا تو اسما بیگم نے سب کو ہمت و حوصلے کے ساتھ سنبھالے رکھا۔ اپنی زندگی میں شائستگی' وقار اور احترام کو ہم دونوں نے مل کر قائم رکھا ہے۔

دو سال کی طویل علالت کے بعد 22 دسمبر 2020ء کو ہماری اہلیہ کا انتقال ہوا۔ وہ خوش قسمت تھیں' اللہ کی رحمت ان پر تھی کہ آخری دن ہم سب ان کے پاس تھے' تلاوت کر رہے تھے جب انہوں نے آخری سانس لی اور وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے رخصت ہو گئیں۔ ہماری بیٹی لبنیٰ اور یمنیٰ نے انہیں غسل دیا۔ ہماری پیرنٹ یونٹ 16 بلوچ نے ان کی تدفین کے انتظامات کئے' بیٹے وجاہت' نواسے نجف اور یوسف نے انہیں قبر میں اتارا۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ابھی اٹھ بیٹھیں گی اور کہیں گی "شکریہ بچو' اللہ حافظ' اب آرام کرنے دو کہ آگے چلیں گے دم لے کر۔"

1960ء میں اٹک کے مقام پر میں لیاقت کمپنی کی کمان کر رہا تھا' وہاں ہماری بیٹی لبنیٰ پیدا ہوئی۔ 1963ء میں لاہور تعینات تھا' وہاں یمنیٰ بیٹی پیدا ہوئی۔ 1967ء میں حیدرآباد میں تعینات تھا تو وہاں ہمارے بیٹے وجاہت عطا ہوئے جنہیں ہمارے والد مکہ والا کہتے تھے۔ بیٹی لبنیٰ امریکہ میں ہے' ان کے بیٹے ولی' تیمور اور نجف نے تین امریکی صدور سے President's Education Awards حاصل کئے جو ایک ریکارڈ ہے اور یمنیٰ کے بیٹے یوسف نے امریکہ کی UMBC یونیورسٹی سے Outstanding تعلیمی معیار کا سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

جنرل اسلم بیگ کے نواسے' تعلیمی کارکردگی کی بنیاد پر جیتنے والی اسناد کے ساتھ

بیٹی لبنیٰ امریکہ میں میری لینڈ کے مونٹگمری اسلامک سنٹر کی وائس پریذیڈنٹ رہ چکی ہیں۔ بچوں کے ایک اسکول میں پڑھاتی ہیں۔ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بڑی آسودہ زندگی گزار رہی ہیں۔ صوم وصلوۃ کی پابند ہیں اور تینوں بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے نوعمری ہی میں بڑی بڑی ذمہ داریوں پر فائز ہیں۔ بیٹی یمنیٰ کراچی میں بیٹے یوسف اور دو بیٹیوں کے ساتھ خوش وخرم ہیں۔ کام کا اتنا شوق ہے کہ کئی مشاغل اپنا رکھے ہیں۔ عمارتوں کی اندرونی خوبصورتی (انٹیریر ڈیزائننگ) اور بڑے واقعات کو منظم (ایونٹ مینجمنٹ) جیسے مشکل کاموں کے علاوہ فلاح و بہبود کی مختلف سرگرمیوں (سوشل ورکس) میں مصروف رہتی ہیں۔ ماں کی بیماری کے دوران وہاں سے روزانہ بیٹی مریم' وجاہت اور مجھے ہدایت دیتی رہتی تھیں۔ خوش قسمت ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اتنا پیار کرنے والی اولاد عطا کی ہے۔

ہمارے بیٹے وجاہت مصطفیٰ نے ای ایم ای کالج راولپنڈی سے بی ایس سی کیا۔ 1992ء میں جنرل احمد جمال خان کی بیٹی مریم سے شادی ہوئی۔ ماشاءاللہ وہ اور ان کے بچے

ہمارے گھر کی رونق ہیں۔ بیٹی مریم کی دوست نوازی کے سبب اہل خاندان اور پرانے ساتھیوں سے تعلقات نے زندگی کو معنی عطا کئے ہیں۔ وجاہت بڑی آزاد منش شخصیت ہیں۔ نو سال بینک میں کام کیا اور اے وی پی(AVP) کے عہدے پر ترقی پانے والے تھے کہ ملازمت چھوڑ دی بولے:

"ابا' مجھے یہ سود والا کام پسند نہیں ہے۔"

"بیٹا صحیح فیصلہ کیا ہے' اللہ تمہاری رہنمائی کرے۔ کوئی اور کام تلاش کرلو۔"

تین سال تک پرائیویٹ کمپنی میں کام کیا پھر چھوڑ دیا کہ:

"یہاں تو دو نمبر کام ہوتا ہے۔"

"بہت اچھا' اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

اب اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں' بیوی اور بچوں کی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ جب سے اپنا کام کر رہے ہیں' بہت مطمئن اور خوش ہیں۔ مجھے اجازت نہیں دی کہ سفارش کر کے کوئی ملازمت دلا دوں۔ انہیں دنیاوی معاملات کا ماشاء اللہ اتنا تجربہ ہے کہ کئی بار ایسے فیصلے کرنے سے مجھے روکا ہے جو میرے لئے نقصان دہ ثابت ہو سکتے تھے۔ میرے خلاف سالہا سال سے سپریم کورٹ میں مقدمہ چل رہا ہے۔ اس سے وجاہت پریشان رہتے ہیں اس مقدمے کی تفصیلات ساتویں باب کے آخر میں بیان کی گئی ہیں۔

مجھے تحریک پاکستان کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لینے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔ 1945 کی بات ہے جب میں نے شبلی نیشنل کالج میں داخلہ لیا۔ اس وقت تحریک پاکستان باقی ملک میں تو اپنے عروج پر تھی لیکن ہمارے علاقے میں کوئی خاص سرگرمی نہیں تھی۔ انہی دنوں علیگڑھ یونیورسٹی کے کچھ طلبہ ہمارے کالج آئے اور انہوں نے مسلم طلبہ کو دعوت دی کہ وہ "مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کریں اور تحریک پاکستان کا پیغام اردگرد کے علاقوں میں پھیلائیں۔" ہم نے اس دعوت پر لبیک کہا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن قائم کر کے تحریک

پاکستان کا پیغام پھیلایا۔ میں کالج کی ہاکی ٹیم کا کپتان اور اتھلیٹک کا چیمپئین تھا۔ طلبہ میں سینئر تھا۔ بہت جلد مجھے فیڈریشن کا صدر منتخب کرلیا گیا۔ یہ پر آشوب دور تھا۔ اپنے ضلعے میں ہم مسلمان صرف گیارہ فیصد تھے۔ ہمارے ضلعے میں ایک شاستریہ کالج تھا جس میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ انہیں ہماری سرگرمیاں ایک آنکھ نہ بھاتی تھیں اور ہمارا ان سے اکثر تصادم ہوتا رہتا تھا۔

مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی قیادت اور اپنی تعلیم کو اچھے معیار پر جاری رکھنا ایک بڑی آزمائش تھی۔ انہی دنوں ہم نے اپنے کالج کے فٹ بال کے میدان میں ایک جلسے کا اہتمام کیا جس میں خطاب کے لئے جناب سردار عبدالرب نشتر، چوہدری خلیق الزماں اور علی برادران کی والدہ بی اماں کو دعوت دی۔ انہیں ایک بڑے جلوس کی شکل میں کالج لایا گیا۔ یہ جلوس جب شہر سے گذرا تو اس کی دہشت سے دکانیں بند ہو گئیں' لوگ حیران تھے کہ اتنے زیادہ مسلمان کہاں سے آ گئے۔ کالج گراؤنڈ کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دس بارہ ہزار کا مجمع تھا۔ اردگرد کے اضلاع' گورکھ پور' بلیا اور جونپور کے مسلمان بھی شریک ہوئے۔ اس موقعے پر ہم نے ایک پرچم بنایا جو سبز رنگ کا تھا اور اس میں سفید رنگ کا چاند ستارہ تھا۔ بی اماں سے درخواست کی گئی کہ وہ پرچم بلند کریں۔ انہوں نے پرچم بلند کیا۔ اس موقعے پر انہوں نے مختصر سی تقریر کرتے ہوئے کہا:

"میرے بچو! میں نے اپنے کمزور ہاتھوں سے یہ پرچم بلند کیا ہے۔ اب اسے آپ کے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہوگی۔ دیکھنا اسے کبھی سرنگوں نہ ہونے دینا۔"

ہم نے ان کے اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش کی ہے اور اپنے قول و فعل سے پاکستان کا پرچم ہمیشہ بلند رکھا ہے۔

جنرل صاحب ماضی کی یادوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بی اماں کی تقریر کا ذکر کرتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے۔ کئی لمحے خاموش رہے۔ پھر گلاسوں کی طرف اشارہ کیا۔ ملازم جانے کب

سبز رنگ کا مشروب رکھ کر چلا گیا تھا۔ گھر کے لان میں لگے ہوئے پودینے کا بنا ہوا انتہائی مفرح اور خوش ذائقہ شربت تھا۔ ہم نے ایک دو گھونٹ لئے اور گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

میں نے پوچھا:

''کیا آپ نے ان بزرگوں سے پوچھا کہ پاکستان بن جانے سے آپ جیسے مسلمانوں کو کیا ملے گا جو پاکستان کی سرزمین سے سینکڑوں میل دور ہوں گے۔''

ان کا کہنا تھا کہ ''انہوں نے اپنے بزرگوں سے یہ بات کی تھی۔''

جناب سردار عبدالرب کا کہنا تھا:

''پاکستان کی ترقی اور اس کی طاقت سے ہم مسلمانوں کو تقویت اور تحفظ ملے گا' انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوؤں کی اقتصادی اور سیاسی چیرہ دستیوں سے ہم محفوظ رہیں گے۔ ایک آزاد اور مضبوط مسلمان ملک دنیائے اسلام کی پہچان کو نمایاں کرے گا۔ انشاء اللہ۔''

1990ء میں 5 کور کے دورے پر میں کراچی گیا ہوا تھا کہ اس دوران مجھے احمد رضی صاحب کا پیغام ملا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ اپنا تعارف کرایا کہ وہ یوپی مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری رہ چکے تھے اور اس وقت کراچی میں ایسٹرن شپنگ کمپنی لمیٹڈ کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں اور کراچی میں مستقل سکونت ہے۔ میں پہلے ان سے نہیں ملا تھا مگر نام سے واقف تھا۔ 5 کور آفیسرز میس میں ان سے ملاقات ہوئی۔ گذرے ہوئے دنوں کی باتیں ہوئیں' یادیں تازہ ہوئیں۔ انہوں نے مجھے یوپی ایم ایس ایف کی ورکنگ کمیٹی کی 23 اپریل 1947ء کی میٹنگ کا دعوت نامہ دیا جو علی گڑھ یونیورسٹی (Old Boys Lodge) میں ہونی تھی مگر حالات کے جبر کے سبب نہ ہو سکی۔

یو۔پی۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن

سیکرٹری دفتر
علی گڑھ

From:

Hasan Ahmed Razi Esq:
General Secretary,
U.P. Muslim Students Federation.
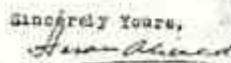
To

All the Members of the
U.P. M.S.F. Working Committee.

Ref: No:435   Dated, Aligarh, the 10th; April, 1947.

Dear brother in faith,
It has been decided to hold a meeting of the Working Committee of the U.P.M.S.F. on April 23, 1947.
The meeting will be held in the Old Boys Lodge at 4.30. p.m. sharp.

AGENDA:-

1. To present a Fare well Address to Prof:A.B.A.Haleem our out-going President.
2. Election of a new President.
3. Election of a member to the A.I.M.S.F. Council.
Any other item with the permission of the President.

Sincerely Yours,
Hasan Ahmed

To,
Mr: ..Aslam. Beg:.....
.......Azamgarh.

یوپی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سیکرٹری کی طرف سے مجلس عاملہ کے اجلاس کے لیے دعوت نامہ بنام اسلم بیگ

انہوں نے مجھے یوپی ایم ایس ایف کی 23 فروری 1947ء کی سالانہ کونسل کی رپورٹ بھی پیش کی۔ اس رپورٹ میں' میں مجلس عاملہ کا رکن اور میرے ساتھی سعید احمد قدوائی جوائنٹ سیکرٹری اور عزیز الدین احمد آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا جب قیام پاکستان کا فیصلہ ہو چکا تھا اور آزادی کی فضا ہر سو پھیل چکی

تھی۔ بہار آنے کو تھی۔ یہ رپورٹ اس وقت کے حالات کی صحیح تصویر کشی کرتی ہے۔

Unity. Faith. Discipline.

A Short

REPORT

OF THE

Annual Meeting of the Council

OF

U. P. Muslim Students Federation,

(FEBRUARY 23, 1947)

Published by:
HASAN AHMAD RAZI
General Secretary, M. S. F.

To,
The Secretary,
M. S. F.
....

یوپی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی مجلس عاملہ کے سالانہ اجلاس کی رپورٹ

-2-

The annual meeting of the Council of the U. P. Muslim Students Federation was held at Moradabad in the Town Hall at 9-30 a.m. on the 23rd of February, '47. Professor A. B. A. Haleem presided. A large number of delegates from the various branches attended the meeting.

The meeting began with recitation from the Holy Quran.

Professor A. B. A. Haleem, in his opening speech acquainted the members with the present situation in the country and the responsibilities, the Muslim students have to shoulder and the part they have to play in the struggle for their cherished goal of Pakistan. He exhorted the Muslim students to strengthen and consolidate their organisation because without it they would not be able to render proper service to the cause of national freedom. "The Muslim Students Federation was their organisation, and it was their solemn duty to make it strong and powerful."

After Professor A. B. A. Haleem's speech, the outgoing General Secretary read out the annual report.

Then the elections of the office bearers of the U. P. Muslim Students Federation for the ensuing session were held. The following office bearers were elected:—

President:-	Professor A. B. A. Haleem (Aligarh)
General Secretary:-	Hasan Ahmad Razi (Aligarh)
Treasurer:-	Dr. Afzal Husain Qadri (Aligarh)
Vice-President:-	Mustafa Kamil (Aligarh)
Social Secretary:-	Ameerul Hasan (Cawnpore)
Literary Secretary:-	Usman Ahmad (Moradabad)
Propaganda Secretary:	Abul Khair (Cawnpore)

The General Secretary has also nominated the following as the Joint Secretaries of the U. P. M. S. F.

1. Viqar Ahmad (Aligarh)
2. Saeed Akhtar Qidwai (Azamgarh)

The following were elected members of the Working Committee:—

1. Abul Hasnat (Aligarh)
2. Qazi Saheebuddin (Aligarh)
3. Viqar Ahmad (Aligarh)
4. M. A. Arzoo (Aligarh)

-3-

5. A. M. Mekhari (Aligarh)
6. Akbar Yazdani (Aligarh)
7. Abul Qasim Mohd. Idris (Bara Banki)
8. Mohd. Arif (Bara Banki)
9. Noor Elahi (Bara Banki)
10. Vilayat Husain (Cawnpore)
11. Shahid Ali (Cawnpore)
12. Mohd Sulaiman (Cawnpore)
13. Syed Ali Zaidi (Cawnpore)
14. Hafeez Ansari (Mussoorie)
15. Mirza Aslam Beg (Azamgarh)
16. Saeed Akhtar Qidwai (Azamgarh)
17. Khaliq Mohammad (Moradabad)

The following were elected members of the All India Muslim Students Federation Council:—

1. Abul Hasnat (Aligarh)
2. Zahur Alam (Cawnpore)
3. Ashfaq Husain (Cawnpore)
4. Ameerul Hasan Iraqi (Cawnpore)
5. Syed Ali Zaidi (Cawnpore)
6. Azizuddin Ahmad (Azamgarh)
7. Nabi Ahmad (Kanauj)
8. Syed Adil Hasan (Lucknow)

After the elections were over, the Council unanimously adopted the following nine resolutions:

The first resolution calls upon the Muslim students of U. P. to strengthen and consolidate the Muslim Students Federation and help in making it a powerful, organised, disciplined and independent body.

The second resolution most strongly condemns the Bihar Government for their failure to protect the life and property of the Muslim minority in the province.

The third resolution appeals to the League High Command to formulate a clear cut and practicable plan for the rehabilitation of the Muslims of Bihar.

By the fourth resolution the Council condemns the policy of repression adopted by the Punjab Government towards the Muslims of that province and its most in human treatment towards the League leaders of the Punjab. It also demands the immediate release of all the Muslims wrongfully

-4-

arrested and the dismissal of the unrepresentive ministry of the Punjab.

The fifth resolution condemns the action of Sir Mirza Ismail in stopping the grant of Hyderabad Government to the Anjuman Taraqqi-e-Urdu and demands the immediate cancellation of the order

The sixth resolution warns the U. P. Government against taking any step towards the introduction of the joint electorate system for District and Municipal Boards. Any such steps would be highly detrimental to the Muslim interest.

The seventh resolution demands the immediate repeal of the public safety ordinance bill which the U P Government has been using as an instrument for crushing the Muslim movement in the province.

By the eighth resolution the Council demands the release of Capt. Abdur Rashid and other I. N. A. Officers and men without any further delay.

The last resolution condemns the U. P. Government for its failure in protecting the life and property of Musalmans in many places like Gurhmukteshwar, Allahabad etc. and demands the immediate appointment of an impartial committee of enquiry.

After the resolutions were passed, Dr. Afzal Husain Qadri and Professor A. B. A. Haleem made short speeches.

The meeting concluded with the speech of the General Secretary in which he thanked all the members for taking the trouble of coming from far and near to participate in the meeting.

At 4 p. m. the Moradabad M. S. F. gave an at home to the members of the Council. Many prominent citizens were present.

After the Maghrib prayers a public meeting was held in the Town Hall under the auspices of the local Muslim Students Federation.

Prominent among the speakers were, Professor A. B. A. Haleem Dr. Afzal Husain Qadri. A. K. Mohd. Idris and Mr. Abul Hasnat.

The meeting concluded at about 10-30 p. m.

N. B.—A full report of the proceedings of the council will be published in URDU shortly.

میں نے 1946ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کی سرگرمیوں کی وجہ سے پڑھائی پر زیادہ توجہ نہ دے سکا تھا۔ سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہوا۔ والد نے گریجویشن کے لئے علیگڑھ یونیورسٹی جانے کے لئے کہا۔ میرے دو بڑے بھائی مرزا

افضل بیگ اور مرزا اشہد بیگ پہلے ہی الہ آباد یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے لیکن میں فیڈریشن کے کاموں میں اتنا منہمک تھا کہ اعظم گڑھ چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔ والد صاحب ناراض ہوئے لیکن پھر شبلی کالج ہی میں تعلیم جاری رکھنے پر رضامند ہو گئے۔ ایم ایس ایف کی سرگرمیوں کی وجہ سے رکاوٹ ضرور آئی لیکن اس کے باوجود میں نے بی اے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا۔

انہوں نے ہنستے ہوئے بتایا "اپنے خاندان میں، میں سب سے کم پڑھا لکھا ہوں۔ تین بڑے بھائی الہ آباد یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوئے۔ چھوٹے بھائی مرزا اظفر بیگ اور مرزا اظہر بیگ علیگڑھ یونیورسٹی میں پڑھتے رہے۔ کوئی پی ایچ ڈی، ڈبل ایم اے اور ایل ایل بی تھا میں سادہ گریجویٹ تھا۔ گریجویشن کے بعد والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں مزید تعلیم کے لئے علیگڑھ یونیورسٹی جاؤں لیکن میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

15 اگست 1949ء کو میں نے پاکستان کی جانب ہجرت کرنے کا فیصلہ کیا۔ بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ گھر بار چھوڑنا اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے طلبہ کو چھوڑنا جن کے ساتھ مل کر تحریک پاکستان کے لئے دن رات کام کیا تھا، بڑا مشکل تھا۔ مجھے ان کی محبتیں حاصل تھیں، وہ میری ایک آواز پر بلا پس وپیش حاضر ہو جاتے تھے۔ انہیں چھوڑنا بڑا مشکل تھا۔ لیکن اللہ کے راستے میں ہجرت کرنے کے لئے ان مرحلوں سے گزرنا لازم تھا۔ میں نے ہجرت کا فیصلہ کیا۔ اجازت کے لئے والد صاحب کے پاس گیا تو میری آنکھوں میں آنسو تھے۔ جدائی کے ان لمحوں کو یاد کرتے ہوئے جنرل صاحب ایک بار پھر آبدیدہ ہو گئے، آواز بھرا گئی۔ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں انہوں نے بتایا:

"والد صاحب نے دونوں ہاتھوں سے میرا چہرہ تھاما، ماتھے پر بوسہ دیا اور کہا کہ آنے والے وقتوں میں تمہیں بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ تم ایک نئی زندگی کی طرف جا رہے ہو۔ ان باتوں کو یاد رکھنا اور ان پر عمل کرنا:

☆ "نماز قائم رکھنا

☆ قرآن اور سنت کے اصولوں پر عمل کرنا

☆ رزق حلال کھانا

☆ ہمیشہ حق کی بات کرنا اور

☆ حقدار کو اس کا حق دینا۔"

میں نے اپنی عملی زندگی میں قرآن و سنہ کے اصولوں اور والد کی ان نصیحتوں پر عمل کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود اپنے آپ کو راہ حق پر قائم رکھا ہے۔ جس کے سبب میری زندگی پرسکون ہے۔

متحدہ بھارت میں مذہبی' اقتصادی اور معاشرتی لحاظ سے مسلمانوں کو مکمل آزادی تھی۔ یہ انگریزوں کا دور حکومت تھا لیکن ہمارے قائدین کو ہندوؤں کی تنگ نظری کا شدت سے احساس تھا اور اس بات کا خطرہ بجا تھا کہ جب ان کی حکومت ہوگی تو مسلمانوں کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں رہے گی۔ گاندھی جی کے الفاظ کے آئینے میں ان کا اصل چہرہ اور حالات کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا:
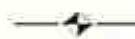
Muslims are either the progeny of Arab invaders or persons separated from us. There are three remedies: One, they should be weaned away from Islam back to their old Dharam; Two, if that is not possible they should be returned to their ancestral land; Three, if this is difficult, they should be kept as subjects in India."

"مسلمان یا تو عرب حملہ آوروں کی نسل ہیں یا پھر ہم سے مختلف لوگ ہیں۔ ان سے نمٹنے کے تین راستے ہیں: اول' مسلمان اسلام سے تائب ہو کر اپنے پرانے دھرم کی طرف لوٹ آئیں؛ دوم' اگر ایسا ممکن نہیں تو وہ اپنے آبائی وطن کو واپس چلے جائیں؛ سوم' اور اگر ایسا کرنا مشکل ہے تو انہیں بھارت میں ہمارا غلام بن کر

رہنا ہوگا۔"

آج مودی حکومت اسی نظریے پر عمل پیرا ہے۔

تاریخی مضامین سے انصاف کرنے کے لئے کھلے ذہن اور کھلے دل کے ساتھ مطالعہ کرنا لازم ہے۔تحریک پاکستان کے ایک ادنی کارکن کی حیثیت سے میری رائے یہ ہے کہ پاکستان کی تحریک کے پس پردہ دینی' معاشی' تہذیبی اور سیاسی محرکات کارفرما تھے اور ان میں سے کسی ایک عنصر کو بھی فراموش کر کے پاکستان سے انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ہم سے غفلت ہوئی' غلطیاں ہوئیں جن کے سبب مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا اور سات دہائیاں گذرنے کے بعد بھی ہمیں وہ سیاسی اور معاشرتی استحکام حاصل نہیں ہو سکا ہے کہ جس کی پاکستانی قوم مستحق ہے۔

باب دوم:

میرے خوابوں کی سرزمین

گھر والوں کو خدا حافظ کہہ کر میں بمبئی گیا اور 17 اگست 1949 ء کو ایک بحری جہاز کے ذریعے کراچی پہنچا۔ اس سے پہلے میرے دو بڑے بھائی پاکستان آ چکے تھے اور کراچی میں مقیم تھے۔مرزا افضل بیگ لاہور میں ،2 فیلڈ رجمنٹ میں تھے۔میں کراچی پہنچا تو بڑے بھائیوں کے پاس ہی ٹھہرا۔آرام باغ میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں ہم تین بھائی اور ہمارے ایک عزیز قیام پذیر تھے۔اگلے مہینے میں نے پاک فوج میں کمیشن کے لئے درخواست دی۔ابتدائی ٹیسٹ کے لئے آئی ایس ایس بی کے لئے لاہور گیا،وہاں کامیابی کے بعد میڈیکل کے مرحلوں سے گزرنا پڑا جن کے اختتام پر طبی وجوہ (Medical Grounds) کی بناء پر مجھے مسترد کر دیا گیا۔ میں نے حیرت سے پوچھا "کس بنیاد پر،کیا خرابی بتائی انہوں نے؟ پھر آپ فوج میں کیسے آئے۔"

جنرل صاحب میری حیرت پر مسکرائے اور سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولے:

"میں بہت ہی نا اُمید ہوا۔بڑے بھائی کو پتہ چلا تو انہوں نے پوچھا کہ کس وجہ تمہیں میڈیکلی اَن فٹ قرار دیا گیا ہے۔ میں نے بتایا کہ مجھے سسٹالک ہارٹ (Systolic Heart) کا مرض ہے' آٹھ' دس دھڑکنوں کے بعد ایک دھڑکن مس ہو جاتی ہے۔" بڑے بھائی نے کراچی میں امراض دل کے تین ماہرین سے مشورہ کیا۔ سبھی نے کہا کہ یہ کوئی معذوری نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی امید وار کو اَن فٹ قرار دیا جائے۔بڑے بھائی کے مشورے پر میں نے اس فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی اور درخواست کے ساتھ تین ہارٹ سپیشلسٹس کی آراء بھی منسلک کر دیں۔دو ہفتے بعد مجھے ملٹری ہاسپٹل راولپنڈی رپورٹ کرنے کو کہا

گیا۔ایم ایچ نے ایک میڈیکل بورڈ تشکیل دیا جس میں ایک کرنل اور ایک اور افسر شامل تھے۔ میں اس بورڈ کے سامنے پیش ہوا۔ بورڈ کے ارکان کچھ دیر تو میری فائل سامنے رکھے آپس میں مشورہ کرتے رہے پھر مجھ سے سوال کیا:

"آپ کے دل کی آٹھویں دسویں دھڑکن غائب ہو جاتی ہے۔ یہ تکلیف کب سے ہے؟"

میں نے کہا: "یہ تکلیف مجھے گزشتہ پانچ چھ مہینوں سے ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"پانچ مہینے پہلے جب میں اعظم گڑھ سے پاکستان کے لئے روانہ ہوا تو مجھے ماں باپ رشتہ دار اور تمام گھر والوں کو چھوڑنا پڑا۔ اپنے دوست احباب اور ان ہزاروں ساتھیوں کو چھوڑنا پڑا جن کے ساتھ مل کر تحریک پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لیا تھا جو مجھے جان سے زیادہ عزیز تھے۔ جن کے دلوں میں میں رہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ "ان سب کو چھوڑتے ہوئے میری کچھ دھڑکنیں ان ہی کے ساتھ رہ گئی ہیں۔"

یہ سن کر کرنل صاحب کھڑے ہو گئے۔ مجھے گلے لگایا۔ ان کے جذبات دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ شاید ان کی بھی کچھ دھڑکنیں کہیں پیچھے رہ گئی تھیں۔ انہوں نے مجھے میڈیکلی کلیئر (Medically Clear) کیا اور کہا کہ جلد ہی جی ایچ کیو سے آپ کو پاکستان ملٹری اکیڈمی رپورٹ کرنے کے احکامات مل جائیں گے۔

دو ہفتے بعد جی ایچ کیو سے احکامات مل گئے لیکن ہمیں بتایا گیا کہ پہلے کوئٹہ جانا ہوگا جہاں تینوں افواج کے کیڈٹس پہلے پری کیڈٹ ٹریننگ کے لئے چھ ماہ اس سکول میں گزاریں گے۔ ہم کوئٹہ پہنچے اور فروری کی سخت سردی میں ہمارا کورس شروع ہوا۔ رہائش کے لئے ہمیں کمبائنڈ ملٹری ہاسپٹل (CMH) کی بیرکیں دی گئیں، ایک بیرک میں پچاس، ساٹھ کیڈٹ اکٹھے رہتے تھے فرش پر ربڑ بچھی تھی، سخت سردی کا موسم تھا لیکن بیرک سنٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھی۔ کیا مزے تھے۔

ہمیں 35 روپے ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ ہم سب نے ایک ایک بائیسکل دس روپے ماہانہ

کرایے پر لے رکھی تھی۔ سڑکیں برف سے ڈھکی ہوتی تھیں لیکن ہم انہی سائیکلوں پر ہر ویک اینڈ (Week End) پر شہر جایا کرتے اور لال کباب اور شیزلے کیفے کی آئس کریم سے لطف اندوز ہوتے۔ وظیفہ صرف 35 روپے ماہانہ تھا لیکن اس رقم میں اتنی برکت تھی کہ بائیسکل کے کرایے کے علاوہ دوسری ضروریات بھی باآسانی پوری ہو جاتی تھیں۔

ہمارے کمانڈنٹ کرنل کے ایم اظہر خان تھے جنہوں نے 1965ء کی جنگ میں رن آف کچھ سے چھور (Chor) تک کے علاقے کا دفاع کر کے بڑا کارنامہ انجام دیا تھا۔ جولائی میں ٹریننگ ختم ہوئی اور ایک ماہ کی چھٹی کے بعد 12 اگست 1950ء کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول رپورٹ کی۔ ہمارا چھٹا پی ایم اے لانگ کورس (6th PMA Long Course) تھا جس میں 90 کیڈٹس تھے۔

ہم نے بات آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا کہ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں پہلے دن کی روداد سنائیں۔

انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔ ہمارے لئے ایبٹ آباد میں گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک وین میں بیٹھ کر ہم کاکول پہنچے۔ ایک آفیسر اور ان کا عملہ ہمارے استقبال کے لئے موجود تھا۔ ابتدائی کاغذی کاروائی کے بعد مجھے قاسم کمپنی ملی۔ اس وقت صرف چار کمپنیاں تھیں طارق، قاسم، صلاح الدین اور خالد کمپنی۔ رہائش کے لئے ایک بیرک ملی جو قاسم لائن کہلاتی تھی۔ یہ بیرکیں دوسری جنگ عظیم کے وقت کی تھیں۔ سرد ہوائیں جسم سے آر پار گذر جاتی تھیں۔ ہماری بیرک نیلور سپر کے بالکل سامنے تھی۔ خوبصورت جگہ تھی۔ پھر ہمیں میس لے جایا گیا جہاں ہم نے اطمینان سے کھانا کھایا اور آرام کے لئے ہمیں بیرک میں بھیج دیا گیا۔

جنرل صاحب نے بڑے آرام سے پورے دن کی روداد بیان کر دی۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی، پوچھا کہ کوئی سزا وغیرہ نہیں ملی۔ سینئر کیڈٹوں کی طرف سے تو Ragging سے استقبال کیا جاتا ہے۔

"نہیں بھئی! یہ تو ہمارا پہلا دن تھا، ہم مہمان تھے اور اس حیثیت سے ہمیں پورا پروٹوکول

دیا گیا۔"

ہم نے بتایا کہ آج کل تو کیڈٹ کا پہلا دن روزِ قیامت ہوتا ہے۔ پی ایم اے کا گیٹ کراس کرنے کے بعد اپنے کمرے میں پہنچنے میں پندرہ سولہ گھنٹے لگتے ہیں اور سینئر اتنی سزائیں دیتے ہیں کہ کمرے تک پہنچتے پہنچتے جسم کا انگ انگ دکھنے لگتا ہے۔

نہیں اُن دنوں یہ کچھ نہیں تھا۔ سزائیں تھیں لیکن عزتِ نفس کا خیال رکھا جاتا تھا۔ فرنٹ رول، پٹھو پریڈ، کسی کھمبے یا سوکھے درخت کو چالیس چالیس دفعہ سلیوٹ کرنا پڑتا۔ سزائیں تھیں لیکن کیڈٹس کی بے عزتی نہیں کی جاتی تھی۔ ہنستے ہوئے بتایا کہ ریگنگ تھی لیکن بڑی شستہ اور سنجیدہ حدود میں رہتے ہوئے۔

دوسرے دن ہمیں پریڈ گراؤنڈ لے جایا گیا۔ ہمارا ڈرل انسٹرکٹر ایک انگریز سارجنٹ تھا جس کا نام 'ڈیفیلڈ' (Defeild) تھا۔ فوجیوں میں ڈرل انسٹرکٹروں کے ریمارکس زبان زدِعام ہیں۔ ڈیفیلڈ بھی مختلف نہیں تھا۔ ایک دفعہ ایک کیڈٹ نے اس سے سوال جواب کئے تو اس نے بڑی شستہ انگریزی میں ڈانٹ پلائی اور کہا:

"جنٹل مین! میں جب وردی میں تھا' تو آپ اپنی ماں کے رخسار پر حیا کی سرخی تھے۔ (Speck of blush on your mother's cheek) مجھ سے ایسی فضول بحث کیوں کرتے ہو۔ باہر نکلو اور آئندہ حکم تک پریڈ گراؤنڈ کے چکر لگاتے رہو۔"

ہم نے اساتذہ کی تفصیل پوچھی۔ بتایا کہ ان کے پلاٹون کمانڈر کیپٹن ذکریا تھے' کرنل کے عہدے سے ریٹائر ہوئے، دوسرے پلاٹون کمانڈر کیپٹن محمد اقبال تھے جو بعد میں جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین بنے اور کیپٹن قمر علی مرزا جو لیفٹیننٹ جنرل ہو کر کوارٹر ماسٹر جنرل ہوئے۔ ٹرم کمانڈر میجر حضور احمد' بٹالین کمانڈر کرنل سعید الدین اور پاکستان ملٹری اکیڈمی کے کمانڈنٹ بریگیڈیئر جی ایچ تارور (G.H. Tarvar) تھے۔

پہلی ٹرم کے آخر میں قیادت کے نام سے ایک ہفتے کی مشقیں ہوئیں جو صحیح معنوں میں ہر کیڈٹ کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کا سخت امتحان ہوتا تھا۔ ان مشقوں کے اختتام پر کورس

کمانڈر اور پلاٹون کمانڈر بھی موجود ہوتے تھے اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا جس میں ہماری کمزوریوں اور خوبیوں پر کھل کر تبصرہ ہوتا تھا۔ ایسا ہی ایک اجتماع مشقوں کے اختتام پر بھلر اسٹوپا کے زینوں پر ہوا جس میں ہم سب موجود تھے۔ اس دن کی یہ یادگار تصویر ہے' شاید آپ پہچان لیں۔

چھٹے پی ایم اے لانگ کورس کے کیڈٹ اور ان کے اساتذہ ایک مشق کے دوران
راولپنڈی کے قریب جی ٹی روڈ پر واقع بھلر سٹوپا پر

ہر ٹرم کے مکمل ہونے پر ایک ماہ کی چھٹی ملتی تھی۔ پہلی چھٹی پر میں تیز گام سے کراچی گیا۔ نہایت صاف ستھری ٹرین تھی جس کی ڈائننگ کار کا عمدہ کھانا اور اچھا ماحول آج تک یاد ہے۔ ائر کنڈیشنڈ کوچ کا کرایہ صرف ساٹھ روپے تھا۔ دوسری اور تیسری چھٹی پر ہم نے پی ایم اے میں وقت گذارنے کا فیصلہ کیا۔ ہمارے ساتھی جمیل الرحمٰن (جی سی 722) اور ہم دونوں اپنے ہیورسیک میں ضروری چیزیں رکھ کے اردگرد کی پہاڑیوں کی سیر کو نکل جاتے۔ بڑا خوبصورت علاقہ تھا اور جب کھانے کا وقت ہوتا تو کسی بھی گھر پر رکتے' دودھ دہی لیتے' پراٹھا اور انڈہ بنواتے' خوب سیر ہو کر کھاتے اور وہیں چیڑ کے درختوں کے سائے میں سو جاتے۔ ہر تین چار دن بعد یہی معمول رہا۔

جیسا کہ پی ایم اے میں روایت ہے' کمپنیوں کے درمیان چیمپئن شپ مقابلہ ہوا کرتا تھا اور چیمپئن کمپنی پریڈ کے وقت سب سے آگے ہوتی تھی۔ ہماری قاسم کمپنی 1951ء اور 1952ء کی چیمپئن تھی اور میں چیمپئن کمپنی کا علمبردار تھا۔ 1952ء میں ہم پاس آؤٹ ہوئے اور ہمیں وزیراعظم خواجہ ناظم الدین نے چیمپئن شپ کا جھنڈا دیا۔

کیڈٹ اسلم بیگ چونکہ پہلے سے گریجویٹ تھے اور اپنی پلاٹون میں شاید واحد گریجویٹ تھے اس لئے اکیڈیمک مضامین میں انہیں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی۔ ان کی دلچسپیوں کا محور ہاکی اور ایتھلیٹکس تھیں۔ ہاکی کے ٹیم کیپٹن عاطف تھے جنہوں نے ہاکی میں بڑا نام کمایا اور بریگیڈیئر ہو کر ریٹائر ہوئے۔

ہم نے خاص طور پر پوچھا کہ اکیڈمی میں کون سا کام سب سے مشکل لگتا تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ کوئی بھی مشکل پیش نہیں آئی۔ ہر کام آسان اور دلچسپ تھا۔

"ون مائل (One Mile Run) بھی نہیں؟"

"ایک میل کی دوڑ تو میں کالج کے زمانے سے کرتا تھا۔ کوئی مشکل نہ تھی' ہر ہفتے یہ ٹیسٹ ہوتا تھا میں نے تمام ابتدائی ٹیسٹ پاس کر لئے اور کبھی مشکل نہیں ہوئی۔"

ہمارے ساتھی کبھی فال آؤٹ نہیں ہوئے۔ وہ کبھی کسی ڈرل' پی ٹی' ون مائل یا

ہاسٹیکل کورس (Obsticle Course) سے غیر حاضر نہیں ہوئے۔ ایتھلیٹکس میں 100 اور 200 گز کی دوڑ میں سب سے آگے رہا البتہ 400 گز کی دوڑ میں سخت مقابلہ ہوا کرتا۔ لانگ جمپ میں بھی دوسرے' تیسرے نمبر پر آتا تھا۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی کی ہاکی ٹیم کا ممبر تھا۔

اسلم بیگ (بائیں سے پہلی نشست پر) پی ایم اے کی ہاکی ٹیم کے ساتھ

جینٹلمین کیڈٹ (Gentleman Cadet 729) مرزا اسلم بیگ تقریری مقابلوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اپنی تقریر وہ خود لکھتے تھے۔ اردو انگریزی دونوں مباحثوں میں حصہ لیتے تھے۔ ایک انگریزی مباحثے کے بعد انہیں انگریزی کے لیکچرر نے ایملی برانٹے کی کتاب Wuthering Heights پیش کی۔ دوسری ٹرم کے اختتام پر انہیں ڈیبیٹنگ سوسائٹی (Debating Society) کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

انہوں نے بتایا کہ ان دنوں دستور یہ تھا کہ کسی بھی مباحثے یا مذاکرے کے موقعے پر تمام طلبہ' افسران' پلاٹون کمانڈر اور بٹالین کمانڈر اپنی نشستیں سنبھال لیتے تھے اور ڈیبیٹنگ سوسائٹی کا صدر سب سے آخر میں ہال میں داخل ہوتا تو تعظیم میں سب کھڑے ہو جاتے۔ انہوں نے

بڑے فخر سے بیان کیا کہ جب یہ واقعہ پہلی مرتبہ ہوا تو میں نے ماشاءاللہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ پڑھا اور مجھے محسوس ہوا کہ شاید مستقبل میں کوئی اہم مقام اللہ تعالیٰ نے میرے مقدر میں لکھا ہے۔ دراصل یہ احترام میری ذات کو نہیں تھا بلکہ بحث و مباحثہ اور علم کی روش کو تھا جس کے بغیر فوجی زندگی نامکمل ہوتی ہے۔

انہوں نے پوچھا۔ "پتہ نہیں اب یہ روایت ہے کہ نہیں۔"

ہم نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے تک اسلامیہ کالج پشاور میں یہ روایت موجود تھی کہ طلبہ کی منتخب یونین کا صدر سب سے آخر میں آتا تھا اور اس کے احترام میں پرنسپل سمیت تمام حاضرین کھڑے ہو جاتے تھے۔ پی ایم اے میں اب یہ روایت نہیں ہے۔ اب سب سے آخر میں کمانڈنٹ اور ان کے ساتھ کوئی مہمان مقرر ہو تو وہ آتے ہیں۔

16 اکتوبر 1951ء کا دن تھا جب اسلم بیگ مجلس مباحثہ کی صدارت کے لئے کمرے سے نکلے تو انہوں نے ٹرانسسٹر پر خبر سنی کہ وزیراعظم لیاقت علی خان پر راولپنڈی کے لیاقت باغ میں تقریر کے دوران گولی چلادی گئی اور وہ جاں بحق ہو گئے ہیں۔ وہ ہال میں پہنچے تو سب لوگ اپنی نشستوں پر براجمان تھے۔ یہ ہال میں داخل ہو گئے اور مباحثے کی کاروائی شروع ہو گئی۔ جنرل بیگ کا کہنا تھا کہ وہ وقت انہوں نے بڑی اذیت میں گزارا۔ مباحثہ ختم ہوا تو وہ کمانڈنٹ کے پاس گئے اور انہیں یہ اندوہناک خبر سنائی۔ وہ ششدر رہ گئے انہوں نے تفصیل پوچھی تو اسلم بیگ نے انہیں خبر بتائی جو انہوں نے ریڈیو پر سنی تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آئے، کھانے کے لئے بھی نہیں گئے، روتے رہے۔

پاکستان ملٹری اکیڈمی میں تربیت کی تکمیل کے بعد پاس آؤٹ ہوئے تو ان کے ایک ساتھی بٹالین سینئر انڈر آفیسر عبدالقیوم کو اعزازی تلوار ملی۔ مشرقی پاکستان کے وہ پہلے کیڈٹ تھے جنہیں اعزازی تلوار عطا ہوئی۔ اکیڈمک مضامین میں ٹاپ کرنے پر نارمن گولڈ میڈل بھی ان کے حصے میں آیا۔ وہ آرمرڈ کور کی ایک یونٹ 11 کیولری میں تعینات ہوئے۔ بعد میں انہوں نے اس یونٹ کو کمان بھی کیا۔ فل کرنل تھے جب انہوں نے فوج سے استعفیٰ دے دیا

اور وزارت مذہبی امور میں ایڈیشنل سیکرٹری تعینات ہوئے۔

فوج نے جب مشرقی پاکستان میں ملٹری ایکشن شروع کیا تو 9 مارچ 1971ء کو عبدالقیوم کے بھائی ڈھاکہ یونیورسٹی میں شہید کر دیے گئے لیکن اس کے باوجود انہوں نے پاکستان میں رہنے کو ترجیح دی۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے وقت وہ پروفیسر کہلاتے تھے۔ قرآن و حدیث کا گہرا مطالعہ تھا اور مختلف اداروں کی طرف سے انہیں موٹیویشن لیکچرز (Motivation Lectures) کے لیے بلایا جاتا تھا۔ خود بھی روتے تھے اور دوسروں کو بھی رلاتے تھے۔ سٹاف کالج کوئٹہ، سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس اور پاکستان ملٹری اکیڈمی میں ان کو مدعو کیا جاتا جہاں وہ افسروں اور کیڈٹوں کو کردار سازی (Character Building) کے موضوعات پر لیکچر دیتے تھے۔

اپنے کورس میٹ (Course mate) میں کئی بڑے اچھے دوست تھے جن میں بریگیڈئر چوہدری محمد شریف اور کرنل جمیل الرحمٰن کے لئے میرے دل میں خصوصی احترام ہے۔ بریگیڈئر شریف نے چھٹے پی ایم اے کورس کے ساتھیوں کی سالانہ ملاقاتی تقریب (Get-together) کی روایت قائم کی اور ہمیں ایک دوسرے کے حالات سے باخبر رکھا جس سے ہمارے درمیان باہمی ہم آہنگی اور اخوت کا احساس قائم رہا۔ اس سلسلے کو انہوں نے تقریباً چالیس سال تک قائم رکھا لیکن یکے بعد دیگرے بہت سے ساتھیوں کے بچھڑنے کے صدمات سے دلبرداشتہ ہو کر سالانہ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ختم کر دیا کیونکہ ہر سال ہماری تعداد کم سے کم تر ہوتی گئی اور نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ اب صرف بیس، پچیس بقید حیات ہیں۔ لہٰذا اب باہمی ملاقاتوں کی تقریب منعقد کرنے کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے اور ہم اپنی اپنی باری کے منتظر ہیں۔ بقول شاعر:

بہت آگے گئے، باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

کرنل جمیل الرحمٰن کے متعلق پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ لانگ ویک اینڈ پر ہم کیسے وقت

گذارا کرتے تھے۔ وہ ایسے لمحات تھے کہ ان کی خوشبو آج بھی دل و دماغ کو معطر کر دیتی ہے۔ ان سے عقیدت کی خصوصی وجہ یہ بنی کہ آج سے تقریباً بارہ سال قبل میں ان سے ملنے گیا۔ وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے شدید علیل تھے۔ اچھے وقتوں کو یاد کر کے ہم خوش ہوتے رہے۔ چند دنوں بعد بریگیڈیر شریف نے اطلاع دی کہ وہ انتقال کر گئے ہیں۔ ان کے گھر گیا۔ ان کے ایک رشتہ دار نے واقعہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ اس قدر شدید بیماری کی حالت میں بھی انہوں نے ضد کی کہ حج پر جائیں گے۔ سب کے منع کرنے کے باوجود نہ مانے۔ بالآخر ان کی بیگم' بھائی اور یہی کزن انہیں لے کر حج پر گئے۔

''عرفات میں قیام کے بعد مزدلفہ کے لئے روانہ ہوئے' وہاں پہنچے تو سخت بخار چڑھ گیا۔'110 ڈگری سے بھی زیادہ۔ برف کا ٹھنڈا پانی جسم پر ڈالا۔

صبح ہونے تک بخار کم ہوا' نماز پڑھی اور آگے چل پڑے جبکہ اتنے تیز بخار میں انسان زندہ نہیں رہتا۔ دوسرے دن منیٰ میں قیام کے دوران پھر بخار آیا اور آخری حد تک گیا۔ ایک بالٹی پانی میں برف ڈال کر انہیں غسل دیا تو بخار نیچے آیا۔ طواف اور سعی کی۔ عبادات مکمل ہونے پر واپس پاکستان آ گئے اور چند دنوں بعد وفات پا گئے۔''

ایسے بندے جو اللہ کی محبت میں فصیل جاں سے بھی آگے گذر جاتے ہیں انہیں اللہ راہ حق کے شہید کا درجہ عطا کرتا ہے۔ یہ درجہ کیا ہے؟ اسے سمجھنے کے لئے ایک اور واقعہ بیان کرنا چاہوں گا:

ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے فرینڈز کے نام سے تحقیقی ادارہ بنایا۔ صوبہ سرحد کی شاخ کی ذمہ داری پروفیسر ذہین احمد اور ان کے ساتھیوں جناب لودھی اور بخاری صاحب کو دی۔ بخاری صاحب کے نوجوان بیٹے کے دونوں گردے خراب ہو گئے۔ کسی نہ کسی طرح وسائل اکٹھے کئے اور بیٹے کو علاج کے لئے بمبئی بھیجا۔ ٹرانسپلانٹ ہوا اور واپس آ گئے۔ بیٹا نارمل زندگی گذارنے لگا۔

تین سال بعد گردے پھر ناکارہ ہو گئے۔ بخاری صاحب نے دوسرے ٹرانسپلانٹ کے لئے تیاری شروع کر دی لیکن بیٹے نے انکار کر دیا کہ وہ علاج نہیں کرائے گا بلکہ عمرے پر جائے گا۔ ماں باپ اور گھر والوں نے منت سماجت کی کہ اس حال میں وہ اکیلا عمرے پر کیسے جائے گا؟ بیٹے نے کہا ''میں نے کچھ رقم جمع کر رکھی ہے' کچھ آپ دے دیں' میں اکیلا ہی جاؤں گا اور انشاء اللہ عمرہ کر کے واپس آ ؤں گا۔'' بیٹے کی ضد کے سامنے ماں باپ نے ہتھیار ڈال دیے۔ بیٹا عمرے پر روانہ ہوا اور عمرہ کر کے پندرہ دن بعد واپس آ گیا۔ والد نے پوچھا' کیسے عمرہ ادا کیا؟ بیٹے نے جواب دیا:

''جس کے بلانے پر گیا تھا' اسی نے کرایا۔''

''جیسے ہی مسجد حرام کے اندر قدم رکھا' ایک بارہ چودہ سال کا عربی بچہ آگے بڑھا' السلام علیکم کہا' میرا ہاتھ پکڑ لیا اور میری خدمت پر لگ گیا۔ میرے کھانے پینے کا خیال رکھا' حتیٰ کہ عمرے کی رسومات کی ادائیگی تک کرائی۔ پورے پندرہ دن میری خدمت پر لگا رہا۔ وہ عربی بولتا تھا اور میں پشتو اور اردو لیکن ہمیں ایک دوسرے کو سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔''

والدین نے پوچھا: ''اس دوران تمہاری طبیعت بھی خراب نہیں ہوئی؟''

جواب آیا: ''دیکھئے جس حال میں گیا تھا اسی حال میں واپس آیا ہوں۔''

''ماشاءاللہ''

چند ماہ بعد بیٹے کا انتقال ہو گیا۔

بخاری صاحب بیٹے کی تجہیز و تکفین کر کے واپس آ رہے تھے تو ایک بزرگ قدم بڑھا کے آگے آئے' بخاری صاحب کے ساتھ چلتے ہوئے ان سے ہم کلام ہوئے:

''السلام علیکم' بخاری صاحب مبارک ہو۔''

''کیسی مبارک۔ میرا نوجوان بیٹا چلا گیا ہے اور آپ مجھے مبارک باد دے رہے ہیں؟''

''اللہ تعالیٰ نے آپ کے بیٹے کو وہ درجہ عطا کیا ہے جس کے لئے میں بیس سالوں سے

عبادت وریاضت کر رہا ہوں۔''

''آپ کہاں ہوتے ہیں؟''

''لاہور کے بڑے دربار میں۔''

''آپ کو میرے گھر کا راستہ کس نے بتایا؟''

''اسی نے' جس نے مجھے یہاں آنے کا حکم دیا ہے۔''

پھر وہ بزرگ ٹھہرے نہیں' واپس چلے گئے۔ معرفت کی اس منزل کی طرف جہاں وہ مقام آگہی ہے جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ میرے دوست جمیل الرحمٰن اور بخاری صاحب کے بیٹے نے اس منزل کو پالیا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ ہمارے شہیدوں کو وہ ہمت و حوصلہ عطا کرتا ہے جو اس مقام آگہی تک پہنچنے میں فصیل جاں سے آگے گذر جانے کا مضبوط دل رکھتے ہیں۔

پی ایم اے سے پاس آؤٹ ہونے کے بعد سیکنڈ لیفٹیننٹ اسلم بیگ کو 8 بلوچ رجمنٹ میں پوسٹ کر دیا گیا جو بعد میں 16 بلوچ بن گئی۔ 15 فروری 1953 کو جب وہ یونٹ پہنچے تو ان کی یونٹ موسم سرما کی اجتماعی تربیتی مشقوں کے سلسلے میں راولپنڈی کے مضافات میں سنگجانی کے نزدیک مصروف تھی۔ سیکنڈ لیفٹیننٹ اسلم بیگ کراچی سے بذریعہ ٹرین راولپنڈی پہنچے۔ ٹیکسلا اترے۔ یونٹ کے ایک آفیسر انہیں لینے سٹیشن پر آئے ہوئے تھے۔ وہ انہیں لے کر یونٹ کے فیلڈ آفس پہنچے اس وقت ایڈجوٹنٹ کیپٹن منظور احمد تھے جو انہیں کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل رحمت اللہ قریشی کے پاس لے گئے۔ انہوں نے خوش آمدید کہا۔ کچھ نصیحتیں کیں اور بتایا کہ ابتدائی دنوں میں روز مرہ کی مصروفیات کے متعلق ایڈجوٹنٹ آپ کو ہدایات دیں گے۔ ان پر خوش دلی سے عمل کرنا ہوگا۔

ایڈجوٹنٹ نے جو مصروفیات بتائیں' خوش کن نہیں تھیں لیکن حکم یہی تھا کہ ان پر خوش دلی سے عمل کرنا ہے۔ ان کا رینک اتار دیا گیا اور بتایا گیا کہ وہ ایک سپاہی کی حیثیت سے جوانوں کے ساتھ رہیں گے۔ دو ہفتوں بعد وہ لانس نائیک بنائے گئے' مزید دو ہفتوں بعد

نائیک، پھر پلاٹون حوالدار، پھر کمپنی حوالدار میجر اور پھر کمپنی کوارٹر ماسٹر حوالدار۔ ان دو مہینوں کے عرصے میں ان پر آفیسرز میس کے دروازے بند تھے۔ وہ کھانا بھی لنگر پر کھایا کرتے۔ پھر انہیں پلاٹون کمانڈر بنایا گیا اور اس کے بعد کمپنی آفیسر۔ اس کے ساتھ ہی ان کی افسری لوٹ آئی اور سیکنڈ لیفٹیننٹ کا وہ ستارہ جو ڈھائی سال کی محنت شاقہ سے انہوں نے کمایا تھا، انہیں لوٹا دیا گیا۔

جنرل بیگ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتے ہیں کہ انہیں 8 بلوچ رجمنٹ (جو بعد میں 16 بلوچ بن گئی) میں کمیشن ملا۔ ابھی وہ یونٹ میں دو تین ماہ ہی ٹھہرے ہوں گے کہ انہیں سکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ بلوچ رجمنٹل سنٹر میں رہے جو اس وقت کوئٹہ میں تھا۔ انہیں پیادہ فوج کے ہتھیاروں کا ایک کورس (انفنٹری ویپن کورس' سیریل آئی ڈبلیو 21) کرنا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے جونیئر آفیسرز لیڈرشپ کورس کیا۔ ہتھیاروں کے کورس میں انہوں نے 'اے وائی (AY)' گریڈ حاصل کیا اور جونیئر آفیسرز لیڈرشپ کورس میں 'اے (A)' گریڈ لیا۔ 80 فیصد یا اس سے زائد نمبر لینے پر اے (A) گریڈ ملتا ہے۔ ان کورسوں کے بعد ان کی یونٹ لائف کا دور شروع ہوا۔

پہلی یونٹ جس میں پوسٹنگ ہوتی ہے وہ پیرنٹ یونٹ (Parent Unit) کہلاتی ہے۔ ایک خاندان کے فرد کی طرح ہم اس کے فرد بن جاتے ہیں اور یہ رشتہ ساری زندگی قائم رہتا ہے۔ اپنی یونٹ کی کمانڈ ہر آفیسر کی امنگ ہوتی ہے لیکن میں ایسا خوش قسمت نہ تھا۔ میں 16 بلوچ رجمنٹ میں پوسٹ ہوا جسے یہ امتیاز حاصل ہے کہ اسی یونٹ سے ہم دو آرمی چیف بنے۔ یونٹ آج کل یہیں ہے' جنرل باجوہ کی سکیورٹی اور پروٹوکول کی ذمہ دار ہے۔ یونٹ کے ریزنگ ڈے (Raising Day) پر کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل رابعہ افضال احمد نے مجھے یونٹ کا Ensignia دیا جو ایک Piece of Art ہے جس میں بٹالین کے اہم تاریخی واقعات کندہ (Engrave) ہیں اور ہم دونوں چیف کی تصویریں بھی ہیں۔ یونٹ کے دوا ین سی اوز نے اسے ڈیزائن کیا اور بنایا بھی ہے۔

16 بلوچ کی یادگار شیلڈ، فوج کے دوسربراہوں کی تصاویر کے ساتھ

اسلم بیگ چونکہ ہاکی کے اچھے کھلاڑی تھے اس لئے وہ جلد ہی ڈویژن اور پھر کور کی ٹیم میں شامل ہو گئے۔ دو چار میچ ہی کھیلے ہوں گے کہ انہیں آرمی ٹیم میں ٹرائل (Trials) کی کال آ گئی۔ اس وقت آرمی کی ٹیم میں کیپٹن عاطف اور کیپٹن آفریدی شامل تھے۔ اب جو یونٹ سے نکلے ہیں تو شہر شہر گھومتے پھرے۔ لاہور، پنڈی، پشاور، ملتان، کوئٹہ، چار مہینے بعد واپس آئے۔ واپسی پر کمانڈنگ آفیسر کے حضور پیشی ہو گئی۔ انہوں نے سخت غصے کے عالم میں پوچھا:

''تمہیں پتہ ہے تم کتنا عرصہ یونٹ سے غائب رہے ہو؟''

''یس سر! چار مہینے گیارہ دن۔''

''تمہیں افسر بننا ہے یا ہاکی چیمپئن بننا چاہتے ہو۔''

''انشاء اللہ اچھا افسر بنوں گا۔''

''افسر بننا ہے تو یونٹ میں بیٹھو۔ یہ تمہارے سیکھنے کے دن ہیں۔ سیکھو۔ میں تمہیں کھیلنے سے نہیں روکتا، کھیلو۔ لیکن ڈویژنل (Divisional) ٹیم سے آگے مت جاؤ۔''

جنرل اسلم بیگ کا کہنا ہے کہ اس طرح ان کے کمانڈنگ آفیسر نے انہیں افسری کی راہ پر گامزن کر دیا ورنہ وہ ساری عمر کھیل کود ہی میں گزار دیتے۔

انہوں نے ہنستے ہوئے بتایا:

''اسی دوران مجھے لاء کورس پر راولپنڈی بھیجا گیا۔ ظاہر ہے میں تو کھیل میں مگن رہا تھا۔ تیاری کی نہیں' پڑھا بالکل نہیں۔ مجھے سی (C) گریڈ ملا جو ساری عمر میرے ڈوزیئر (Dossier) میں موجود رہا۔ فوج میں کورسز کی بڑی اہمیت ہے۔ اعلیٰ تعلیم، اچھی اپوائنٹمنٹ یا بیرون ملک کورس یا تعیناتی کے لئے افسروں کے انتخاب کے وقت مختلف کورسوں میں ان کی کارکردگی دیکھی جاتی ہے۔ ایک انٹرویو کے دوران کوائف کی جانچ پڑتال کرنے والا افسر لیفٹیننٹ اسلم بیگ کو سامنے بٹھا کر ان کی فائل پڑھتا:

۔ انفنٹری ویپن کورس گریڈ اے وائی' درست؟

۔ جونیئر آفیسرز لیڈرشپ کورس گریڈ اے' درست؟

۔ کیمیکل وارفیئر کورس گریڈ بی وائی' درست؟

۔ لاء کورس میں گریڈ سی' تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

خاموشی۔

''یا اللہ! اپنے کوائف سے 'سی' کو کیسے مٹاؤں۔ یہ داغ تو دھونے سے بھی نہیں چھوٹے گا۔''

لیکن اسلم بیگ مایوس نہیں ہوئے بلکہ اس ندامت کو یاد کر کے باقی کورسز میں سخت محنت کی اور اچھے گریڈ حاصل کئے لیکن پھر بھی 'سی' نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا اور وہ ان کے کوائف میں ہمیشہ نمایاں رہا۔

جب وہ کیپٹن ہوئے تو انہیں ملٹری پولیس کے کسی کورس پر بھیجا گیا۔اس میں انہوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور بی پلس وائی پلس (B+Y+) گریڈ حاصل کیا۔اس بنیاد پر انہیں اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرون ملک ملٹری پولیس کے کورس پر بھیجنے کے لئے انٹرویو کے لئے بلایا گیا۔چیف آف جنرل سٹاف میجر جنرل یحیٰی خان انٹرویو بورڈ کے سربراہ تھے۔چند سوالات کرنے کے بعد جنرل یحیٰی نے انہیں منتخب ہونے کی خوشخبری سنائی اور کہا کہ وہ باہر جانے کی تیاری کریں اور نصیحت کی کہ کورس پر سخت محنت کرنا ہوگی۔

لیکن اسلم بیگ کسی اور ہی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔وہ سوچ رہے تھے کہ اگر انہوں نے یہ کورس کرلیا تو وہ ملٹری پولیس ہی کے ہو کر رہ جائیں گے اور فوج کے رئیسی دھارے سے الگ ہو جائیں گے۔انہوں نے سپیشل سروسز گروپ کے لئے بھی درخواست دے رکھی تھی۔یہ بات انہوں نے جنرل یحیٰی کو بتائی۔انہوں نے اپنے رفقائے کار سے پوچھا کہ ”پھر انہیں انٹرویو کے لئے کیوں بلایا گیا ہے۔“اس طرح اسلم بیگ خود اپنی خواہش پر بیرون ملک جانے کے اس موقعے سے محروم رہے۔

زندگی میں زیادہ تو لوگ ایسے ہوتے ہیں جو خود کو وقت کے دھارے کے حوالے کر دیتے ہیں۔حوادث زمانہ کی موجیں انہیں جدھر چاہیں اچھال دیں لیکن کچھ لوگ اپنی راہیں خود تراشتے ہیں' اپنی منزلیں خود متعین کرتے ہیں اور مستقل مزاجی سے اپنی منتخب کردہ راہوں پر چلتے رہتے ہیں' بقول علامہ اقبال:

نہیں یہ شان خودداری' چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے' کوئی زیب گلو کر لے

اسلم بیگ بھی انہی میں سے ایک ہیں۔بظاہر دھیمی شخصیت کے مالک' ٹھہر ٹھہر کے بولتے ہیں' متانت اور وقار کے ساتھ۔بالکل نہیں لگتا کہ یہ شعلہ بار شخصیت ہیں۔ہاکی کے کھلاڑی رہے ہیں' ہاکی کا کھلاڑی تیز طرار' چست' چاق و چوبند شخص ہوتا ہے۔وہ عقاب کی طرح گیند پر نظر رکھتا ہے' چیتے کی طرح لپکتا ہے اور چشم زدن میں گیند کسی ساتھی کو دے دیتا

ہے یا گول میں پھینک دیتا ہے۔ایک لمحے کی تاخیر کھیل کا پانسہ پلٹ سکتی ہے' جیت کو ہار میں بدل سکتی ہے' بروقت' بروقت فیصلے کی بڑی اہمیت ہے اور یہی عادت اگر شخصیت کا حصہ بن جائے تو زندگی کے دیگر معاملات میں بروقت' صحیح فیصلے بڑے دور رس نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔

انفنٹری لائف فوج کے دوسرے شعبوں کی نسبت زیادہ پرمشقت ہوتی ہے' صبح سویرے فالن ہونا پڑتا ہے جس میں پلاٹون کمانڈرز' کمپنی کمانڈرز کو پریڈ اسٹیٹ دیتے ہیں' کتنے آدمی چھٹی پر ہیں' کتنے دوسری جگہوں پر ڈیوٹی پر گئے ہوئے ہیں' کتنے آدمی بیماری کے سبب ہسپتال یا ایم آئی روم (میڈیکل انسپکشن) روم گئے ہیں اور کتنے حاضر ہیں۔پانچوں کمپنی کمانڈر ٹو آئی سی یعنی سیکنڈ ان کمانڈ کو اعداد و شمار سے مطلع کرتے ہیں اور ٹو آئی سی بٹالین کمانڈر کو رپورٹ دیتا ہے۔پریڈ اسٹیٹ (Parade State) کے بعد ڈرل ہوتی ہے اور پھر پورا دن تعلیم و تربیت کی مختلف کلاسوں یا رینجز پر شوٹنگ (فائرنگ) میں گزرتا ہے۔شوٹنگ کے بعد ہتھیاروں کی صفائی لازمی ہوتی ہے' شام کو کھیلوں پر جانا ہوتا ہے اور رات کو ”سب اچھا“ (All OK) کی رپورٹ لینی ہوتی ہے۔

جونیئر افسروں کو روزمرہ کی ان مصروفیات کے علاوہ بھی ڈیوٹی دینا پڑتی ہے جیسے رات کو یونٹ کے اردگرد حفاظتی چوکیوں اور کوارٹر گارڈ چیک کرنا' مختلف امتحانوں کے امتحانی بورڈ کے رکن کی حیثیت سے امتحانات منعقد کرانا۔ڈسپلن یا قوائد کی خلاف ورزی پر تحقیقات کے لئے تشکیل کردہ انکوائری کمیٹی میں شامل ہونا' یونٹ یا میس پراپرٹی کی جانچ پڑتال کے لیے بنائے گئے سروے بورڈ میں شامل ہو کر میس کی پرچ پیالیاں' کانٹے' چمچے' چھریاں گننا وغیرہ وغیرہ معمول ہوتا ہے۔

یہ زندگی ویسے بھی کافی کٹھن ہوتی ہے' اسلم بیگ کو جانے کیا سوجھی کہ انہوں نے سپیشل سروسز گروپ جنہیں عرف عام میں کمانڈو کہا جاتا ہے' کے لیے درخواست دے دی۔ہم نے ان سے پوچھا ”انفنٹری یونٹ کی لائف تو ویسے ہی بڑی سخت ہوتی ہے تو پھر آپ نے ایس

ایس جی کے لئے کیوں درخواست دی؟

سپیشل سروسز گروپ (Special Services Group - SSG) ایک نئی یونٹ تھی جو جنرل ایوب خان کے ملٹری ٹیک اوور کے بعد بنائی گئی اور یہ وقت تھا جب پاکستان بغداد پیکٹ کا حصہ بنا اور امریکی ترجیحات کی بنیاد پر اس یونٹ کی تشکیل شروع ہوئی۔ چراٹ اس گروپ کا ہیڈکوارٹر بنا جہاں امریکی میرین (Marine) کی ٹریننگ ٹیم تربیت دیتی تھی۔ اس گروپ کے لئے افسروں کا خصوصی انتخاب ہوتا تھا۔

دراصل یہ ایک بالکل نئی چیز تھی' ان کی وردی' ہتھیار اور رکھ رکھاؤ بہت مختلف اور دلچسپ تھا۔ ایک ایڈونچر (Adventure) تھا جو نوجوان آفیسرز کو پسند تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے بھی اس یونٹ کا حصہ بننے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ نہ صرف درست تھا بلکہ ایک نیا تجربہ بھی تھا جہاں دل ودماغ اور جسم وجاں کا مسلسل امتحان ہوتا رہتا ہے' ذرا چوک ہوئی تو وہیں سزا بھی مل جاتی تھی۔

1957ء میں اٹک فورٹ میں ہمارا مختلف زاویوں سے ٹیسٹ لیا گیا۔ دیکھنا یہ مقصد تھا کہ مشکل حالات میں ہمارے اوسان خطا تو نہیں ہوتے اور مشکل سے نکلنے کے لئے تدبیریں بنانے کی صلاحیت ہے۔ اس مرحلے کے بعد کمانڈنٹ کرنل ابوبکر عثمان مٹھا سے انٹرویو ہوا۔ انہوں نے پوچھا کہ "پچھلے چھ مہینوں میں کونسی کتابیں پڑھی ہیں۔" دو کتابیں پڑھی تھیں بتا دیں۔ اس کتاب کے متعلق زیادہ پوچھا جس میں مار دھاڑ اور بچاؤ کے واقعات زیادہ تھے۔

پاک فوج میں سپیشل سروسز گروپ کی تشکیل کی کہانی بڑی دلچسپ اور ڈرامائی ہے۔ 1954ء کے اولین دنوں کی بات ہے جب جنرل محمد ایوب خان پاک فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ انہی دنوں یونائیٹڈ اسٹیٹ ملٹری اینڈ ایڈوائزری گروپ (USMAAG) معرض وجود میں آیا۔ اس گروپ کا کام پاک فوج کو ضروری ہتھیاروں کی فراہمی بھی تھا اور افسروں کو مختلف کورس کرانے کے لئے امریکی فوج کے مختلف تربیتی اداروں میں بھی بھیجا جاتا تھا۔ لیفٹیننٹ کرنل ابوبکر عثمان مٹھا ملٹری ٹریننگ ڈائریکٹوریٹ میں جی ایس او

ون (GSO-1) تعینات تھے۔ ایک دن انہیں حکم ملا کہ وہ ڈپٹی چیف آف جنرل سٹاف (DCGS) بریگیڈئر یحییٰ خان سے ملیں۔ یہ جب وہاں پہنچے تو ان کا تعارف ایک امریکی' لیفٹیننٹ کرنل ڈان بنٹے (Don Bunte) سے کروایا گیا۔

یحییٰ خان نے بتایا کہ یہ کرنل صاحب ابتدائی سروے کے لئے پاکستان آئے ہیں۔ ان کا مشن یہ ہے کہ اس امکان کا جائزہ لیں کہ پاکستان آرمی میں کمانڈو قسم کی کوئی یونٹ کھڑی کی جا سکتی ہے یا نہیں۔ کرنل مٹھا کو کہا گیا کہ وہ کرنل بنٹے کو ہر قسم کی مدد فراہم کریں اور وہ جہاں چاہیں انہیں لے جائیں۔ اس سلسلے میں تحریری احکامات بھی دے دیے گئے اور یہ ہدایت کی گئی کہ ساری کاروائی کو خفیہ رکھا جائے۔ کرنل بنٹے نے بتایا کہ وہ سارے پاکستان کو بذریعہ سڑک اور پھر بذریعہ ہوائی جہاز دیکھنا چاہتے ہیں۔

کرنل مٹھا نے بتایا کہ اسے تقریباً چھ ماہ کا عرصہ درکار ہوگا۔ سفر کا آغاز پشاور سے ہوا۔ پہلی منزل کوئٹہ تھی۔ حفاظت کے لئے سکاؤٹس کی ایک پلاٹون ساتھ تھی۔ کوئٹہ سے جیوانی پہنچے اور پھر ملتان سے ہوتے ہوئے راولپنڈی پہنچے۔ سفر کے دوران کرنل مٹھا نے کرنل ڈان بنٹے کو بتایا کہ سندھ میں گرمی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے سندھ کا دورہ پروگرام سے نکال دیا گیا۔ مشرقی پاکستان کے سروے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

اس وقت تک کرنل مٹھا کو معلوم ہوگیا تھا کہ امریکہ کا مقصد کیا ہے۔ امریکہ کو روس کی طرف سے خدشہ تھا کہ وہ گرم پانیوں کی تلاش میں مغربی پاکستان کو روند کر بحر عرب تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ پاکستان میں کمانڈو یونٹ کے پردے میں وہ ایک ایسی فورس تشکیل دینا چاہتے تھے جو دشمن کی صفوں کے عقب میں رہ کر کاروائیاں کرنے پر قادر ہو۔ انگریزی میں اس فورس کو سٹے بی ہائینڈ فورس (Stay Behind Force) کہا جاتا ہے۔ سفر کے بعد ڈان بنٹے نے ایک مختصر رپورٹ لکھی جس میں اس نے اپنے امریکی افسران بالا کو آگاہ کیا کہ اس فورس کو کھڑا کرنے کے لئے کس کس چیز کی ضرورت ہوگی۔ یہ رپورٹ لکھ کر ڈان امریکہ چلا گیا۔

یہ رپورٹ پہلے بریگیڈئر یحییٰ خان اور پھر جنرل ایوب خان کو دکھائی گئی۔ جنرل ایوب

خان نے کرنل مٹھا کو بلایا اور ان کی رائے طلب کی۔ کرنل مٹھا نے رائے دی کہ اگر اس قسم کی کوئی یونٹ ہمارے ہاں موجود ہو اور وہ دشمن کی صفوں کے عقب میں کمانڈو کارروائیاں کرنے کی اہل بھی ہو تو اس سے ہماری ایک اہم آپریشنل ضرورت پوری ہو جائے گی۔ جنرل ایوب نے یہ رائے سن کر کرنل ڈان بنے کی تجاویز منظور کر لیں۔

کرنل ڈان بنے اگست 1955 میں واپس پاکستان آ گیا۔ اس کے ساتھ دو افسر اور تھے' کیپٹن رس طر اور لیفٹیننٹ شوپی۔ وہ یہ خبر بھی لایا کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے پاکستان میں ایک نئے پی بائینڈ فورس کی تشکیل کی منظوری دے دی ہے۔ کرنل مٹھا کو ایک بار پھر جی ایچ کیو بلایا گیا اور کہا گیا کہ وہ امریکی ٹیم کے ساتھ کام کریں۔ سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ نئی یونٹ کہاں مقیم ہو گی۔ ضرورت یہ تھی کہ جگہ الگ تھلگ ہو' آبادیوں سے دور ہو' مواصلات کا نظام بہتر ہو' آنے والے امریکی انسٹرکٹروں اور اپنے پاکستانی افسروں اور جوانوں کو رہائش کی سہولیات میسر ہوں۔

امریکی کرنل ڈان بنے اور کرنل مٹھا نے پورے مغربی پاکستان کا دورہ کیا اور بہت سی جگہیں دیکھیں' ان میں فورٹ منرو' چمن' وانا اور رزمک شامل تھیں۔ آخر کار فیصلہ ہوا کہ چراٹ اور قلعہ اٹک موزوں ترین مقامات ہیں۔ چراٹ میں مکانوں' بیرکوں اور دوسری عمارات کے علاوہ چراٹ جانے والی سڑک کا آخری چار میل کا ٹکڑہ بہت زیادہ مرمت طلب تھا۔ امریکی اس بات پر رضامند ہو گئے کہ مرمت کے سارے اخراجات وہ خود برداشت کریں گے۔

ادھر چونکہ کرنل مٹھا کو دشمن کے عقب میں قیام اور کارروائی کا کوئی تجربہ نہ تھا' امریکیوں کی تجویز تھی کہ وہ امریکہ جا کر اس کی تربیت حاصل کریں۔ یہ تجویز کمانڈر انچیف کو پیش ہوئی تو انہوں نے اس کی منظوری دے دی۔ وہاں کرنل مٹھا سے وی آئی پی سلوک کیا گیا۔ نیو یارک میں چار اساتذہ نے انہیں تربیت دی۔ ایک اور شہر میں پیراشوٹ کی ٹریننگ دی گئی۔ لاس اینجلیس جو امریکہ کے مغربی کنارے پر واقع ہے' زیر آب تیراکی (فراگ مین) کی تربیت دی گئی۔ واپسی پر وہ کمانڈر انچیف سے ملے اور انہیں امریکہ کے دورے کے بارے

میں تفصیلی رپورٹ دی۔ انہوں نے ایس ایس جی یونٹ قائم کرنے کی منظوری دے دی اور کہا کہ کوئی مشکل پیش آئے تو ان سے براہ راست مل سکتے ہیں۔ یوں ایس ایس جی کے قیام کا آغاز ہوا۔

یہی وہ وقت تھا جب اسلم بیگ سلیکشن کے لیے چراٹ پہنچے۔ کرنل مٹھا نے افسروں اور جوانوں کے انتخاب کے لئے بڑا کڑا معیار مقرر کر رکھا تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے انسپکٹر جنرل فرنٹیئر کور بریگیڈیئر رحمان گل (جو بعد میں لیفٹیننٹ جنرل ہو کر ریٹائر ہوئے) سے مل کر انہیں بتایا کہ وہ سکاؤٹس میں سے بھی کچھ جوان ایس ایس جی کے لیے لینا چاہتے ہیں' لہٰذا فرنٹیئر کور کی طرف سے 400 سکاؤٹس مہیا کئے گئے لیکن ان میں سے صرف چند منتخب ہوئے۔ اسی طرح افسروں کے انتخاب کا معیار بھی بہت سخت تھا۔ آئی ایس ایس بی (ISSB) کی طرح افسروں کو تین چار دن اٹک قلعے میں ٹھہرایا جاتا تھا۔ پہلے دن تحریری امتحان ہوتا جس کے پرچے نفسیاتی نقطہ نظر سے تیار کئے جاتے تھے۔

کیپٹن اسلم بیگ منتخب کر لئے گئے اور ان کی پوسٹنگ 19 بلوچ میں ہو گئی جو اس وقت ایس ایس جی یونٹ شمار ہوتی تھی۔ پھر ان کا تین ماہ کا بنیادی کورس شروع ہوا۔ بنیادی کورس دراصل 'بریک۔ان' (Break-in) کورس ہوتا ہے جس میں مشکل سے مشکل حالات سے گذرنا پڑتا ہے' اوسان کو درست رکھتے ہوئے مقاصد حاصل کرنے ہوتے ہیں۔ یہ کورس بھی تمام ہوا اور ہمیں 'لیاقت' کمپنی دی گئی۔ اس وقت اے' ای' جی' ایچ' ایل (A.E.G.H and L) کمانڈو کمپنیاں تھیں اور 'آئی کمپنی' سگنل کمپنی تھی۔ بلڈنگ نمبر 33 میں آپریشنل پلاننگ اور ٹریننگ کا کام ہوتا تھا۔ میں نے پورا عرصہ کمانڈو کمپنی میں گذارا' کچھ ایسے بھی خوش قسمت تھے جنہوں نے بلڈنگ نمبر 33 میں سارا وقت گزارا۔ ہم تھے کہ فٹ سلاگنگ (Foot Slogging) کرتے رہے اور بلڈنگ نمبر 33 والے ہم پر طنز کرتے کہ ہمارے پاؤں تو جیپ کے ایکسیلیٹر (Accelator) کے لئے بنے ہیں۔

اس کورس کے دوران افسر اور جوان سخت دباؤ میں رہتے کیونکہ انہیں ایسے ایسے مشکل

کام کرنے پڑتے جن کا انہوں نے پہلے کبھی خواب بھی نہ دیکھا ہوتا۔ مثال کے طور پر انہیں کہا جاتا کہ وہ ایک مستورگاہ (Hide out) تک پیدل چل کر جائیں جو چالیس میل دور ہوتی۔ جب وہ وہاں پہنچتے تو انہیں بتایا جاتا کہ چونکہ دشمن کو ان کے آنے کی خبر ہو چکی ہے اس لئے وہ ایک دوسری مستورگاہ میں جائیں جو مزید دس میل کے فاصلے پر ہوتی۔ وہاں تک پہنچنا جسمانی صحت کا امتحان ہوتا۔ ایسی جسمانی مشقتوں کے علاوہ انہیں گولے بارود استعمال کرنے کی تربیت بھی دی گئی۔ کس پل یا عمارت کو اڑانے کے لیے کتنا بارود لگاتا ہے' کیسے لگاتا ہے' بارودی سرنگیں کیسے بچھائی ہیں اور اگر دشمن کی بچھائی گئی بارودی سرنگوں سے گذرنا پڑے تو انہیں کیسے ناکارہ بنانا ہے۔

زیر آب پیراکی (Frogmanship) کی تربیت کے لئے منگلا لے جایا گیا۔ سب سے مشکل کام تھا سروائیول کورس (Survival Course) جس میں کچھ دنوں کے لیے کسی ویران سے علاقے میں تنہا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ راشن مہیا کیا جاتا ہے نہ پیسے پاس رکھنے کی اجازت ہوتی ہے۔ بس زمین سے اپنا رزق چھیننا ہوتا ہے اور پیٹ کی آگ بجھانی ہوتی ہے۔ اس مشق میں چنے چبانے پڑتے ہیں' جنگلی بیر' جڑی بوٹیاں' کھمبیاں' جو میسر آئے کھانا پڑتا ہے۔

ایس ایس جی کا فارمیشن سائن کمانڈوز کی سرگرمیوں کی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اس کا پس منظر سیاہ ہے جو رات کی تاریکی کو ظاہر کرتا ہے اور اس کے اندر آسمانی بجلی کی دو لہریں کمانڈو حملوں کی شدت اور تیزی کی مظہر ہیں۔ ان کے درمیان دو خنجر (Daggers)' کمانڈو کی قوت کا اظہار ہے۔ اس خنجر کے اوپر جو ستارہ ہے وہ بلندیوں کی طرف جانے کا ایک استعارہ ہے۔ اسی طرح پیراشوٹ ونگ کی اڑان شاہین کی بلندی پرواز کا اشارہ ہے اور اس کا نقرئی رنگ ایک انفرادیت کا مظہر ہے کہ کمانڈو فوج کے دوسرے شعبوں کی نسبت زیادہ آب و تاب رکھتے ہیں۔

چراٹ کے تربیتی علاقے میں سانپ کثرت سے پائے جاتے ہیں جو خوراک کا بہترین

ذریعہ ثابت ہوتے ہیں۔ ہم نے جنرل صاحب سے پوچھا:

''کبھی آپ نے بھی سانپ کھائے؟''

مسکراتے ہوئے بولے:

''سانپ پکڑنے اور اس کا سر کاٹ کر کھانے کا طریقہ سیکھا ہے جسے کچا بھی کھا سکتے ہیں لیکن اگر پکانے کا موقع مل جائے تو مچھلی جیسا مزہ ہوتا ہے۔

یہ دوسرا کمانڈو کورس مارچ 1959ء میں اختتام پذیر ہوا اور تین مزید کمپنیاں کھڑی کی گئیں (بے' کے اور ایل) کیپٹن زیڈ اے خان' بریگیڈئر ہو کر ریٹائر ہوئے ("The Way it was" کے مصنف بھی ہیں)۔ میجر ایس اے درانی کو K کمپنی اور کیپٹن اسلم بیگ کو ایل کمپنی کی کمانڈ دی گئی۔ ان کی کمپنی میں تین اور افسر بھی تھے' کیپٹن حنیف' مشیر محمد اور عبدالرؤف۔ جب ایس ایس جی کمپنیوں کی تشکیل مکمل ہوگئی تو ان کو پاکستان کے مختلف جغرافیائی خطوں میں ریکی کے لیے بھیجا گیا۔

اسلم بیگ کی کمپنی کو ٹاسک ملا کہ بلوچستان کا ساحلی علاقہ ہنگال دریا سے لے کر جیوانی تک اور شمال میں خضدار سے پنجگور تک کے علاقے کی نگرانی کرنی ہے اور ساتھ ہی اس پورے علاقے کی 'سٹے بی ہائینڈ' آپریشنل رپورٹ تیار کرنی ہے۔ اس کام کے لئے وہ پہلے کراچی پہنچے اور وہاں سے لسبیلہ کے علاقے سے ہوتے ہوئے خضدار' تربت' گوادر' اور مارا' پسنی اور جیوانی کے علاقوں کا تفصیلی سروے کیا۔ اس وقت گوادر جو مسقط کا حصہ تھا' اسے پاکستان نے خرید لیا تھا۔ 8 دسمبر 1958ء کو گوادر پاکستان کا حصہ بنا۔ ہماری یہ پہلی یونٹ تھی جو اگلے سال فروری کے مہینے میں وہاں پہنچی تھی۔ تقریبا تین ماہ تک ان علاقوں میں ڈیوٹی انجام دی اور اپریل 1959ء میں چراٹ واپس لوٹے۔ انہی دنوں بلوچستان میں فوج نے خان آف قلات کے خلاف آرمی ایکشن شروع کیا۔ بلوچستان میں آرمی ایکشن کی سپورٹ میں یہ کمپنی شامل رہی۔

زندگی نشیب و فراز سے عبارت ہے' کبھی دھوپ' کبھی چھاؤں' کبھی دکھ' کبھی سکھ' کبھی

بہار کی معطر فضائیں' کبھی خزاں کا پت جھڑ۔ پر عزم لوگ مشکلات سے گھبرایا نہیں کرتے۔ زمانے کی ٹھوکریں انہیں نیا حوصلہ عطا کرتی ہیں۔ وہ ہر مشکل میں آگے بڑھنے کا راستہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ مایوسی ان کے ہاں کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ایسے لوگوں کی مدد فرماتا ہے۔ اس کا فرمان ہے: (بے شک ہر مشکل کے بعد آسانی ہے' یقیناً ہر مشکل کے بعد آسانی ہے)۔ اسلم بیگ کی عسکری زندگی میں نشیب و فراز کا یہ تسلسل بڑی باقاعدگی سے پایا جاتا ہے۔ کبھی پروموشن' کبھی ڈیموشن' کبھی کورٹ مارشل کا خطرہ' کبھی ملازمت سے فارغ الخطی کا خدشہ لیکن اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان نے انہیں ہمیشہ ثابت قدم رکھا اور وہ فوج کے بلند ترین عہدے تک پہنچے۔

بلوچستان کی ریکی مکمل کر کے وہ واپس آئے تو ان کی کمپنی مزید ایک سال تک چراٹ میں رہی۔ پھر اٹک آ گئی اور قلعے کے اندر مقیم ہوئی۔ اسی دوران جون 1959 میں ان کی شادی ہو گئی۔ ہم نے ان سے پوچھا:

''یہ شادی لو میرج تھی یا ارینجڈ''

انہوں نے بتایا کہ والدین نے اس کا اہتمام کیا تھا۔

چراٹ کی ہنگامہ خیز زندگی میں شادی کر لینا بڑے حوصلے کی بات تھی۔ میں خوش قسمت تھا کہ میری شادی سے چند ماہ پہلے کیپٹن نسیم اقبال اور کیپٹن سرفراز بھی دلہنیں لے آئے تھے اور یہ تین دلہنیں (Three Brides) کے نام سے پہچانی جانے لگیں۔ ہمارے کمانڈنگ آفیسر کی بیگم اندومتھا ان کا خاص خیال رکھتیں' نصیحت و ہدایت دیتی رہتیں۔ ہمارے سیکنڈ ان کمانڈ کرنل اسلم کی بیگم کشور بڑی بھابھی کی طرح اس کمانڈو خاندان کی سرپرستی کرتیں اور درجن سے زیادہ ''چھڑے آفیسرز'' ہمارے کچن میں موقع ملتے ہی سب کھانے کی چیزیں چٹ کر جاتے اور ہماری مشکل کو سمجھتے ہوئے میس ویٹر بابا محمد یوسف کھانے کی ٹرے لے کر پہنچ جاتے اور اپنا انعام پاتے۔

اٹک قلعے کے باہر دریائے سندھ اور دریائے کابل کے سنگم پر ایک اونچی جگہ پر واقع

ریسٹ ہاؤس میں انہیں رہائش ملی۔ ریسٹ ہاؤس سے دریاؤں کا سنگم صاف نظر آتا تھا۔ دریائے کابل کا صاف پانی اور دریائے سندھ کا گدلا پانی کافی دور تک ساتھ ساتھ چلتے اور بالآخر باہم مدغم ہو جاتے۔ کناروں پر آہنی چٹانیں ایستادہ تھیں۔ یہاں دریا کا بہاؤ بڑا تیز ہوتا ہے۔ اس سے بہتر ہنی مون کے لیے کیا جگہ ہو سکتی تھی۔

انہی دنوں ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا۔ کمپنی کے کچھ افراد کو بارودی سرنگوں کی تربیت دی جا رہی تھی۔ انسٹرکٹر صوبیدار کو گرچہ تاکید تھی کہ وہ تربیتی کلاس اسلحہ خانے سے دور منعقد کریں لیکن وہ چونکہ اسلحہ خانے کے انچارج بھی تھے اور اس دن اسلحہ خانے کی صفائی بھی کروانی تھی تو انہوں نے میگزین کے باہر ہی کلاس لگا لی۔ ایک بارودی سرنگ میں غیر متحرک آلہ (ڈیٹونیٹر) کی جگہ غلطی سے اصلی ڈیٹونیٹر لگا دیا گیا۔

اس بارودی سرنگ کو ایک کرسی کے نیچے اس طرح چھپانا تھا کہ جونہی اس پر دباؤ پڑے سرنگ پھٹ جائے۔ اب جونہی صوبیدار صاحب اس پر بیٹھے' وہ واقعی پھٹ گئی۔ شعلے بلند ہوئے' چاروں طرف دھوئیں کے بادل پھیل گئے۔ کئی لوگ زخمی ہوئے' دو سپاہی شہید ہوئے۔ اسلم بیگ کو قصوروار ٹھہرایا گیا کہ انہوں نے صحیح نگہداشت کیوں نہ کی۔ انہیں کمپنی کی کمانڈ سے ہٹا دیا گیا اور میجر سلیمان کو ان کی جگہ کمپنی کی کمانڈ سونپ دی گئی۔ چھ ماہ بعد انہیں کمان دوبارہ ملی۔

اگست 1960ء میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک بیٹی عطا کی' نام لبنیٰ رکھا گیا۔ اگلے سال ان کے چھوٹے بھائی مرزا اظفر بیگ اور ڈاکٹر مرزا اظہر بیگ علی گڑھ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو کر پاکستان آئے۔ انہوں نے اسلم بیگ کے ہاں قیام کیا۔ جلد ہی اظفر بیگ کو پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں ملازمت مل گئی اور ڈاکٹر اظہر بیگ پہلے دو سال ایڈورڈ کالج پشاور اور اس کے بعد زرعی یونیورسٹی فیصل آباد میں لیکچرار مقرر ہوئے۔

انہی دنوں جنرل محمد ایوب خان نے ریاست دیر کے نواب کے خلاف فوجی ایکشن کا فیصلہ کیا۔ قیام پاکستان سے ہی نواب آف دیر کے تعلقات حکومت پاکستان سے خوشگوار نہ

تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نواب صاحب' افغان حکمرانوں کے زیر اثر تھے جنہوں نے پشتونستان کا شوشہ چھوڑ رکھا تھا۔ نواب آف دیر کو اس بات کا رنج بھی تھا کہ حکومت پاکستان' ریاست سوات کے ساتھ تو اچھے تعلقات رکھتی ہے لیکن ریاست دیر کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔ پاکستان نے کئی بار کوشش کی کہ نواب آف دیر کی یہ غلط فہمی دور کی جائے۔

1954 ء میں جب جنرل ایوب خان پاکستان آرمی کے کمانڈر انچیف تھے' انہوں نے اس وقت کے سیکرٹری دفاع اسکندر مرزا کے ہمراہ نواب آف دیر سے ملاقات کی تھی اور دوسرے تحفوں کے علاوہ انہیں چار سو تھری ناٹ تھری رائفلیں بھی پیش کی تھیں لیکن اس ملاقات کے بعد بھی نواب آف دیر کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ 1960ء میں یہ اطلاعات آئیں کہ نواب کے بیٹے خان آف جنڈال نے افغان حکومت کی ملی بھگت سے باجوڑ میں ایک افغان لشکر اکٹھا کر لیا ہے۔ بعض رپورٹوں کے مطابق اس لشکر کی تعداد پچیس ہزار تھی۔

فوجی ایکشن کے لیے ایک کمپنی بذریعہ جہاز چترال بھیجی گئی۔ میجر اسلم بیگ کی کمپنی نے سڑک کے ذریعے دیر پہنچنا تھا۔ جب ایکشن شروع ہوا تو نواب آف دیر کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں ہوئی اور وہ خاموشی سے پاک فضائیہ کے ہیلی کاپٹر میں سوار ہو گئے۔ کرنل مٹھا ان کے ہمراہ تھے۔ نواب آف دیر اور ان کے بیٹے خان آف جنڈال کو رسالپور لایا گیا اور بعد میں پتہ چلا کہ 25000 کے لشکر جمع ہونے کی خبریں غلط تھیں۔ جنرل اسلم بیگ کا کہنا ہے کہ ہمیں اس کا تمغہ بھی ملا لیکن میرا اندازہ ہے کہ: ''غلط اطلاعات کی بنیاد پر یہ آپریشن کیا گیا حالانکہ مذاکرات کے ذریعے یہ معاملہ حل ہو سکتا تھا۔ یہی وہ غلطی ہے جو اس وقت سے لے کر اب تک دہرائی جا رہی ہے۔'' وہ غلطی کیا ہے؟ میں اس کی وضاحت کرنا چاہوں گا۔

پہلی وجہ یہ ہے کہ ہمارے قبائلی بھائی جب کسی بات پر احتجاج کرتے ہیں اور ان کے مطالبات نہ مانے جائیں تو وہ بندوق لے کر پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں جسے حکومت بغاوت کا نام دے کر ان کے خلاف لشکر کشی کر دیتی ہے۔ ایسے ہی بلوچستان میں پانچ مرتبہ

لشکر کشی ہو چکی ہے۔ اس وقت دیر' باجوڑ' وزیرستان اور فاٹا کے علاقوں میں لشکر کشی ایسی ہی غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔

اسی طرح 1976ء میں کوہستان کے لوگوں نے جنگل کی لکڑی کاٹنے کے معاملے پر احتجاج کیا اور پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ جنرل ضیاء نے ان کی سرکوبی کے لئے حکومت سے اجازت مانگی۔ میں اس وقت نیشنل ڈیفنس کالج میں وار کورس کا چیف انسٹرکٹر تھا۔ میرے ایس ایس جی کے ساتھی بریگیڈئر امتیاز وزیراعظم کے ملٹری سیکرٹری تھے۔ اس سے قبل کہ لشکر کشی ہوتی میں نے بریگیڈئر امتیاز سے رابطہ کیا اور کہا کہ وزیراعظم کو بتایئے کہ یہ بغاوت نہیں ہے روزی روٹی کا مسئلہ ہے بات چیت سے مسئلے کا حل نکالیں۔ بات چیت ہوئی اور معاملہ حل ہو گیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوتے تو ایسے ہی مسائل پیدا ہوتے ہیں جیسے کہ سوات اور دیر میں ہوا۔ 1969ء میں سوات اور دیر کی ریاستوں کے قوانین کو پاکستانی قوانین سے بدل دیا گیا تھا۔ ان قوانین کے تحت مقدمات کی سماعت میں بڑی دیر لگتی تھی جیسا کہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اگر ایک فریق مقدمے کو طول دینا چاہے تو وہ عدالت کے کلرکوں سے مل کر آسانی سے تاریخ پہ تاریخ لیتا جاتا ہے۔

وہاں کے عوام نے دو دہائیوں تک عدل و انصاف کی فراہمی میں تاخیر سے تنگ آ کر ہمارے قانون کو مسترد کرتے ہوئے ریاست کے پہلے قوانین کی بحالی کا مطالبہ کر دیا۔ ان کے مطالبات مظاہروں میں تبدیل ہو گئے اور 1990ء میں پر تشدد راہ اختیار کر لی۔ وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے 1994ء میں ان کے مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے دونوں ریاستوں کے لئے شرعی قوانین پر مبنی عدالتوں کے قیام کی منظوری دے دی۔ یہ عمل سست روی سے چلتا رہا اور بالآخر مشرف نے اسے مکمل طور پر بند کر دیا اور اس تحریک کو عسکری قوت سے کچلنے کا فیصلہ کیا۔

صوفی محمد اور ان کے داماد فضل اللہ کی زیر قیادت اس تحریک کا دائرہ باجوڑ اور خیبر ایجنسیوں کے ملحقہ علاقوں تک پھیل گیا۔ فوج نے بھرپور کاروائی شروع کی جس سے باغی عناصر افغانستان میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے جہاں فضل اللہ نے اپنی سربراہی میں باغیوں پر

مشتمل اپنا ایک گروپ بنالیا جہاں سے وہ پاکستان کے اندر دہشت گردی کی کاروائیاں جاری رکھے ہوئے ہیں اور یہ بغاوت پھیلتی ہوئی مہمند، خیبر اور وزیرستان کے علاقوں تک پھیل گئی، یہاں تک کہ فاٹا کے علاقے میں بڑا فوجی آپریشن کرنا پڑا۔ اس لشکر کشی کے سبب اس وقت تقریباً ایک لاکھ قبائلی افغانستان میں ہیں جنہیں دشمن ہمارے خلاف استعمال کر رہا ہے اور یہی وہ دہشت گردی کا عذاب ہے جو ہمارا اپنا پیدا کردہ ہے۔

اس واقعے کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں فاٹا کے انضمام کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ایسا نہ ہو کہ وہاں بھی کچھ دنوں بعد ایسا ہی مسئلہ پیدا ہوجائے جس کی نشاندہی میں نے اپنے مضمون "عدل کا جبر" میں کی ہے۔

"عدل رحمت بھی ہے اور زحمت بھی، بروقت عدل کی فراہمی معاشرتی نظام کو متوازن رکھنے میں مدد دیتی ہے جبکہ انصاف کی فراہمی میں غفلت اور رکاوٹیں نظام کو تباہ کر دیتی ہیں جس سے انتظامی وسلامتی کے معاملات کو خطرات لاحق ہو جاتے ہیں اور آج کچھ ایسے ہی خطرات کا پاکستان کو سامنا ہے۔ سپریم کورٹ میں اس وقت اڑتیس ہزار سے زائد مقدمات زیرالتواء ہیں جبکہ نچلی عدالتوں میں زیرالتوا مقدمات کی تعداد لاکھوں میں ہے جو کئی سالوں سے زیرالتواء ہیں جس سے عوام کو انصاف کی فراہمی میں رکاوٹوں کا سامنا ہے اور انہیں اس صورت حال سے نکلنے کا کوئی حل بھی نظر نہیں آتا۔ اسی وجہ سے جہاں کئی خطرناک مسائل نے جنم لیا ہے وہاں سب سے اہم مسئلہ دہشت گردی کا ہے جس نے عوام کا امن وسکون چھین لیا ہے اور آئے دن قوم دہشت گردی کے عذاب کی ایک نئی اذیت سے گذرتی ہے۔

امریکیوں نے مشرف کو دھوکا دیتے ہوئے یہ اطلاع دی کہ 2005ء میں ان پر حملہ کرنے والوں کا ماسٹر مائنڈ بیت اللہ محسود وزیرستان میں ہے۔ جنرل مشرف نے جلتی پر تیل ڈالتے ہوئے 2005ء میں وزیرستان پر فوج کشی کی اور 2007ء میں جامعہ حفصہ کی احتجاجی بچیوں کو کمانڈو آپریشن کے ذریعے کچل دیا جس سے باغی عناصر دور دراز کے علاقوں میں پھیل گئے۔ یہ امر تحریک طالبان پاکستان کے قیام کا سبب بنا جنہوں نے افغانستان کے ساتھ ملحقہ

سرحدوں اور پاکستان کے اندر سے پاکستان کے خلاف دہشت گردی کی کاروائیوں کا آغاز کردیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

اسی دوران دہشت گردوں نے فاٹا کے علاقوں میں اپنی پناہ گاہیں قائم کرلیں جنہیں فوج نے دہشت گردوں سے پاک تو کردیا ہے لیکن دہشت گردی کا جن ابھی تک قابو میں نہیں آرہا ہے۔ حکومت کی انتظامی خامیاں عدل وانصاف کے جبر کی ایک اور شکل میں ابھری ہیں کیونکہ حکومت نے فوجی قوت کے نشے میں مختلف تنظیموں کو گفت وشنید سے قومی دھارے میں واپس لانے کی بجائے ان پر پابندیاں لگا کر انہیں کالعدم قرار دے دیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ملک کے طول وعرض میں پھیلی درجنوں کالعدم تنظیمیں ہماری سکیورٹی قوت کے لئے بھاری بوجھ بن گئی ہیں۔

حکومت پاکستان اور اعلیٰ عدلیہ کو شدت سے احساس ہے کہ عدل و انصاف کی جلد فراہمی کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے پرانے نظام میں اصلاحات لانے کی شدید ضرورت ہے۔ آئینی ماہرین کے لئے یہ کڑی آزمائش ہے کہ وہ پارلیمنٹ کو پالیسی مرتب کرنے کے لئے مدد فراہم کریں۔ حکومت وقت کے لئے لازم ہے کہ مستقبل میں منعقد ہونے والے انتخابات کو مدنظر رکھتے ہوئے انتہائی محتاط طریقے سے عدالتی اصلاحات کا عمل مکمل کرے تاکہ عدل وانصاف کی بروقت فراہمی کو یقینی بنایا جاسکے۔

عدل وانصاف کی فراہمی کے سلسلے میں عوام کو جو مشکلات درپیش ہیں ان کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ کمزور عوام کا دم گھٹ رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بقول شاہین صہبائی "غم وغصے سے بھری ہوئی قوم ہر وقت پھٹنے کو تیار ہے۔ عوام کا مزاج اب ناراضگی سے بڑھ کر باغیانہ ہوتا جارہا ہے۔" قصور کے شہر میں زینب کے واقعے پر عوام کا غم وغصہ ریاستی قانون کے سائے میں پھیلتی ہوئی کرپشن کے خلاف چار سال سے جاری عوامی احتجاج اور دہشت گردی کی وجہ سے ہماری سرزمین سے امن وامان کے اٹھتے ہوئے جنازے کسی بڑھتے ہوئے طوفان کی خبر دے رہے ہیں۔ اللہ ہم پر رحم کرے۔

فوجیوں کی زندگی سخت ہوتی ہے جسے آسان بنانے کے لئے طنز و مزاح کا شغل جاری رہتا ہے۔ مذاق ہلکے پھلکے بھی ہوتے ہیں اور تلخ بھی۔ ایس ایس جی میں ہماری معمول کی ٹریننگ میں ہر ہفتے 25 میل کا مارچ شامل تھا جو 40 پونڈ وزنی پٹھو (بگ پیک) کے ساتھ کرنا ہوتا۔ کہیں اچانک حملے (Raid) یا کسی گذرتے ہوئے قافلے کے خلاف گھات (Ambush) لگانے کی مشقیں بھی ہوتی تھیں جس میں ڈمی راؤنڈ استعمال ہوتے۔ ایک ایسی ہی ٹریننگ کے بعد ہم میس آئے اور پٹھو اور رائفل اتار کر اپنے کمرے میں داخل ہوئے تھے کہ باہر سے فائر کی آواز آئی۔ باہر دوڑے تو دیکھا کیپٹن راجہ شوکت محمود اپنا پیر پکڑے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے اپنا پٹھو اتارتے ہوئے رائفل کی بیرل اپنے بوٹ پر رکھی تھی کہ غلطی سے ٹریگر دب گیا اور بارود آر پار ہو گیا۔ کیپٹن ہمایوں ملک ساتھ کھڑے تھے کہتے ہیں:

"راجہ صاحب آپ نے اگر خودکشی کرنی تھی تو آپ کیوں سمجھے کہ آپ کا دماغ آپ کے ٹخنوں میں ہے؟"

راجہ صاحب نے غصے میں جو رائفل گھمائی تو کیپٹن ہمایوں اگر اپنے آپ کو نہ بچاتے تو سر پھٹ جاتا۔

ہمارے ایس ایس جی کے ساتھی کرنل سید احمد اسٹیشن کمانڈر کراچی پوسٹ ہوئے۔ انہی دنوں کرنل نعیم بھی وہاں تعینات تھے۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا' ہسپتال داخل ہوئے جہاں زیر علاج رہے۔ کرنل سید ان کی عیادت کو آئے' ان کی صحت یابی کی دعا کی اور فرمایا:

"نعیم' زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ دوستی کا حق ادا کردوں۔ میں نے اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے تمہارے نام ایک کارنر پلاٹ الاٹ کیا ہے' اس کی فائل ساتھ لایا ہوں' یہ لو۔"

نعیم حیران ہوئے کہ ان کے دیرینہ دوست نے ان پر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔ فائل کھول کر پڑھی' لکھا تھا:

"کارنر پلاٹ' ویسٹ اوپن' گورا قبرستان۔"

نعیم چلائے:

"ابے بدمعاش تم مجھے گورا قبرستان پہنچا رہے ہو۔"

گلاس اٹھا کے مارا' سید نے فوراً سر نیچے کر لیا اور بال بال بچے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد کرنل سید کینیڈا جا بسے' وہاں کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی' بیمار ہو گئے اور پاکستان آ گئے' علاج کروایا۔ دوسرے سال پھر علاج کروایا' تیسری بار آئے اور کافی دنوں تک علاج ہوتا رہا۔ ان دنوں میں کراچی میں تھا۔ سید' نعیم اور ایس ایس جی کے کچھ ساتھی' جو وہاں موجود تھے' انہیں فیملیز کے ساتھ میں نے بیٹی یمنی کے گھر دعوت دی۔ کھانے کے بعد ہم چائے پی رہے تھے تو میں کرنل سید کی بیگم سے مخاطب ہوا:

"صدیقہ بھابھی' آپ سے ایک ضروری بات کرنا چاہوں گا۔ سید کو پچاس سالوں سے جانتا ہوں' یہ بندہ تین بار یہاں آ کے اپنی اوورہالنگ (Overhauling) کرا چکا ہے۔ جس طرح ہمارے صوبہ سرحد کے ایک دوست جنہیں آپ بھی جانتے ہیں نے اپنی اوورہالنگ کرائی تھی' کان' آنکھ' دانت' گھٹنہ' دل اور جگر جب سب درست ہو گئے تو ایک پچیس سال کی خاتون سے شادی کر لی۔ کچھ بعید نہیں کہ سید نے بھی کینیڈا میں کوئی نوجوان میم دیکھ رکھی ہو۔ نگاہ رکھیے گا۔ سید شرما گئے' سب ہنستے رہے' ان کی بیگم کرنل سید کو گھورتی رہیں۔"

اور بھی بڑے دلچسپ واقعات ہیں لیکن حد ادب مانع ہے اور کبھی ضرورت پڑی تو بریگیڈئر ہمایوں ملک کی معاونت کی ضرورت ہوگی' اس لئے کہ ان کی بذلہ سنجی مشہور ہے۔

گرمی ہو یا سردی ہماری مشقیں دشوار گزار پہاڑوں میں ہوتیں اور خصوصاً نزدیکی کالا چٹا پہاڑی علاقے میں جہاں زہریلے سانپ ہوتے تھے۔ ہمارے کچھ لوگ ڈسے بھی گئے۔ کبھی بوٹ کے اندر یا ہیورسیک سے سانپ نکلتے۔ میرا معمول تھا کہ جب بھی رات گئے آرام کا وقت ملتا تو بوٹ سے زمین ہموار کر کے کمبل ڈال کے آیۃ الکرسی پڑھ کر حصار باندھ

دیتا تو کبھی سانپ میرے نزدیک نہ آیا اور میں آرام سے سویا۔

فوج کی یونٹوں میں ماحول ایک فیملی کا سا ہوتا ہے۔ کمانڈنگ آفیسر فیملی کا سربراہ ہوتا ہے اور یونٹ کے افراد کا اپنے بچوں کی طرح خیال رکھتا ہے۔ افسروں میں سے جو غیر شادی شدہ ہوتے ہیں' میس کا کھانا کھاتے ہوئے اکثر تنگ آ جاتے ہیں تو بلا تکلف شادی شدہ ساتھیوں کے گھروں پر دھاوا بول دیتے ہیں۔ اسلم بیگ بھی شادی شدہ ہوئے تو اکثر ایسی صورت حال کا سامنا ہوتا۔ کہتے ہیں ''ہم' چند آفیسر شادی شدہ تھے۔ ہماری کمپنی کے آفیسرز بلا تکلف ہمارے گھر میں داخل ہوتے اور فریج میں رکھی ہوئی کھانے کی جو چیز بھی ملتی' چٹ کر جاتے اور اکثر ایسا ہوتا کہ ہمیں اپنے لئے کھانا میس سے منگوانا پڑتا۔

ایک دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ان کی بیگم اپنی بچی کو تلاش کرنے کے لئے باہر کی طرف بھاگیں تو ان کے بیٹ مین نے انہیں تسلی دی کہ'' بی بی مت گھبرائیں' کیپٹن رؤف صاحب ابھی آئے تھے' بچی کو پیک میں ڈالا اور لے کر نیچے اتر گئے ہیں۔ ابھی آتے ہی ہوں گے۔'' تھوڑی دیر بعد کیپٹن رؤف ہنستے ہوئے وارد ہوئے۔ اسما بیگم ناراضگی کی بجائے بولیں ''رؤف بھائی' کل میں چائے کی دعوت پر جارہی ہوں' آپ کی خدمت کی ضرورت پڑے گی۔ بچی کو سنبھالنے گا۔'' رؤف ہنستے ہوئے بولے'' بھابھی میں حاضر ہوں۔''

سو میل دوڑ کا مقابلہ ہوا' چالیس پونڈ وزن اور رائفل کے ساتھ' بڑا سخت مقابلہ تھا۔ حوالدار غلام میراں نے 23 گھنٹوں میں سفر طے کر لیا۔ میں نے 29 گھنٹوں میں کیا اور آخری دس میل کیپٹن حنیف کو سہارا دے کر ریس مکمل کرائی۔ غیر مسلح جنگ (Unarmed Combat) ہماری تربیت کا اہم حصہ تھی۔ امریکن انسٹرکٹرز ٹریننگ دیتے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں کیپٹن سید اور کیپٹن نعیم اس فن میں ماہر سمجھے جاتے تھے اور جب کبھی کسی دورے پر آئے ہوئے کسی سینئر افسر کو مظاہرہ دکھانا ہوتا تو خصوصاً یہ دونوں اپنا کرتب دکھاتے' بالکل اسی طرح جیسے فری سٹائل ریسلنگ میں ہوتا ہے کہ نہ سر پھٹتا' نہ خون بہتا مگر غضب کا مقابلہ ہوتا ہے۔

اسی طرح ایک دن میں اور میرے ساتھی کیپٹن ناصر محمود ایک دوسرے پر داؤ پیچ آزما رہے تھے۔ ناصر نے داؤ لگایا لیکن میری کلائی نہ موڑ سکے۔ دوسری اور تیسری بار کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ امریکن میرین انسٹرکٹر کو بلایا جس کا قد ساڑھے چھ فٹ اور لاش کوئی تین من ہوگی' کہا کہ یہ داؤ تو اسلم بیگ پر کام نہیں کر رہا۔ امریکن آگے بڑھا' داؤ لگایا' میری کلائی پر لٹک گیا مگر موڑ نہ سکا۔ دوسری مرتبہ بھی ناکام رہا اور بڑبڑاتا ہوا چل دیا۔ تعجب ہے کہ کل بھی اور آج بھی امریکی میری کلائی نہیں موڑ سکے۔

امریکن اچھے دوست بھی ہوتے ہیں۔ کوئی دس بارہ امریکن اپنی فیملیز کے ساتھ چراٹ میں رہتے تھے۔ شام کو کلب میں رونق ہوتی تھی اور ویک اینڈ پر ہمیں وہاں جانے کی اجازت ہوتی تھی۔ ایک ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ ہفتے بھر کی سخت مشقت کے بعد ایسے ہنگاموں کی اپنی افادیت تھی۔ کیا زمانے تھے!!

باب سوئم

آٹھ سالوں میں دس پوسٹنگز

نہیں زندگی سلسلہ روزوشب کا
نہیں زندگی مستی و نیم خوابی

چراٹ میں ہوتے ہوئے میری سروس دس سال ہو چکی تھی اور سٹاف کالج کا امتحان دینے کا وقت آ گیا تھا' میری کمر کی چوٹ بھی تنگ کر رہی تھی جس کے سبب ایس ایس جی میں ہوتے ہوئے میں نے پیراجمپ بھی نہیں کیا۔ اسی لئے ایس ایس جی کا ونگ بھی نہیں لگایا۔ اس وقت سٹاف کالج امتحان کے لیے صرف ایک مضمون لکھنا ہوتا تھا۔ میں نے لکھا اور پہلی کوشش میں پاس ہو گیا اور 1962ء میں سٹاف کورس کیا۔ کورس پر جانے سے پہلے میں میجر کے رینک پر ترقی پا چکا تھا لیکن جب کورس پر گیا تو کپتان بنا دیا گیا جو میرے کورس والوں کا سینارٹی لیول تھا۔

بریگیڈیئر بلگرامی ہمارے کمانڈنٹ اور کرنل آغا محمد اکرم چیف انسٹرکٹر تھے۔ بڑی محنت کرنی پڑی۔ کرنل اکرم نے اپنے ایک لیکچر میں ایک دانشور کا یہ قول سنایا کہ آنے والی زندگی میں ہمیں اپنے کردار و عمل کو اس سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہوگی:

"God, grant me the serenity of judgment, to accept things, I cannot change. The courage to change things, I can. And the wisdom to understand the difference."

ترجمہ: اے اللہ مجھے قوت فیصلہ عطا کر تا کہ میں ان چیزوں کو قبول کر سکوں جنہیں میں تبدیل نہیں کر سکتا اور ہمت بخش کہ میں ان چیزوں کو درست کر سکوں جو میں کر سکتا ہوں اور اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کی بصیرت عطا فرما۔

جب میں چیف آف جنرل سٹاف (CGS) بنا تو اپنی میز پر یہ دعائیں لکھ کر رکھیں۔

ایک وہ جو میں نے اوپر بیان کی ہے اور دوسری علامہ اقبال کی یہ دعا:

تو غنی از ہر دو عالم من فقیر
روز محشر عذر ہائے من پذیر
گر تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہ مصطفیٰ پنہاں بگیر

اور جب آرمی چیف بنا تو یہی دعائیں میری میز کی زینت تھیں۔ پہلی دعا اللہ تعالیٰ نے قبول کر لی۔ اچھے ہنر مند آفیسرز میرے ساتھ تھے اور چین جیسا دوست ملک کہ جس کے تعاون سے ہم نے اپنی فوج کو دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق تیار کر کے ایک مضبوط مزاحمتی قوت (Deterrent Force) تیار کر لی جس سے ہمارے دشمن خوفزدہ ہیں۔ دوسری دعا کب قبول ہوگی؟ یہ تو وہاں جانے کے بعد ہی پتہ چلے گا۔

کورس ختم ہونے پر میں لاہور 114 بریگیڈ میں جی ایس او تھری (GSO-3) پوسٹ ہوا۔ میجر اکبر ہمارے بریگیڈ میجر تھے اور ابھی ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ مجھے بتایا گیا کہ کور ہیڈکوارٹر میں رپورٹ کرو' کور کمانڈر نے کسی کام سے بلایا ہے۔ میں حیرت میں تھا کہ ماجرا کیا ہے' کوئی غلطی ہوئی یا جی ایس او تھری کا عہدہ اتنا اہم ہے کہ کور کمانڈر بلا کر خوش آمدید کہتا ہے۔ اسی شش و پنج میں مبتلا کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل وسیع الدین کے سامنے پیش ہوا' دیکھتے ہی بولے:

''ہیلو بیگ ویلکم''

''تمہارے پانچ سال کی کمانڈ و ٹریننگ کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔''

''سنو یہاں گالف کورس پر گھاس کو پانی دینے کے لیے سپرینکلر سسٹم لگایا جا رہا ہے۔ پائپ لگاتے ہیں جو چوری ہو جاتا ہے۔ اب تک کوئی پکڑا نہیں گیا۔ مجھے یقین ہے کہ تم پکڑ لو گے۔ کوئی مدد چاہیے تو مل جائے گی۔''

''یس سر'' پوری کوشش کروں گا۔''

یہ کہہ کر باہر آیا' سوچتا رہا کہ یا اللہ مجھے چور پکڑنے کی تو ٹریننگ نہیں ملی' کیا کروں۔

ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ ڈاگ سنٹر سے دو کتے اور ہینڈلر (Handler) لئے۔ اسی دن گالف کورس میں تین کھائیاں (Trenches) کھدوائیں۔ ایک میں خود بیٹھا اور دوسری میں ڈاگ سنٹر کے بندوں کو بریفنگ دے کر خاموشی سے بٹھا دیا۔ انتظار کرتے کرتے رات کے دو بج گئے تھے کہ چند لوگوں کے سائے نظر آئے۔ پھر ٹھک ٹھک کی آواز آئی۔ اشارہ کیا' دونوں کتے دوڑ پڑے' دو بندوں کو دبوچ لیا' تین بھاگ گئے جو بعد میں پکڑ لئے گئے۔ دوسرے دن کور ہیڈکوارٹر میں رپورٹ کی۔ شاباش ملی اور ہماری کمانڈو ٹریننگ کا بھرم قائم رہا۔

ہماری رہائش سروسز کلب کے نزدیک ایک بیرک تھی جو دوسری جنگ عظیم کے دنوں کی یادگار تھی۔ انتہائی مخدوش۔ کہاں اٹک میں دو دریاؤں کے سنگم پر واقع خوبصورت ریسٹ ہاؤس' جہاں چاروں طرف دلفریب نظارے تھے اور کہاں یہ ٹوٹی پھوٹی بیرک جس کے چاروں طرف جنگلی گھاس پھونس' جن میں مچھروں کا ڈیرہ تھا۔ وہ ساری رات بھنبھناتے تھے' بجلی کا پنکھا اتنی سست رفتاری سے چلتا تھا کہ اس کی ہوا ان مچھروں کو بھگانے کے لیے قطعاً ناکافی تھی۔ اس بیرک کا ایک فائدہ تھا کہ یہ سروسز کلب کے قریب تھی جہاں سے ہم پیدل ہی کلب چلے جاتے۔ ساتھ ہی کنگھم روڈ کا بس سٹاپ تھا جہاں سے ایک ڈبل ڈیکر بس چلتی تھی جو مال روڈ سے گذرتی ہوئی کرشن نگر (اب اسلام پورہ) تک جاتی تھی اور ٹولنٹن مارکیٹ سے گزرتی تھی۔ وہاں سے انارکلی بازار قریب ہی تھا۔ ہم کنگھم روڈ کے بس سٹاپ سے بس پکڑتے اور چند منٹوں میں ٹولنٹن مارکیٹ پہنچ جاتے۔ اس وقت ٹریفک جام کے نام سے ہم ناآشنا تھے۔ لاہور میں قیام کے دوران اللہ تعالیٰ نے ہمیں بیٹی ثمینی عطا کی۔

ایک سال کچھ ماہ ہوئے تھے کہ میری پوسٹنگ مشرقی پاکستان کے شہر کومیلا میں 53 بریگیڈ میں بریگیڈ میجر کے طور پر ہوگئی۔ بریگیڈئر ابوبکر عثمان مٹھا میرے بریگیڈ کمانڈر تھے اور ایس ایس جی کے ساتھی میجر جعفر حسین میرے ڈی کیو (DQ) تھے۔

مشرقی پاکستان کا ذکر آئے تو 16 دسمبر 1971ء کا سانحہ کیونکر بھلایا جا سکتا ہے۔ یہ 16

دسمبر اچانک وارد نہیں ہو گیا تھا بلکہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی اس کے لئے ریشہ دوانیاں شروع ہوگئی تھیں۔ جب پاکستان وجود میں آیا تو مشرقی پاکستان کی آبادی 53 فیصد تھی یعنی وہ اکثریت میں تھے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ان کی اکثریت کو تسلیم کیا جاتا اور وفاق میں انہیں اسی تناسب سے نمائندگی دی جاتی لیکن ہوا اس کے برعکس۔ مغربی پاکستان کی بیوروکریسی ہمیشہ ان کی اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کی کوشش کرتی رہتی۔

1946ء کے انتخابات کے مطابق مشرقی بنگال نے 119 میں سے 113 نشستیں جیتی تھیں اور حسین شہید سہروردی وزیراعلیٰ بنے تھے۔ اے کے فضل الحق بھی جو شیر بنگال کہلاتے تھے بعد میں وزیراعلیٰ رہے۔ پاکستان کی قرارداد بھی انہوں نے ہی پیش کی تھی۔ اگر ان میں سے کسی کو وزیراعظم مقرر کر دیا جاتا تو مشرقی پاکستان کے لوگوں کو وفاق میں اپنی نمائندگی پر ناز ہوتا۔ ون یونٹ کی تشکیل میں بھی یہی روح کارفرما تھی کہ مشرقی پاکستان ایک صوبہ ہوگا اور چاروں صوبوں کو ملا کر مغربی پاکستان دوسرا صوبہ ہوگا اور دونوں کی نمائندگی برابر ہوگی۔

اس کے باوجود 65-1964 تک مشرقی پاکستان میں نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ لوگ ملنسار' سادہ اور دوستی نبھانے والے تھے۔ میرے ساتھ کیپٹن مستفیض الرحمن میرے جی ایس او تھری (GSO-3) تھے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد وہ خالدہ ضیاء کے وزیر خارجہ بنے۔ ان کے بعد کیپٹن ظہیرالدین جی ایس او تھری آئے وہ بھی بنگلہ دیش کے آرمی چیف بنے۔ ابھی تک ان دوستوں سے رابطہ ہے۔ 1990ء میں ہم بنگلہ دیش گئے تو کومیلا آفیسرز میس میں گیریژن فیملی ڈنر پر پرانے دوست اور ساتھی دور دور سے ملنے آئے اور گلے مل مل کر روئے۔ گذرے ہوئے لمحوں کو یاد کیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہم سے زیادہ احساس زیاں ان کو تھا۔ حالات کا جبر تھا کہ وہ ہم سے جدا ہو گئے۔

مشرقی پاکستان کے بارے میں شروع سے ہی جو دفاعی پالیسی اپنائی گئی وہ ناقص تھی کہ مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا۔ مغربی پاکستان کی صرف مشرقی سرحد بھارت سے ملتی تھی جبکہ مشرقی پاکستان تین اطراف سے بھارت میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے

باوجود پوری فوج مغربی پاکستان میں اور صرف ایک ڈویژن فوج مشرقی پاکستان میں متعین تھی۔ ہمارے بریگیڈ کی ذمہ داری کا علاقہ سلہٹ سے کاکسس بازار تک تھا' جس کی سرحدیں تقریباً 450 کلومیٹر تھیں۔ بریگیڈ کی نفری 4500 بھی نہ تھی۔ اس کے لئے ان سرحدوں کا دفاع بہت ہی مشکل ذمہ داری تھی۔ ان مشکل حالات کے باوجود وہاں کے دریاؤں کو مضبوط دفاعی پوزیشن بناتے ہوئے ایک حکمت عملی بنائی گئی جو 1965ء کی جنگ میں کامیاب ثابت ہوئی اور دشمن کو کسی جگہ بھی ہماری سرحدوں سے آگے بڑھنے کی جرات نہ ہوئی۔ اگر ایک کی بجائے وہاں چار ڈویژن فوج ہوتی تو ہم ایک کارگر جارحانہ اسٹریٹیجی (Offensive Strategy) بنا سکتے تھے۔

مجھے کومیلا آئے ہوئے چند ماہ ہوئے تھے کہ میری زندگی میں ایک نیا موڑ آیا کہ مجھے حج بیت اللہ پر جانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اپریل 1964ء میں ہم سات بھائیوں میں سے میرے نام قرعہ نکلا کہ ہمارے والدین جو اعظم گڑھ' انڈیا سے حج پر گئے ہوئے تھے' ان کی معاونت کے لئے مجھے بھی حج پر جانا تھا۔ میرے بریگیڈ نے ہر ممکن مدد کی اور چند دنوں کے اندر اندر پوری تیاری کر کے چالیس دنوں کے لیے سعودی عرب کے لیے روانہ ہوا' جدہ پہنچا' میرے والدین مکہ معظمہ میں مقیم تھے' ان سے جا ملا اور انہی کے ساتھ ٹھہرا۔ ہماری چھوٹی بہن یاسمین بھی ہمارے ساتھ تھی۔

ہم جس جگہ ٹھہرے وہ ایک کچی عمارت تھی۔ گنتی کے چند ایک ہوٹل تھے جو پختہ تھے۔ خانہ کعبہ کی مسجد اور اس کی روشنی 20 میل دور سے نظر آتی تھی۔ چند سڑکیں تھیں اور باقی تمام پرانی عمارتیں اور مسجدیں قدیم تھیں۔ حج میں کوئی بیس دن باقی تھے کہ ہم مدینہ منورہ گئے۔ جس گھر میں ٹھہرے وہ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کے نزدیک تھا۔ اسی طرح اور بھی بہت سی یادگار عمارتیں تھیں جو ہم نے مکہ اور مدینہ میں دیکھیں۔

پہلی حیرت انگیز بات جو میرے ساتھ ہوئی وہ یہ کہ میری کمر کی تکلیف جو شدید تھی اور جس کی وجہ سے میں کوئی وزن بھی نہیں اٹھا سکتا تھا' غائب ہو گئی۔ میں نے پورے قیام کے

دوران' اپنے والدین' بہن کا اور اپنا سامان متعد بار بس پر چڑھایا اور اتارا۔ میدان عرفات میں والدہ کو کچھ اونچائی تک لے گیا۔ کمر کی تکلیف کا احساس تک نہ ہوا۔ اور دوسرا معجزہ یہ ہوا کہ والدین کی دعاؤں نے میری عسکری زندگی کو ایک نیا رخ دے دیا۔ میں ترقی پر ترقی کرتا گیا' اس کے باوجود کہ مجھ سے ایسی غلطیاں اور گستاخیاں بھی سرزد ہوئیں کہ جن کی وجہ سے خطرہ تھا کہ میرا کورٹ مارشل بھی ہو چکا ہوتا۔ اور تیسری حیرت کی بات یہ کہ خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے کتنی بار اس کی دیواروں سے لگ کے دعائیں مانگیں کہ "اے رب عظیم' پاکستان کی خدمت میں مجھے شہادت عطا کر دے۔"

لیکن انتہائی پر خطر حالات سے گذرنے کے باوجود مجھے شہادت نصیب نہ ہوئی۔ شاید میرے والدین کی دعاؤں نے میری دعاؤں پر سبقت حاصل کر لی تھی۔ انہوں نے میری زندگی' ترقی اور کامیابی کی دعائیں مانگیں کہ میں گرتے پڑتے لڑکھڑاتے اس فوج کا سربراہ بن گیا جو دنیا کی بہترین فوج مانی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ملک کا اقتدار میری دسترس میں دے دیا لیکن میں نے جس کی امانت تھی اسے دے دی۔ یہی اللہ کا حکم تھا اور والد کی تاکید بھی کہ "حقدار کو اس کا حق دے دینا۔"

بحریہ کے سربراہ ایڈمرل سعید احمد خان' فضائیہ کے سربراہ ائر چیف مارشل حکیم اللہ' آئی ایس آئی کے ڈائریکٹر جنرل لیفٹیننٹ جنرل حمید گل اور جج ایڈووکیٹ جنرل (JAG) بریگیڈیئر محمد عزیز خان کے ساتھ مختصر مشاورت کی اور سینیٹ کے چیئرمین غلام اسحٰق خان کو بلا کر اقتدار ان کے سپرد کر دیا۔ انتخابات ہوئے' بے نظیر بھٹو برسر اقتدار آئیں تو ان خدمات کے اعتراف میں انہوں نے فوج کو تمغہ جمہوریت عطا کیا۔

1965ء کی جنگ مشرقی پاکستان میں سرحدوں کے آر پار چھوٹے اور بڑے ہتھیاروں کی شدت سے فائرنگ تک محدود رہی۔ 6 ستمبر 1965 کو میں جیسے ہی آفس میں پہنچا' ڈھاکہ سے جنرل فضل مقیم کا ٹیلیفون آیا:

"بریگیڈیر مٹھا کہاں ہیں؟

''وہ ہسپتال چیک اپ کے لیے گئے ہیں'' میں نے جواب دیا۔

''معلوم ہے جنگ شروع ہوگئی ہے؟''

''سر ہم تیار ہیں۔''

''گٹ موبلائزڈ (Get Mobilized)'' کہا اور ٹیلیفون بند کر دیا۔

میں نے فوراً تمام یونٹوں کو بنائی ہوئی حکمت عملی کے تحت حکم صادر کر دیا۔ سورج غروب ہونے تک پورا بریگیڈ سلہٹ سے لے کر کاکسس بازار تک پوزیشنیں سنبھال چکا تھا۔ رات گیارہ بجے گھر پہنچا تو اندھیرے میں گھر کی چوکھٹ پر بیگم کو بیٹھے دیکھا' پوچھا:

''بچے کہاں ہیں؟''

جواب ملا:

''ان کو تو مسز سراج ڈھاکہ لے گئی ہیں۔ سب فیملیز جا چکی ہیں صرف بریگیڈ کمانڈر کی فیملی یہاں ہے۔''

(مسز سراج کیپٹن سراج الدین احمد حامد کی بیگم تھیں۔ بنگالی تھیں اور ہماری دوست تھیں)۔ ہمارا ہیڈ کوارٹر سرحدوں سے صرف 12 کلومیٹر دور تھا اور دشمن کی توپیں اسے آسانی سے نشانہ بنا سکتی تھیں۔ اسی خوف کے سبب مسز سراج نے پہل کی اور حفاظت کی خاطر سب بچوں کو لے کر ڈھاکہ چلی گئیں۔

میں نے کہا: ''اگر کمانڈر کی فیملی یہاں ہے تو ہم بھی یہیں رہیں گے۔''

صبح گاڑی بھیجی اور بچوں کو منگوالیا۔ الحمدللہ ہم سب خیریت سے رہے۔

1965ء میں ہماری تنخواہوں میں تقریباً اسی فیصد اضافہ ہوا' بقایا جات (Arrears) کی مد میں کافی پیسے ملے۔ ایک ساتھ بارہ (12) افسروں نے فوکس ویگن گاڑیاں بک کرائیں۔ اس وقت ایک کار کی قیمت تیرہ ہزار روپے تھی اور کومیلا کینٹ میں جہاں صرف دو کاریں ہوا کرتی تھیں (ایک بریگیڈ کمانڈر کی اور دوسری سی او سی ایم ایچ کی تھی) وہاں چودہ گاڑیاں ہوگئیں۔

جنگ کے بعد ہمارے بنگالی بھائیوں کے دلوں میں ایک تشویش پیدا ہوئی کہ ''مشرقی پاکستان جو کہ تینوں سمتوں سے دشمن نے گھیرا ہوا ہے' اس کے دفاع کے لئے صرف ایک ڈویژن فوج' ایک پی اے ایف سکواڈرن اور نیوی کے چند جہاز ہیں اور باقی تمام افواج مغربی پاکستان کے دفاع کے لئے ہیں جو کسی صورت ملکی سلامتی کے لیے درست حکمت عملی نہیں ہے۔'' یقیناً یہ ایک واضح کمزوری تھی جس کا فائدہ بھارت نے 1971ء میں اٹھایا اور یہ قدم اٹھانے سے پہلے بھارت' پاکستان کو سیاسی اور نظریاتی اعتبار سے کمزور کر چکا تھا۔ اور بھی بہت سے حربے تھے جو ہمارے خلاف استعمال ہوئے جو ہائی برڈ وار (Hybrid war) کے طریقے ہیں اور بھارت نے 1971ء میں مشرقی پاکستان فتح کر لیا۔

جنگ کے بعد ڈیڑھ سال بڑا اچھا گذرا۔ مارچ 1967ء کو 30 بلوچ حیدرآباد پوسٹنگ ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ سال میں یونٹ کا سیکنڈ ان کمانڈ (2IC) رہا۔ اس دوران میں والدین کو اپنے ساتھ لے آیا لیکن جلد ہی انہیں واپس جانا پڑا کیونکہ یونٹ کو بارڈر کے نزدیک چھور (Chhor) جانے کا حکم ملا' جہاں گرمیوں میں درجہ حرارت پینتالیس تا پچاس ڈگری سے کم ہی نیچے آتا ہے۔ ایک سال کا عرصہ ہم نے خیموں میں گذارا۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ نے ہمیں بیٹے وجاہت مصطفیٰ سے نوازا' جسے ہمارے والد'' مکہ والے'' کہتے تھے' اس لئے کہ 1964ء میں حج کے دوران انہوں نے دعا کی تھی اور بیٹے کی بشارت دی تھی۔

انفنٹری بٹالین کی کمانڈ ہمارے عسکری کیرئر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ انیس بیس سالوں کی جہد مسلسل کے بعد ایک بٹالین کی کمانڈ سب سے اہم تصور کی جاتی ہے۔ اس لئے کہ اسی کمانڈ کے تحت آفیسر اپنے جوانوں اور آفیسرز سے براہ راست رابطے میں رہتا ہے اور جنگ کے حالات میں دشمن کے مدمقابل ہوتا ہے۔

میرے لئے بڑی خوشی کا دن تھا جب 1969ء میں میری لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی ہوئی اور مجھے 36 بلوچ کی کمانڈ ملی جو اس وقت کوئٹہ میں تعینات تھی۔ مجھے اس بات کا دکھ تھا کہ Parent یونٹ' 16 بلوچ کی کمانڈ نہ مل سکی۔ پی ایم اے سے پاسنگ آؤٹ کے بعد

جس یونٹ میں آفیسر کی پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے وہ پیرنٹ یونٹ کہلاتی ہے۔ ہماری ابتدائی تربیت بھی وہیں ہوتی ہے اور شروع سے ہم جن جوانوں' این سی اوز (NCOs) ' جے سی اوز (JCOs) اور افسروں کے ساتھ رہتے ہیں ان سے خاص تعلق قائم ہوجاتا ہے۔ ہر افسر کی خواہش ہوتی ہے کہ لیفٹیننٹ کرنل بننے پر اسے اپنی پیرنٹ یونٹ کی کمان ملے۔

نئی یونٹ کی کمان ملے تو سارے لوگ نئے ہوتے ہیں اور ان سے نئے سرے سے تعلقات استوار کرنے ہوتے ہیں۔ 36 بلوچ ایک نئی یونٹ تھی' میں نے سخت محنت کی۔ جوانوں کی تربیت میں خاص دلچسپی لی' فائرنگ پر بہت زیادہ توجہ دی' کھیلوں میں شرکت کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہماری یونٹ کئی پیشہ ورانہ مقابلوں میں 41 ڈویژن میں اول آئی۔ اسی طرح فٹ بال' کبڈی اور باسکٹ بال کے مقابلوں میں بھی بہتر پوزیشن حاصل کی اور سال کے آخر میں ہماری یونٹ کو 41 ڈویژن کی چیمپئن یونٹ قرار دیا گیا۔ یونٹ کے سبھی افسر اور جوان خوش تھے کہ "باہر" سے آنے والے کمانڈنگ آفیسر نے یونٹ کو اپنی یونٹ سمجھا اور پوری اپنائیت سے تربیتی امور اور کھیلوں میں اتنی محنت کرائی کہ یونٹ چیمپئن قرار پائی۔ مجھے اس یونٹ کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ افسروں کی طرف سے مبارکباد کے خطوط بھی موصول ہوئے۔

تقریباً ڈیڑھ سال 36 بلوچ رجمنٹ کی کمانڈ کی تھی کہ مجھے 9 ڈویژن میں جی ایس او ون (GSO-1) پوسٹ کر دیا گیا۔ پوری یونٹ افسردہ تھی لیکن حکم حاکم سے سرتابی کی مجال کہاں۔ یونٹ والوں نے میرے اعزاز میں زبردست الوداعی تقریب منعقد کی اور حسب معمول افسروں نے آفیسرز میس میں ڈائیننگ آؤٹ کا کھانا رکھا اور مجھے یادگاری شیلڈ پیش کی جو ابھی بھی مجھے ان سنہرے دنوں کی یاد دلاتی ہے۔ 9 ڈویژن اس وقت کھاریاں میں تھا۔ یہاں بھی کوئی ایک سال گذرا ہوگا کہ 9 ڈویژن کو مشرقی پاکستان جانے کا حکم ملا۔

تیاری کے لئے صرف چند دن ملے۔ ہماری فیملیز وہیں کھاریاں میں رہیں' آرمر ڈ رجمنٹ' توپ خانہ' بھاری سامان اور گاڑیوں کو چھوڑ کر ڈویژن کی پوری نفری صرف رائفل

اور ہلکی مشین گنوں (LMG) کے ساتھ سادہ لباس میں کراچی پہنچی اور وہاں سے پی آئی اے کے ذریعہ ڈھاکہ روانگی شروع ہوئی۔ ہمارا سفر 26 مارچ کو شروع ہوا اور 15 اپریل تک کومیلا پہنچ کر ہم نے اپنے اپنے علاقوں کی ذمہ داری سنبھال لی۔

1964ء میں جب میں 53 بریگیڈ میں بریگیڈ میجر پوسٹ ہوا تو مشرقی پاکستان میں بھائی چارے کی فضا موجود تھی لیکن 1971ء تک یہ صورت حال یکسر تبدیل ہو چکی تھی۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی شعلہ بار خطابت اور مولانا عبدالحمید بھاشانی کے "جالن جالن' آگن جالن" کے نعروں نے مشرقی پاکستان میں آگ لگا دی تھی۔ 2 دسمبر 1971ء کو ہونے والے انتخابات میں شیخ مجیب الرحمٰن کی پارٹی عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان کے لیے مختص 153 میں سے 151 نشستیں حاصل کی تھیں۔ باقی دو نشستیں پاکستان مسلم لیگ کے نورالامین اور چناگانگ کے پہاڑی علاقوں میں چکمہ قبیلے کے سربراہ راجہ تری دیو رائے نے حاصل کی تھیں۔ نورالامین مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد باقی ماندہ پاکستان کے نائب صدر رہے۔ 1974ء میں ان کا انتقال ہوا۔ سرکاری اعزاز کے ساتھ انہیں قائداعظم محمد علی جناح کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ جبکہ راجہ تری دیو رائے وفاقی وزیر رہے اور جنوبی امریکہ کے کئی ممالک میں پاکستان کے سفیر رہے۔ لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے۔ دو کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ ایک کتاب ان کے اپنے قبیلے کی تاریخ اور ثقافت سے متعلق ہے اور دوسری مختصر افسانوں کا مجموعہ۔ 2012ء میں ان کا انتقال ہوا۔

ان دو افراد نے پاکستان کی سالمیت کے لئے جو خدمات انجام دیں' ان کے اعتراف میں انہیں جو عزت دی گئی وہ قابل تحسین ہے لیکن انتہائی بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ لاکھوں بہاری جنہوں نے 1971ء میں مکتی باہنی کے خلاف پاک فوج کی مدد کی تھی ابھی تک ڈھاکہ کے مضافات میں انتہائی کسمپرسی کی حالت میں زندگی گذار رہے ہیں۔ 2008ء میں بنگلہ دیش ہائی کورٹ نے انہیں بنگلہ دیش کی شہریت کے حقوق دیے تھے لیکن اکثریت نے کہا کہ وہ پاکستان جانا چاہیں گے۔ ادھر پاکستان کی حکومتوں کی طرف سے انتہائی سرد مہری کا مظاہرہ کیا

گیا۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں اسلامی ممالک کی تنظیم' او آئی سی کے تعاون سے محصورین کی واپسی کے لئے ایک فنڈ بھی قائم کیا گیا تھا۔ میاں چنوں میں ان کے لئے ایک بستی بھی قائم کی گئی تھی اور ڈیڑھ پونے دو لاکھ بہاری پاکستان آئے بھی تھے لیکن ابھی تک تین لاکھ کے قریب بہاری وہیں پھنسے ہوئے ہیں۔

مسلمان ہونے کے ناطے اقوام متحدہ کی طرف سے بے نیازی تو سمجھ میں آتی ہے لیکن دولت مند اسلامی ممالک کی طرف سے بھی سنگدلانہ بے حسی کا مظاہرہ افسوسناک ہے۔ اس طرح جماعت اسلامی اور اسلامی چھاترو شنگھو کا واحد قصور یہ تھا کہ انہوں نے پاک فوج کی مدد کی تھی۔ پروفیسر غلام اعظم اور مطیع الرحمٰن نظامی جیسے نیک اور صالح لوگوں پر زنا' اغواء اور قتل کے جھوٹے مقدمات قائم کر کے انہیں پھانسی کی سزائیں سنائی گئیں اور پاکستان کی طرف سے سرکاری سطح پر ان اقدامات کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی گئی۔ ابھی تک پھانسیوں کا سلسلہ جاری ہے۔

1970ء کے انتخابات میں مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی نے 88 نشستیں حاصل کی تھیں جو کل نشستوں کا 28 فیصد بنتی تھیں لیکن ذوالفقار علی بھٹو کسی طرح بھی اپوزیشن بنچوں پر بیٹھنے کو تیار نہ تھے۔ 13 فروری 1971ء کو صدر یحییٰ خان نے قومی اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ کو ڈھاکہ میں طلب کرنے کا اعلان کیا۔ وہ مغربی پاکستان واپس آئے' لاڑکانہ گئے اور واپسی پر چند شرائط عائد کر دیں کہ جس کے بعد اسمبلی کا اجلاس بلایا جانا ممکن تھا۔ اس فیصلے سے مشرقی پاکستان میں عوام مشتعل ہو گئے۔ امیر جماعت اسلامی سید ابوالاعلیٰ مودودی نے اس فیصلے کے اعلان کی مذمت کرتے ہوئے کہا:

> ''اکثریتی پارٹی کو نئے آئین کا مسودہ پیش کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ دوسروں کو اس پر اعتراض ہو تو دلائل کے ساتھ اپنی تجاویز پیش کریں۔ انہوں نے تنبیہ کی کہ صورت حال اتنی نازک ہے کہ غلط سمت میں اٹھایا جانے والا ایک قدم بھی پاکستان کے ٹوٹنے کا سبب بن سکتا ہے۔''

مغربی پاکستان کے رہنماؤں کی اکثریت ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کی حامی تھی۔ 18 فروری کو نیشنل عوامی پارٹی کے سربراہ خان عبدالولی خان نے کہا:

> ''قومی معاملات پر بحث کی صحیح جگہ قومی اسمبلی ہی ہے۔''

جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مفتی محمود نے ڈھاکہ میں شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کے بعد بیان دیا:

> ''عوامی لیگ اپنی شرائط مغربی پاکستان پر مسلط نہیں کرنا چاہتی اور شیخ مجیب کا رویہ لچکدار ہے۔''

لیکن 28 فروری کو بھٹو نے دھمکی دی:

> ''مغربی پاکستان سے قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے والوں کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی۔''

بعد میں ایک بیان میں انہوں نے کہا:

> ''اگر اقتدار منتقل ہی کرنا ہے تو مشرقی پاکستان میں اکثریتی پارٹی کو اقتدار دے دیا جائے اور مغربی پاکستان میں یہاں کی اکثریتی پارٹی کو دیا جائے۔''

لاہور کے روزنامہ آزاد نے اس خبر کو ''ادھر تم' ادھر ہم'' کی شہ سرخی کے ساتھ شائع کیا تھا۔ بھٹو کے دباؤ پر صدر یحییٰ خان نے 3 مارچ کو بلایا گیا قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ اس پر شیخ مجیب الرحمٰن بپھر گئے۔ انہوں نے ہڑتال کی کال دی اور عدم تعاون کی تحریک چلانے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سول انتظامیہ مفلوج ہو کر رہ گئی۔ تمام احکامات عوامی لیگ کے سیکریٹریٹ سے جاری ہونے شروع ہوئے۔ سول انتظامیہ یہ احکامات ماننے پر مجبور تھی۔

پاکستان اکثریتی اور اقلیتی صوبوں کے مابین سیاسی توازن بحال رکھنے میں ناکام ہو گیا تھا جس سے قومی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہو گئے۔ مشرقی پاکستان' دیگر چاروں صوبوں کے مقابلے میں 53 فیصد آبادی کے ساتھ اکثریتی صوبہ تھا جو آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کی مضبوط بنیاد بنا تھا۔ وہاں کے مقبول لیڈر فضل الحق پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے بھی

بنگال سے انتخابات جیتتے رہے تھے۔ منطقی طور پر قائداعظم کے بعد انہی کو ہی قوم کا قائد ہونا چاہیے تھا لیکن اس کے برعکس پاکستان کے دونوں بازوؤں کے مابین تفریق ڈالنے کی کوششیں کی گئیں۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی زیر قیادت 1965ء کی جنگ میں اس نظریے کی نفی ہو گئی تھی کہ ''مشرقی پاکستان کے دفاع کا راز' مغربی پاکستان کے دفاع میں پوشیدہ ہے۔'' کسی قسم کے تصادم کی کیفیت میں منطقی طور پر پورے مشرقی پاکستان کا دفاع صرف ایک ڈویژن فوج' قلیل سی نیوی اور فضائی امداد سے ممکن نہیں تھا۔ محترمہ فاطمہ جناح کو 1964ء کے انتخابات میں مشرقی پاکستان میں بھرپور مقبولیت حاصل تھی لیکن دھاندلی کے ذریعے انہیں ہرادیا گیا جس سے مشرقی پاکستان کے عوام میں بددلی پھیلی۔

بالآخر 3 مارچ کے سیشن کو ملتوی کرنے کا حتمی فیصلہ کر لیا گیا جس کا اعلان یکم مارچ کو ہونا تھا۔ اس اعلان سے پہلے شیخ مجیب الرحمٰن کو حراست میں لینے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ اعلان کے متوقع شدید ردعمل کو سنبھالا جا سکے۔ اس کام کے لیے کمانڈو بٹالین کے کرنل ظہیر عالم خان کو چیف آف آرمی سٹاف جنرل عبدالحمید خان نے خود ہدایت دی۔ وہ ڈھاکہ میں موجود تھے۔ اس کارروائی کا تذکرہ کرنل ظہیر عالم خان نے اپنی کتاب "The Way It Was" میں بیان کیا ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کے گھر اور ملحقہ راستوں کا سروے کیا۔ گھر کے گرد حفاظتی نظام اور رکاوٹوں کا جائزہ لیا۔ اپنے ساتھ میجر ہمایوں اور ایکشن گروپ کو لیا۔ چاروں اطراف حفاظتی دستے لگائے۔ رکاوٹوں کو ہٹاتے ہوئے یہ دستے آگے بڑھے' کوئی بھی مزاحمت نہ ہوئی۔ گھر کے اندر داخل ہوئے' وہاں شیخ مجیب نہ تھے۔ دوسری منزل پہ فیملی کے ساتھ تھے۔ آواز دی تو دروازہ کھلا اور شیخ مجیب باہر آئے۔

کرنل ظہیر عالم نے کہا: ''آیئے' ہمارے ساتھ چلئے''

''ٹھیک ہے' کیا میں اپنی فیملی کو خدا حافظ کہہ سکتا ہوں۔''

''جی ہاں' آپ خدا حافظ کہہ لیں۔''

وہ اندر گئے اور چند منٹ بعد باہر آ گئے' جنہیں ساتھ لے کر باہر گاڑیوں تک گئے۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے شیخ مجیب نے کہا:

''میں اپنا سگار پائپ بھول آیا ہوں' کیا لے سکتا ہوں؟''

''ضرور لے لیجئے''

وہ اندر گئے' سگار پائپ لے آئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ وہ مطمئن اور پرسکون تھے۔

ہمارے دو عسکری قائدین نے ڈھاکہ میں بلائے جانے والے پارلیمانی اجلاس کو منسوخ کرنے کی مخالفت کی۔ ایڈمرل احسن نے 2 مارچ کو استعفیٰ دے دیا جبکہ جنرل یعقوب علی خان 3 مارچ کو مستعفی ہوئے۔ پورے مشرقی پاکستان میں سیاسی مظاہرے شروع ہوئے' حتیٰ کہ تمام فوجی چھاؤنیوں میں ایسٹ بنگال کی یونٹیں بھی احتجاج میں شامل ہو گئیں۔ جنرل ٹکا خان نے ایسٹرن کمان کی قیادت سنبھالی اور حالات کو کسی حد تک سنبھالا دینے میں کامیاب ہوئے لیکن چٹا گانگ گیریژن کے حالات کنٹرول سے باہر تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب جی ایچ کیو نے 9 ڈویژن کو کھاریاں سے کومیلا بھیجنے اور سلہٹ سے کاکسس بازار تک کے علاقے کی ذمہ داری دینے کا فیصلہ کیا۔ 9 ڈویژن کو ایک ایک کمپنی کر کے بھیجا جا رہا تھا جبکہ ادھر چٹا گانگ میں صورت حال انتہائی ابتر تھی:

''چٹا گانگ میں 8 ایسٹ بنگال رجمنٹ کے سیکنڈ ان کمانڈ میجر ضیاء الرحمٰن نے بغاوت کا اعلان کر دیا اور سب سے پہلے اپنے کمانڈنگ آفیسر کرنل رشید جنجوعہ کو ان کے دفتر میں قتل کر دیا۔ دو اور آفیسروں کو بھی قتل کیا جن کا تعلق مغربی پاکستان سے تھا۔ 8 ایسٹ بنگال رجمنٹ کی کمان سنبھالنے کے بعد میجر ضیاء نے ایسٹ بنگال کی تمام رجمنٹوں' رجمنل سنٹر اور ایسٹ پاکستان رائفلز کا کنٹرول سنبھال لیا اور چٹا گانگ کے اردگرد وسیع علاقے کو کنٹرول میں لے کر چٹا گانگ تا کومیلا روڈ پر قبضہ کر لیا۔ انہوں نے ریڈیو پاکستان چٹا گانگ کو بھی اپنے قبضے میں لے لیا

اورخودکو بنگلہ دیش کا کمانڈر انچیف قرار دیا۔ انہوں نے چٹاگانگ ائرپورٹ کو بھی قبضے میں لیا اور باغیوں کو "آزادی کی جدوجہد میں شامل ہونے کی دعوت دی۔"

ڈھاکہ ہائی کمانڈ سے اس بغاوت کو کچلنے کا حکم ملا۔ کومیلا سے 53 بریگیڈ کو چٹاگانگ کی طرف روانہ کیا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ شاید وہ آئی ایس ڈیوٹی (Internal Security Duty) پر جا رہے تھے لیکن اس کی سب سے پہلے جانے والی یونٹ 34 ایف ایف رجمنٹ کو' جو لیفٹیننٹ کرنل شاہ پور خان کی کمان میں روانہ ہوئی تھی' راستے میں باغیوں نے ایمبوش (Ambush) کیا اور کرنل شاہ پور سمیت متعدد جوان شہید ہوئے۔ چٹاگانگ کی جانب سے لیفٹیننٹ کرنل سلیمان خان کی زیر کمان کمانڈو بٹالین آگے بڑھتی رہی لیکن باغیوں نے انہیں بھی ایمبوش کیا اور کرنل سلیمان سمیت انیس فوجی قتل ہوئے جبکہ بیس جوان زخمی ہوئے۔ ان دوفورسز کے خلاف یہ کاروائیاں میجر ضیاء الرحمٰن نے چٹاگانگ پر اپنا تسلط قائم رکھتے ہوئے کیں۔ 30 مارچ کو ہم کومیلا پہنچے تو ہمیں کرنل سلیمان اور شاہ پور اور متعدد جوانوں کی شہادت کی خبر ملی۔

یوں جنگ کے گہرے بادلوں میں گھرے 9 ڈویژن نے مشرقی پاکستان آنا شروع کیا۔ ڈویژن کی ایڈوانس پارٹی میرے ماتحت ڈھاکہ گئی۔ میرے ساتھ کرنل نعیم بھی تھے۔ میں کومیلا میں 5 سال رہ چکا تھا اور اب وہ ہمارے ڈویژن کی ذمہ داری کا علاقہ تھا' سلہٹ سے لے کر کاکسس بازار تک تقریباً 450 کلومیٹر لمبی سرحد تھی۔ اس وقت صرف کومیلا گیریژن اور ائرپورٹ ہمارے کنٹرول میں تھے جسے 20 بلوچ کی ایک کمپنی اور ایک کمانڈو پلاٹون نے سنبھالا ہوا تھا کیونکہ 53 بریگیڈ کو چٹاگانگ کو کنٹرول میں لانے کے لئے روانہ کر دیا گیا تھا۔ ڈھاکہ سے ہی دن تھرٹی کے ذریعے 9 ڈویژن کی ایک ایک کمپنی کومیلا پہنچتی رہی۔

جیسے ہی دو کمپنیاں اکٹھی ہوتی گئیں' انہیں ٹاسک دے کے سب سے پہلے ملحقہ علاقوں کو زیر کنٹرول لایا گیا۔ ان کمپنیوں کو میں خود بریف کرتا اور ٹاسک دیتا تھا' اس لئے کہ میں پورے علاقے سے بخوبی واقف تھا۔ کومیلا ہیڈکوارٹر کی صرف عمارتیں تھیں جو خالی تھیں' نقشے

تھے نہ کوئی ڈاکومنٹس (Documents) اور نہ ہی کوئی بریف کرنے والا تھا۔ معمولی لاجسٹک سپورٹ (Logistic Support) تھی۔ ایمونیشن (Ammunition) کی کمی تھی لیکن اللہ کا کرم تھا کہ ہماری یونٹوں کو جو ٹاسک بھی ملا انہوں نے بخیر و خوبی انجام دیا۔ بڑا مشکل وقت تھا لیکن ہمارے آفیسرز اور جوانوں نے بڑی ہمت اور حوصلے سے اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔

12 اپریل تک 12 ایف ایف رجمنٹ کرنل خوشدل خان آفریدی کی کمان میں کومیلا پہنچ چکی تھی۔ دو دنوں کی تیاری کے بعد انہیں دو ٹاسک (Task) ملے۔ پہلا' برہمن باڑیہ جو کومیلا سے تقریباً 20 کلومیٹر شمال میں تھا اور دوسرا لکشم جو 12 کلومیٹر جنوب میں تھا' وہ مکتی باہنی نے کنٹرول کرلیا تھا۔ ان کے ساتھ بھارت کے بی ایس ایف (Border Security Force - BSF) اور آرمی کے جوان بھی شامل تھے۔ ہماری یونٹوں کے پاس صرف رائفل اور لائٹ مشین گنیں تھیں' کوئی بھاری ہتھیار نہ تھا۔ 9 ڈویژن کے پاس صرف ایک فیلڈ رجمنٹ آرٹلری تھی جس کی کمان کرنل محمد طارق کر رہے تھے۔ ان کے پاس صرف آٹھ گنیں تھیں۔ انہوں نے 4 گنیں کرنل آفریدی کے ساتھ کیں جو برہمن باڑیہ کے لئے روانہ ہوئے اور خود 4 گنوں کے ساتھ میجر یوسف کے ساتھ ہو لئے جو لکشم آپریشن کے لئے صبح روانہ ہوئے تھے۔

دوپہر تک دونوں فورسز نے کافی علاقہ کلیئر (Clear) کرالیا تھا لیکن لکشم کے سامنے مزاحمت (Opposition) زیادہ تھی۔ تقریباً دن کے ایک بجے لکشم فورس کا ایس او ایس (SOS) ملا کہ دشمن کی مزید کمک آگئی ہے جو فلینکنگ موو (Flanking Move) کر کے ان کی فورس کو گھیرے میں لے رہی ہے' انہیں کمک کی فوری ضرورت ہے۔ ہمارے پاس صرف 39 بلوچ رجمنٹ تھی جو کرنل نعیم کی کمان میں کومیلا گیریژن کی حفاظت پر مامور تھی۔ جی او سی (GOC) نے آرڈر دیا کہ 39 بلوچ رجمنٹ کی دو کمپنیاں فوراً تیار ہو جائیں اور لکشم کی طرف روانہ ہوں۔ میجر تیمور علی کی کمان میں دو کمپنیاں تیار ہو گئیں لیکن 12 ایف ایف اور

39 بلوچ کی چار کمپنیوں کی کمان کے لئے کسی کرنل کی ضرورت تھی۔

میں نے والنٹر (Volunteer) کیا اور دو کمپنیوں کے ساتھ ڈبل مارچ کرتے ہوئے ہم لکشم کے نزدیک پہنچے' حصار توڑا اور "یوسف فورس" سے جا ملے۔ اس وقت تقریباً دن کے تین بج گئے تھے اور دن کے صرف تین گھنٹے باقی تھے جس میں آپریشن مکمل کرنا تھا ورنہ رات میں آبادی والے علاقے (Built-up Area) میں جنگ مشکل ہوتی ہے جس کے لئے ہماری نفری ناکافی تھی۔ فوراً او گروپ (O. Group) بلایا اور سادہ سا پلان بنایا اور حکم دیا:

"دشمن کے سامنے کنٹیکٹ ایریا (Contact Area) میں فائر بیس (Fire Base) بنایا جائے۔

۔12 ایف ایف اور 39 بلوچ کی ایک ایک ٹاسک فورس کو آؤٹ فلینکنگ موو (Out Flanking Move) پر روانہ کر دیا۔

۔یہ تاکید کر دی کہ دشمن کے بھاگنے کا راستہ کھلا رکھنا ہوگا۔"

ایک گھنٹے کے اندر اندر تین سمتوں سے ہماری فورس نے لکشم کا گھیراؤ کر لیا تھا اور دشمن کو اپنی ایل او سی (LOC) کٹ جانے کا خطرہ تھا۔ اس نے بھاگنا شروع کیا اور ہمارے جوانوں نے ان پر بھرپور ٹارگٹ شوٹنگ (Target Shooting) کی۔ رات دس بجے تک پورے لکشم ٹاؤن پر ہمارا کنٹرول تھا۔

رات ایک بجے کے قریب مجھے حکم ملا کہ میں 39 بلوچ کی دونوں کمپنیوں کو لے کر واپس آ جاؤں اور 12 ایف ایف کی دو کمپنیاں لکشم کا دفاع کریں۔ میں واپس چل پڑا' راستے میں کرنل طارق کی گن پوزیشن پر پہنچا تھا کہ ایک جانب سے دشمن کی مشین گن کا فائر آ گیا۔ تقریباً چھ سات سو گز کے فاصلے سے درختوں کے جھنڈ سے فائر آ رہا تھا۔ کرنل طارق نے گنوں کو گراؤنڈ ایکشن (Ground Action) کا حکم دیا اور ڈائریکٹ فائر (Direct Fire) کیا۔ جھاڑیوں میں ہر طرف آگ لگ گئی اور دشمن بھاگ گیا۔ میں نے زندگی میں پہلی دفعہ اس طرح فیلڈ گن کو ڈائریکٹ فائر کرتے دیکھا۔

لکشم کو کلیئر کرتے ہوئے ہمارے جوانوں نے دشمن کی 53 لاشیں گنیں۔ ہمارے دو جوان شہید ہوئے اور سترہ زخمی ہوئے۔ دشمن کی لاشوں کی گنتی کرتے ہوئے مکتی باہنی کا جھنڈا ملا جو میجر یوسف اور میجر تیمور نے مجھے دیا۔ میں مغربی پاکستان آیا تو جھنڈا میرے پاس تھا۔ حفاظت سے رکھ دیا لیکن ڈھونڈنے کے باوجود نہ ملا۔ چند ماہ پہلے ملا تو اس کی تصویر بنالی ہے۔ جھنڈا 12 ایف ایف رجمنٹ اور 39 بلوچ رجمنٹ کی امانت ہے۔ جی ایچ کیو بھیج دوں گا کہ انہیں پہنچا دیں یا آرمی میوزیم میں رکھ دیں تاکہ دونوں یونٹوں کے اس کارنامے کو یاد رکھا جائے گا۔

لیفٹیننٹ کرنل اسلم بیگ کی زیر قیادت لکشم آپریشن کے دوران مکتی باہنی سے پکڑا جانے والا جھنڈا

اسی دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا' جب میں یوسف فورس سے جا ملا تھا' سخت گرمی کا موسم تھا۔ دھان کے کھیتوں میں پانی بھرا ہوا تھا جس پر گولیوں کی چھر چھر کی آوازیں آتی تھیں۔ سڑک کے کنارے خشک تھے جہاں ہماری کمانڈ پوسٹ تھی۔ شام کے کوئی چھ بجے ہوں گے' میں نے پیچھے دیکھا کہ ایک سپاہی گولیوں سے بے پرواہ سڑک پر چلا آ رہا ہے۔ کمپنی حوالدار نے آواز لگائی:

"نیچے ہو جاؤ' کیوں جان دینا چاہتے ہو۔"

وہ جوان نیچے تو چلا گیا لیکن ہمارے قریب پہنچ گیا۔ ہاتھ میں کچھ اٹھائے ہوئے تھا۔ غور سے دیکھا تو اس کے دونوں ہاتھوں میں تازہ ناریل تھے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ بولا:

"ساب اس گرمی میں آپ اتنی دیر سے ہمارے ساتھ ہیں' پیاس لگی ہوگی۔"

"یہ ڈابھ (ناریل کا پانی) آپ کے لیے لایا ہوں۔"

"آپ ہمارا مہمان ہے۔ پی لیں"

ایک ناریل میں نے لیا اور دوسرا میجر یوسف کو دیا۔ میں اٹھا' اسے گلے لگایا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا خلوص اور پیار تھا جو بیان نہیں کر سکتا۔ عوام کا یہی خلوص اور احترام ہے جو ہماری فوج کی پہچان ہے۔ اسے ساتھ لے کر لکشم کی طرف چل پڑا جہاں ہمارے جوان داخل ہو چکے تھے۔

کومیلا آئے ہوئے کوئی تین ہفتے ہوئے تھے کہ میں کالج کی بلڈنگ میں قید بنگالی خاندانوں کو دیکھنے گیا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک شخص وضو کر رہا ہے۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے' بے تاب ہو کے گلے لگ گئے' ہچکیاں بندھ گئیں' جذبات قابو میں آئے تو بولے:

"تم' کیسا ہے بھائی؟"

"ہم ٹھیک ہے۔ آپ کیسے ہو؟ بھابھی انگور اور بچے کیسے ہیں؟" (انگور ان کی بیگم کا نام تھا)

"ہم یہاں ایک ماہ سے بند ہے' زندہ ہے۔"

پھر آنسو اور ہچکیاں' ہم دونوں اپنا چہرہ ہاتھ میں لئے روتے رہے۔

یہ کرنل ڈاکٹر حسین تھے جو کھاریاں میں ہمارے آر ایم او (Regimental Medical Officer) رہ چکے تھے۔ ہمارے خاندانی دوست تھے۔ وہ 27 بنگالی خاندانوں کے ساتھ قید تھے۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا:

"ان شاءاللہ میں آپ سب کے لئے گھر جانے کی اجازت حاصل کرا لوں گا۔"

"کل آؤں گا' اچھی خبر دوں گا۔ اب اجازت دیجئے۔"

"بھائی چائے تو پی لو۔"

"نہیں' مجھے کام ہے' اجازت دیجئے۔"

دراصل میں ان فیملیز کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اکثر کو جانتا تھا۔ مجھ میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔

میں جی او سی کے سامنے پیش ہوا اور ان سے اجازت مانگی کہ سب فیملیز کو آزاد کر دیں۔

"ان کا قصور کیا ہے؟" جی او سی نے پوچھا۔

"انہیں خود بھی نہیں معلوم کہ ان کا کیا قصور ہے۔ لیکن کچھ ایسی بھی خواتین ہیں جن کے شوہر قتل ہو چکے ہیں۔ اکثر فراری ہیں۔"

"ٹھیک ہے' انہیں جانے دو' ٹرانسپورٹ کا انتظام کر دینا۔"

دوسرے دن نماز فجر کے وقت دو بسوں میں انہیں کومیلا شہر روانہ کر دیا تا کہ صبح ہوتے ہی وہ اپنے اپنے گھروں کو جا سکیں۔

انہی دنوں کومیلا کی مشرقی سرحدوں کے قریب' شرپسندوں نے گڑبڑ مچائی ہوئی تھی' ان کی سرکوبی کے لیے کرنل نعیم کی بٹالین کو دو کمپنیوں کے ساتھ علاقے کو کنٹرول کرنے کے لیے بھیجا۔ تقریباً گیارہ بجے کرنل نعیم کا پیغام آیا کہ پل ٹوٹا ہوا ہے' آگے جانا مشکل ہے۔ میں نے کہا امپرووائز (Improvise) کرو' یعنی کوئی متبادل انتظام کرو اور جیسے بھی ہو پورے علاقے کو سکیور (Secure) کرو۔ انہوں نے سوئمنگ ایڈز (Swimming aids) تیار کیں' دریا کے پار گئے' دہشت گردوں کو مار بھگایا اور رات گیارہ بجے کے قریب کومیلا واپس آ گئے۔

ان کی حالت دیدنی تھی' پسینے اور کیچڑ میں لت پت مشکل سے کھڑے ہو سکتے تھے۔ میں نے کہا "Naeem, You are stinking کرسی پر مت بیٹھو' کھڑے رہو اور بتاؤ کہ

تمہارے پیر جو ایس ایس جی میں جیپ کے ایکسیلیٹر کے لیے بنے تھے آج ان کا کیا حال ہے۔ یہ بلڈنگ نمبر 33 نہیں ہے۔" پھر ہم دونوں کومیلا کی پرآشوب زندگی کو بھول کر چراٹ کی زندگی کو یاد کر کے دل کو بہلاتے رہے۔ ان تمام تر مشکلات کے باوجود ہمارے ڈویژن نے اپنی ذمہ داری کا پورا علاقہ اپنے کنٹرول میں کر لیا تھا اور مئی کے اختتام تک امن کی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ گھروں پر پاکستانی پرچم نظر آنے لگے تھے۔ اور ایسی ہی خبریں دوسری فارمیشنوں سے بھی آ رہی تھیں۔

انہیں دنوں جنرل امیر عبداللہ خان نیازی نے کمانڈ میں کچھ تبدیلیاں کیں اور 9 ڈویژن ہیڈکوارٹر کو جیسور سیکٹر کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ یہ عجیب سا فیصلہ تھا کہ ڈویژن ہیڈکوارٹر' جس کے پاس علاقے کی تمام آپریشنل معلومات(Operational Intelligence) تھیں اسے دوسرے علاقے میں بھیج دیا گیا اور ایک نئے ڈویژن ہیڈکوارٹر کو وہاں لگا دیا گیا جسے علاقے کی آپریشنل انٹیلی جنس کا کچھ علم نہ تھا۔

ہمیں جیسور سیکٹر کی ذمہ داری سنبھالنے اور معاملات کو سمجھنے میں وقت لگا لیکن پھر بھی وسط جولائی تک حالات کنٹرول میں آ چکے تھے۔ 9' 14' 23 اور 36 ڈویژنوں نے اپنے اپنے علاقوں میں امن قائم کر لیا تھا۔ ان نامساعد حالات میں بھی ہماری فوج نے بڑی ہمت اور جانفشانی کا مظاہرہ کیا اور قربانیاں دیں جنہیں ہم نے بھلا دیا ہے۔ کتنے آفیسرز اور جوان شہید ہوئے' جنہیں ہم یاد بھی نہیں کرتے۔ مثلاً چٹاگانگ کا واقعہ ہی لے لیں' جس کی جانب کرنل سلیمان کی کمان میں ایس ایس جی بٹالین نے چاٹگام سے پیش قدمی کی اور ایمبوش ہو گئے (مکتی باہنی والوں نے گھات لگا کر ان پر حملہ کیا)' کتنے گھنٹوں تک لڑتے رہے' خود شہید ہوئے' میجر شاہ پور اور سترہ جوان بھی شہید ہوئے۔ ان کی لاش ملی اور نہ کوئی انہیں یاد کرتا ہے۔ اسی طرح ایس ایس جی کے میجر کاظم کمال جو سابقہ نیول چیف طارق کمال کے بھائی تھے وہ ایسٹ بنگال بٹالین میں تعینات تھے۔ ان کا پلٹن والوں ہی نے بے دردی سے سر قلم کر دیا۔ ان کی میت بھی ہمیں نہ ملی۔

اس میدان کارزار میں ہمارے ہزاروں جوان اور افسران شہید ہوئے۔ ان کی بہادری اور جذبہ ایثار و قربانی کی داستانیں اگر اپنے دشمنوں کی زبانی بیان کروں تو ان کی عظمت کا اندازہ ہو سکے گا۔

پہلا واقعہ: ہمارا ڈویژن جیسور میں تھا۔ کھلنا کے محاذ پر 15 فرنٹیر فورس رجمنٹ تعینات تھی جس کی ایک کمپنی کی کمان کیپٹن ارجمند یار کنڈ کر رہے تھے۔ دشمن کے ایک بریگیڈ نے ان کی پوزیشن پر 23 نومبر کو حملہ کیا۔ 13 دسمبر تک مقابلہ کرتے رہے یہاں تک کہ ایمونیشن ختم ہو گیا تو چند جوانوں کو ایمونیشن دے کر کیپٹن ارجمند یار کنڈ کی کمان میں 'ریئر گارڈ' کی ذمہ داری دے کر پیچھے چھوڑا۔ دشمن کے تابڑ توڑ حملوں میں چار جوان شہید ہو گئے اور کیپٹن یار کنڈ بھی سخت زخمی ہوئے مگر لڑتے رہے۔ ایمونیشن ختم ہوا تو خاموش ہو گئے۔

دشمن بٹالین کا میجر ٹھاکر کیپٹن ارجمند کے مورچوں کے پاس پہنچا تو اپنی ڈائری میں لکھا:

"میں نے دیکھا کہ ایک زخمی نوجوان اپنی مشین گن پر جھکا ہوا تھا جس کا دائیاں پاؤں کٹ کر نیچے لٹک گیا تھا اور دائیاں ہاتھ ٹریگر پر تھا۔ سارا ایمونیشن ختم ہو چکا تھا۔ میں نزدیک پہنچا تو دھیمی آواز میں اس نے پانی مانگا۔ میں پانی لے کر پہنچا تو وہ فوت ہو چکا تھا۔ میں نے اس کے ڈاکومنٹ چیک کئے' وہ کیپٹن ارجمند تھا۔"

دوسرا واقعہ: بھارت کی ایسٹرن کمان کے چیف آف سٹاف جنرل جیکب لکھتے ہیں:

"پاکستانی سپاہی ایک ایک انچ زمین کے لئے لڑے۔ پانی میں اور دلدلی علاقوں میں مسلسل چل چل کر ان کے پاؤں گل چکے تھے۔ نیند سے بے حال تھے لیکن پھر بھی کوئی سپاہی بھاگا اور نہ ہی پیچھے ہٹا بلکہ آخری دم تک لڑتا رہا۔"

چار ماہ کے مختصر عرصے میں امن قائم ہو چکا تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب ہمارے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل شوکت رضا نے ہمیں امن و امان کے حالات سے متعلق تفصیلی تجزیہ کرنے کو کہا جو ہم نے تیار کر لیا اور ایسٹرن کمانڈ ہیڈکوارٹر گئے جہاں جنرل نیازی کے سامنے پیش کیا۔ ہمارے تجزیے کا خلاصہ یہ تھا کہ فوج نے اپنی ذمہ داریاں پوری کر دی ہیں اور اب

وقت ہے کہ سول انتظامیہ حالات کو سنبھالے' ادارے قائم ہوں اور سیاسی عمل شروع ہو۔ اس بات کی تصدیق نامور مصنفہ شرمیلا بوس نے اپنی کتاب "Dead-Reckoning" میں کچھ ان الفاظ میں کی ہے کہ پاکستانی فوج نے اپریل و مئی تک واضح طور پر مشرقی پاکستان پر مکمل کنٹرول حاصل کر کے سیاسی عمل شروع کرنے کا موقع فراہم کر دیا تھا۔

جنرل نیازی کو یہ بات پسند نہ آئی۔ انسانی نفسیات ہے کہ اسے اقتدار ملے تو وہ طاقت کے نشے میں مدہوش ہو جاتا ہے۔ اقتدار سے علیحدگی اسے گوارا نہیں ہوتی۔ جنرل نیازی بھی طاقت کے نشے میں چور تھے' انہیں یہ بات کیسے پسند آتی کہ اقتدار سول انتظامیہ کو سونپ دیتے۔ انہوں نے کچھ ایسے ریمارکس پاس کئے جو ہمارے جنرل آفیسر کمانڈنگ کو ناگوار گذرے اور تلخ کلامی ہوئی۔ جنرل نیازی ناراض ہو گئے' کانفرنس ختم کر دی اور تین دن کے اندر اندر کمانڈ تبدیل کر دی گئی۔ ہم بھی زیر عتاب آئے لیکن فی الوقت اپنی جگہ پر قائم رہے۔

ایک نئے جنرل آفیسر کمانڈنگ آ گئے۔ وہ پہلے جی او سی کا حشر دیکھ چکے تھے۔ انہوں نے بڑی احتیاط سے کام لیا۔ پہلا کام انہوں نے یہ کیا کہ مجھے حکم دیا کہ Daily Sitrep جو جی ایچ کیو اور ایسٹرن کمانڈ کو بھیجنے کے لئے میں تیار کرتا تھا' اس کا ڈرافٹ پہلے انہیں دکھایا جائے۔ Sitrep' سچوئیشن رپورٹ کا مخفف ہے جو حالت جنگ میں ہر یونٹ اور فارمیشن اپنے سے بالا ہیڈکوارٹر کو باقاعدگی سے بھیجتا ہے۔ ڈرافٹ انہیں پیش ہونے لگا۔ ان رپورٹس میں وہ ایسی تبدیلیاں کرتے کہ بری خبر اچھی نظر آنے لگتی۔ یہ سلسلہ جاری رہا' ادھر میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا گیا۔ ایسی توقع میں اپنے جی او سی (GOC) سے نہیں رکھتا تھا کہ وہ سچ کو جھوٹ میں بدل دیں گے۔ دسویں دن صبح ان کے آفس میں پیش ہوا اور عرض کیا:

''سر' مجھے کچھ عرض کرنا ہے''

ہاں' کیا بات ہے بتاؤ۔''

میں نے کہا کہ ''ڈیلی رپورٹس جو ہم جی ایچ کیو اور ایسٹرن کمانڈ کو بھیجتے ہیں ان میں ایسی ردوبدل نہ کی جائے کہ حالات کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہو جائے۔ اپنی فارمیشنز سے جو

رپورٹس آتی ہیں ان کا صحیح تجزیہ کر کے آگے بھیجنا چاہیے۔''

جی او سی کا رنگ پیلا پڑ گیا' بولے: ''What Non-sense, Get Out''۔

میں باہر آیا اور جی ایس او ٹو (GSO-2) میجر کھوکھر کو کہا' اب یہ رپورٹ آپ لکھیں گے کیونکہ جی او سی کو میری انگریزی پسند نہیں ہے۔ میں سوچتا رہا کہ اس گستاخی کی سزا تو ملے گی۔

کورٹ مارشل بھی ہو سکتا تھا' ریٹائر بھی کیا جا سکتا تھا۔

اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا کہ تیسرے ہی دن مجھے ٹرانزٹ کیمپ راولپنڈی رپورٹ کرنے کا حکم ملا۔

ٹرانزٹ کیمپ (Transit Camp) راولپنڈی میں چند دن او ایس ڈی (Officer on Special Duty) رہا۔ اس دوران میں اپنے خلاف ڈسپلنری ایکشن کا انتظار کر رہا تھا لیکن ڈسپلنری ایکشن کی بجائے مجھے وار کورس پر بھیج دیا گیا۔ اس وقت وار کورس کی پوسٹنگ 'Dump Posting' سمجھی جاتی تھی۔ وار کورس شروع ہو گیا۔ ابھی تین ماہ بھی نہیں ہوئے تھے کہ کورس بند ہو گیا' کیونکہ جنگ کے بادل سروں پر منڈلا رہے تھے۔

حکم ملا کہ 53 بلوچ رجمنٹ کھڑی ہو رہی ہے' ایبٹ آباد جاؤ' کمانڈ سنبھالو اور بٹالین کو لے کر مشرقی پاکستان جاؤ۔ اسی طرح جیسے کہ میں 9 ڈویژن کے ساتھ مارچ 71ء میں گیا تھا۔ یہ میری سزا تھی جی او سی سے گستاخی کی۔ میں ایبٹ آباد پہنچا' 53 بلوچ رجمنٹ کی کمان سنبھالی جس میں 600 نئے ریکروٹ' جن کی کل ٹریننگ چھ ماہ تھی اور تین سو پرانے ریزروسٹ (Reservists) پر مشتمل تھی۔ انہیں لے کر حویلیاں ڈپو گیا' رائفلیں اور ایل ایم جی (Draw) کروائیں جو کریٹوں میں بند تھیں۔ 2 دسمبر کی شام ٹرین سے روانہ ہوئے۔ ابھی راولپنڈی اسٹیشن بھی کراس نہیں کیا تھا کہ 3 دسمبر کی صبح جنگ کا اعلان ہو گیا اور ہمیں حکم ملا کہ ہماری پلٹن ہربنس پورہ' لاہور جائے گی۔

سامان حرب کی شدید کمی تھی۔ 3 دسمبر کی رات ہم ہربنس پورہ پہنچے' راستے میں

ریزروسٹ بھی ملتے گئے ۔ یہ ریزروسٹ اس قدر پرجوش تھے کہ انہوں نے ایبٹ آباد جانے کی بجائے محاذ پر جانے کو ترجیح دی۔اس طرح ہماری نفری 1200 ہو گئی۔ ہمارے پاس صرف ایک لنگر کا ساز و سامان اور 900 کمبل تھے۔ بھاری ہتھیار بھی نہیں تھے۔ سگنل پلاٹون بھی نہ تھی' البتہ چھ رائفل کمپنیوں کی نفری ضرور تھی۔ صرف ایک جیپ اور ایک دوسری جنگ عظیم ماڈل کا ٹرک ہمیں ملا تھا۔

اسی رات ہمیں حکم ملا کہ 103 بریگیڈ رپورٹ کریں جو نارنگ منڈی کے علاقے بدوملی کے آگے تعینات تھا۔ 3 دسمبر کی رات ہم 103 بریگیڈ کا حصہ بن گئے اور ان مورچوں میں پوزیشن سنبھالی جو 5 ایسٹ بنگال رجمنٹ چھوڑ کر بارڈر کراس کر گئی تھی۔ ہمارے ایک طرف 17 پنجاب جسے لیفٹیننٹ کرنل محمد صفدر کمان کر رہے تھے اور دوسری طرف 3 بلوچ تھی جسے لیفٹیننٹ کرنل راجہ شوکت محمود کمان کر رہے تھے۔ دونوں صد سالہ پرانی بٹالین تھیں۔ اللہ سے دعا کی "یارب ہماری عزت رکھ لے' دشمن کے سامنے ہمیں سرخرو کر دے۔" اللہ نے ہماری سن لی' بڑی مشکل سے رات گذری' کسی قسم کی لاجسٹک سپورٹ ملنے کی امید نہ تھی' ایمونیشن نہ تھا' رائفلیں اور ہلکی مشین گنیں کریٹوں میں بند تھیں' بریگیڈ یا ڈویژن سے کچھ ملنے کی امید بھی نہ تھی۔ خاموش بیٹھ رہنا غلطی ہوتی' اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ سب کچھ خود ہی کرنا ہوگا۔

صبح ہوتے ہی 2IC میجر اکمل محمود اور صوبیدار میجر فضل حسین مرزا کو بلایا اور ہدایت دی کہ لاہور جاؤ اور ضرورت کی تمام چیزیں اکٹھی کرو' مثلاً لحاف' کمبل' گینتی' بیلچے' لنگر کا سامان اور وائرلیس' ٹیلیفون تار اور سیٹ وغیرہ' وغیرہ۔ وہ گئے اور ابھی شام نہیں ہوئی تھی کہ دو (2) سویلین ٹرک سامان سے لدے بھرے پہنچ گئے۔ ضرورت کی ہر چیز موجود تھی جو ہمارے فراخ دل لاہوریوں نے بغیر کسی معاوضے کے ہمیں عطا کی تھیں۔ ہماری بنیادی ضرورت پوری ہو گئی۔

ہمارے پاس ایمونیشن نہیں تھا' جو سب سے بڑی کمزوری تھی۔ Collection پارٹی حویلیاں ڈپو جا چکی تھی لیکن جانے اور لانے میں کم از کم ایک ہفتہ لگ جاتا۔ یقیناً یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ میں نے ساتھ والی یونٹ کے کمانڈنگ آفیسر کرنل راجہ شوکت محمود

سے رابطہ کیا' اپنی مشکل بیان کی تو انہوں نے بڑی فراخدلی سے ایک سیکنڈ لائن لفٹ اپنی گاڑی میں رکھ کے بھجوا دی۔ اس کے تین دن بعد ہماری ایمونیشن پارٹی بھی حویلیاں سے پورا ایمونیشن لے کر پہنچ گئی۔

ہمارے پاس بھاری ہتھیار نہ تھے۔ مارٹر تھے اور نہ ہی ٹینک شکن ریکائلیس رائفل (Recoil-less Rifle) جسے مختصراً آر آر کہا جاتا ہے' صرف نفری تھی جس سے ہم نے چھ رائفل کمپنیاں بنا لیں لیکن مصیبت یہ تھی کہ ہمارے ریکروٹ اور ریزروسٹ جی تھری رائفل اور ایل ایم جی کو استعمال کرنا نہیں جانتے تھے۔ ان کی ٹریننگ کا کریش پروگرام بنایا اور فیصلہ ہوا کہ ان کے لیے بیٹل انا کولیشن (Battle Innoculation) کی ضرورت ہے۔

تین کمپنیوں کو تھوڑا تھوڑا ایمونیشن دے کے آگے متعین (Deploy) کیا اور تین کمپنیاں پیچھے۔ آگے والی کمپنیوں کو حکم دیا کہ دن کی روشنی میں اپنا اپنا ٹارگٹ چن لو اور رات کھانے کے بعد جب ہماری طرف سے اشارہ ملے تو فائر شروع کر دینا۔ سب تیار تھے' بگل بجا اور فائر کھل گیا۔ ادھر سے دشمن کا فائر' مارٹر اور گنوں کا فائر کھلا' ایک ہنگامہ برپا ہوا۔ بریگیڈ اور ڈویژن والے پریشان ہو گئے۔

"کیا ہوا ہے' کیا ہو رہا ہے" کا شور مچ گیا۔

ہم نے جواب دیا:

"ہم پر دشمن کا حملہ ہوا ہے اور ہم اس کا منہ توڑ جواب دے رہے ہیں۔"

آدھے گھنٹے تک یہ سلسلہ جاری رہا اور بہترین بیٹل انا کولیشن ثابت ہوا۔ تین دن بعد پیچھے والی تینوں کمپنیوں کو آگے لائے اور اسی طرح سگنل ملنے پر فائر کھل گیا اور پھر وہی طوفان اور ہمارا جواب کہ دشمن کا سخت حملہ ہوا ہے اور اس کا بھرپور جواب دے رہے ہیں۔

کور کمانڈر جنرل بہادر شیر کا فون آیا:

"بیگ کیا کر رہے ہو' مجھے معلوم ہے۔"

"سر' میری بٹالین نے یہ ہتھیار فائر نہیں کیے تھے۔ اس طرح ان کی فائر پریکٹس اور بیٹل

انا کولیشن کرا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے احتیاط سے کام لینا' شاباش۔"

میں ایک دلچسپ بات بتانا بھول گیا تھا کہ ہماری یونٹ 3 دسمبر کی رات جس علاقے میں پہنچی تھی وہ بدھوملی کا علاقہ تھا جو نارنگ منڈی کے نزدیک ہے' اور پورا علاقہ گندم کی شاداب فصل سے لہرا رہا تھا۔ درمیان میں بدھوملی ریسٹ ہاؤس تھا جسے ہم نے یونٹ کا ایڈمنسٹریٹو ایریا (Administrative Area) بنایا تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس کھاد کی بوریوں اور دوسرے سامان سے بھرا ہوا تھا۔ باہر کوئی ایک درجن بلڈوزر اور ٹریکٹر کھڑے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ فوجی جرنیلوں کی ملکیت ہیں جنہوں نے کوئی بیس مربع زمین تیار کر کے گندم لگائی ہے۔ ایک آنریری کیپٹن انچارج تھا۔ میں نے صوبیدار میجر کو کہا کہ ان کو بولو کہ اگلے 24 گھنٹوں میں ریسٹ ہاؤس خالی کر دیں۔ اس حکم کو ابھی دو گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے کہ جی او سی کا ٹیلیفون آیا:

"بیگ کیوں انہیں تنگ کر رہے ہو' رہنے دو۔"

سر' یہ سرحدی علاقہ ہے اور ہم نے یہاں دفاعی اقدامات لینے ہیں' اس لئے یہاں ان کے رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے' ان کا اٹھنا ضروری ہے۔"

وہ خاموش ہو گئے اور دوسرے دن وہاں ہمارا ایڈم ایریا بن گیا۔

53 بلوچ رجمنٹ جو اب 20 سندھ رجمنٹ بن گئی ہے' اسے ایک انفرادی مقام حاصل ہے کہ اس قدر نامساعد حالات میں وہ ثابت قدم رہے' اپنی روایات کو قائم رکھا۔ میرے دل میں 20 سندھ کا احترام ہے اور اسے بھی اپنی Parent یونٹ سمجھتا ہوں۔ جنگ ختم ہو گئی تو ہمیں مارٹر' آر آر اور سگنل کا سازوسامان ملا اور آہستہ آہستہ فالتو نفری کی ایڈجسٹمنٹ (Adjustment) ہوئی اور ہماری یونٹ پوری طرح مسلح ہو گئی۔ یہ انتہائی جنگ کے لئے ہماری تیاری کی' جو ناقص تھی اور عسکری قیادت کی نااہلی کی کھلی تصویر تھی۔ اللہ ہم پر مہربان تھا' ہماری عزت قائم رہی۔

20 سندھ رجمنٹ نے فور اسٹار بٹالین (4 Star Battalion) کا امتیازی نام اختیار

کیا۔ کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل وسیم اختر اور جوانوں نے مجھے یونٹ کی شیلڈ پیش کی جو میرے لئے باعث افتخار ہے۔

20 سندھ رجمنٹ کی یادگاری شیلڈ

اس شیلڈ میں چار ستاروں کا مطلب یہ ہے اس یونٹ کا کوئی افسر فور سٹار جنرل بنا۔

ایک اور واقعہ بیان کرنا چاہوں گا' جو افسوسناک بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ یہ واقعہ جنگ ختم ہونے کے چند دن بعد پیش آیا۔ ہمارے بریگیڈ نے سرحد کے نزدیک دشمن کی کچھ مشتبہ کارروائی دیکھی تو ہماری بٹالین کو ریکی Reccee کر کے حالات معلوم کرنے کو کہا۔ میں نے ڈی کمپنی کے میجر طارق کو ٹاسک دیا۔ انہوں نے اطلاع دی کہ یہاں تو ہماری اپنی بارودی سرنگیں بچھی ہوئی ہیں' جو 5 ایسٹ بنگال رجمنٹ نے بچھائی تھیں۔ آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں۔

جب بارودی سرنگیں بچھائی جاتی ہیں تو ان کا باقاعدہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے اور اپنے افراد کی رہنمائی کے لئے ان کے بیچ میں سے گذرنے کے راستے بھی رکھے جاتے ہیں۔ میجر

طارق کو وہ گزرگاہیں نظر نہیں آئیں۔ میں خود آگے گیا' ڈھونڈھتا رہا' راستہ نہ ملا۔ ادھر ادھر دیکھا تو ایک صاف چٹیل جگہ پر بارودی سرنگوں کے نشانات نظر آئے' بیچ بیچ میں جگہ تھی۔ میں نے کہا" آؤ میرے پیچھے پیچھے" میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا چلتا گیا اور میجر طارق کا گشتی دستہ بھی بارودی سرنگوں کے پار پہنچ گیا اور اپنا کام مکمل کرلیا۔

چند دنوں بعد میجر طارق کو ایک اور ٹاسک ملا' وہ بارودی سرنگوں کے پار گئے' کام پورا کیا اور واپسی پر شارٹ کٹ کی کوشش میں ان کا پیر ایک مائن پر آ گیا' زخمی ہو گئے' ایک پیر ضائع ہوگیا۔ وہ یہیں میرے گھر کے قریب رہتے ہیں' جب انہیں دیکھتا ہوں تو دکھ ہوتا ہے کہ میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہ زخمی ہوئے۔

ابھی میری یونٹ سرحدوں پر ہی تھی کہ میری پوسٹنگ وار کورس کے ڈائریکٹنگ سٹاف کے طور پر ہوگئی۔ میں نے تو کورس بھی پورا نہیں کیا تھا' صرف چار ماہ پہلا شش ماہی پورا ہوا تھا۔ ایک بار پھر اللہ نے مجھے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ بارہ بارہ گھنٹے پڑھ کے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو تیار کرلیا۔ میں یہیں فل کرنل پروموٹ ہوا اور ایک سال بعد بریگیڈیئر پروموٹ ہو کے 101 بریگیڈ کی کمان سنبھالی جو سیالکوٹ میں تعینات تھا۔ 101 بریگیڈ سیالکوٹ میں ایک سال ہی گذرا تھا کہ 60 بریگیڈ بلوچستان پوسٹنگ ہوگئی۔ بریگیڈ کا ریئر (Rear) رحیم یار خان میں تھا' پرانی لیبر کالونی میں جگہ ملی۔ بریگیڈ مری اور بگٹی علاقے میں آپریشن میں مصروف تھا۔

بلوچستان سیاسی طور پر کبھی مستحکم نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ برصغیر کی تقسیم کے وقت 565 ریاستیں تھیں جو صوبوں کا حصہ نہیں تھیں بلکہ براہ راست برطانوی راج کے ماتحت تھیں۔ تقسیم کے وقت انہیں یہ اختیار دیا گیا کہ وہ اپنی رعایا کی خواہشات کو مدنظر رکھتے ہوئے پاکستان یا بھارت میں سے کسی سے الحاق کرلیں یا چاہیں تو خودمختار رہیں۔

اس اصول کے تحت بلوچستان کی ریاستوں مکران' لسبیلا اور خاران نے پاکستان سے الحاق کرلیا لیکن قلات کے سربراہ میر احمد یار نے اپنی ریاست کو خودمختار رکھنے کا اعلان کردیا۔

بعد میں حکومت پاکستان کے سمجھانے بجھانے سے 27 مارچ 1948ء کو انہوں نے پاکستان سے الحاق کا اعلان کیا۔ یہ بات ان کے بھائی پرنس عبدالکریم خان کو پسند نہ آئی اور انہوں نے قلات کی خودمختاری کے لئے مسلح جدوجہد شروع کردی۔ فوجی آپریشن جب شروع ہوا تو مکران اور ساحلی علاقے کی نگرانی کے لئے مجھے بھی ذمہ داری دی گئی اور میں نے اپنی ایس ایس جی کمپنی کے ساتھ ان علاقوں میں ذمہ داری پوری کی جس کی تفصیل میں پہلے بیان کرچکا ہوں۔

جب چاروں صوبوں کو ملا کر ون یونٹ بنایا گیا تو نواب نوروز خان نے اس کی مخالفت کی اور مینگل' مری اور بگٹی قبائل کو ساتھ ملا کر بلوچستان کی خودمختاری کی مسلح جدوجہد شروع کی۔ جلتی پر تیل کا کام بھٹو نے کیا جب 1973ء میں انہوں نے صوبہ سرحد (موجودہ خیبر پختونخواہ) اور بلوچستان کی حکومتوں کو ختم کر کے وہاں مارشل لاء نافذ کردیا۔ اس کے نتیجے میں کئی مسلح گروپ سامنے آئے جس میں میر ہزار خان کا قائم کردہ بلوچستان پیپلز لبریشن فرنٹ' بلوچستان لبریشن آرمی اور بلوچستان لبریشن یونائیٹڈ فرنٹ جیسے گروپ شامل تھے۔

ایک اور مسئلہ سوئی گیس کا تھا جو نکلتی تو بلوچستان سے تھی لیکن استعمال باقی صوبوں میں ہوتی تھی۔ اس کی کچھ رائلٹی تو نواب اکبر بگٹی کو ادا کی جاتی تھی اور کچھ بلوچستان کی صوبائی حکومت کو۔ مسلح تنظیموں کا مطالبہ تھا کہ رائلٹی دوسرے قبائلی سرداروں کو بھی ادا کی جانی چاہیے اور صوبائی حکومت کی رائلٹی کا حصہ بھی بڑھایا جائے تاکہ یہاں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بیشتر حصہ یہاں کے لوگوں کی فلاح و بہبود پر خرچ ہو۔ جب ان کے مطالبوں کو مناسب پذیرائی نہ مل سکی تو انہوں نے ریل کی پٹڑیاں اور سوئی گیس کے پائپ اکھاڑنے شروع کر دیئے' فوجی قافلوں پر حملے کرنے لگے اور سوئی گیس کی تنصیبات کو نقصان پہنچانا شروع کردیا۔

اب متعلقہ سیاسی رہنماؤں سے مشاورت اور انہیں منانے کا کام تو سیاسی حکومت کا تھا لیکن فوج کو یہ کام سونپا گیا کہ وہ تخریبی سرگرمیوں کا قلع قمع کریں اور امن و امان بحال کریں۔ اسی پس منظر میں 60 بریگیڈ کو بلوچستان میں تعینات کیا گیا۔

میری فیملی کھاریاں سے 1971ء میں ہمارے مشرقی پاکستان جانے کے بعد سے خانہ بدوشوں کی طرح رہ رہی تھی۔ رحیم یار خان میں ایک ریکوزیشنڈ مکان (Requisitioned House) میں میری فیملی نے دو سال گذارے۔ میرے بچے اسکول اور کالج میں تھے۔ ان کی تعلیم کا نقصان ہوا لیکن ان کی حوصلہ مندی تھی کہ انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی۔

مارچ 1975ء تک ہمارے بریگیڈ نے مری علاقے میں امن وامان بحال کر دیا۔ اس کے بعد بگٹی علاقے میں نواب اکبر بگٹی کے گھر کے نزدیک کیمپ لگایا۔ انہی دنوں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا پیغام ملا کہ وہ ہمارے علاقے کا دورہ کرنا چاہتے ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ ایک جلسے کا بھی اہتمام کیا جائے۔ ہم کوئی سیاستدان تو تھے نہیں کہ سیاسی جلسہ کرتے لیکن حکم کی تعمیل ضروری تھی۔ دنبے خریدے' بڑے کھانے کا انتظام کیا اور علاقے کے بگٹیوں کو وزیراعظم سے ملنے کی دعوت دی۔ تقریباً 4 ہزار لوگ جمع ہو گئے۔ وزیراعظم آئے اور بریگیڈ ہیڈکوارٹر میں بریفنگ کے بعد انہوں نے افسروں اور جوانوں سے ملاقات کی جس کے بعد ہم انہیں جلسہ گاہ میں لے گئے۔ انہوں نے خطاب کیا' خوب نعرے لگے۔ وزیراعظم بھی حیران ہوئے اور بولے کہ وہ نواب صاحب کے گھر تعزیت کے لئے جانا چاہتے ہیں (کچھ عرصہ پہلے نواب صاحب کے ایک بیٹے کا انتقال ہوا تھا)۔ میرے ڈویژن کمانڈر نے منع کیا کہ وہاں تو دو ڈھائی سو ہتھیار بند بگٹی موجود ہیں۔ وزیراعظم نے کہا" کوئی بات نہیں' گھر آئے مہمان کو وہ مہمان سمجھتے ہیں۔" میں اپنی جیپ میں ان کو نواب صاحب کے گھر لے گیا' وہ موجود نہیں تھے' ان کے صاحبزادے تھے۔ وہاں سے فارغ ہو کر جب میں انہیں واپس ہیلی پیڈ لے جا رہا تھا تو ان سے مخاطب ہوا:

"سر آپ نے دیکھا کہ ہم نے ان علاقوں میں امن قائم کر دیا ہے۔ اب ضرورت ہے کہ سول انتظامیہ معاملات کو سنبھالے اور عدالتیں قائم ہوں اور سیاسی عمل شروع ہو۔"

ان شاء اللہ ایسا ہی ہوگا' بہت جلد آپ کو احکامات ملیں گے۔"

کمانڈر 60 بریگیڈ، بریگیڈیئر اسلم بیگ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے ہمراہ۔

وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو 60 بریگیڈ کے افسروں کے ساتھ (1975ء)

اور وہ کوئٹہ کی سمت پرواز کر گئے لیکن حالات ایسے بدلے کہ ان کو احکامات جاری کرنے کی مہلت ہی نہ ملی۔

ڈیرہ بگٹی سے 60 بریگیڈ ہی آ گیا' جہاں ہم نے پوری گرمی خیموں میں گذاری۔ اس موسم میں اکثر گرم ہوا اور ریت کا طوفان مسلسل ایک ایک ہفتے تک چلتا رہتا ہے' اور کھانا کھانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ ہم نے یہ وقت صبر کے ساتھ گزارا۔

میرا منفرد ریکارڈ ہے کہ آٹھ سالوں میں دس پوسٹنگز ہوئیں:

1967۔ مشرقی پاکستان سے 30 بلوچ

1969۔ 30 بلوچ سے 36 بلوچ

1970۔ 36 بلوچ سے 9 ڈویژن

1971۔ 9 ڈویژن کھاریاں سے 9 ڈویژن کومیلا (مشرقی پاکستان)

1971۔ 9 ڈویژن سے وارکورس راولپنڈی

1971۔ وارکورس سے 20 سندھ

1972۔ 20 سندھ سے ڈی ایس وارکورس راولپنڈی

1973۔ ڈی ایس وارکورس سے 101 بریگیڈ سیالکوٹ

1974۔ 101 بریگیڈ سے 60 بریگیڈ

1975۔ 60 بریگیڈ سے چیف انسٹرکٹر وارکورس راولپنڈی

آٹھ سالوں میں دس پوسٹنگ۔ شاید میری گستاخیوں کی سزا تھی۔ میرے لئے تو مشکل نہ تھا لیکن میری بیوی اور بچوں کے لئے سزا تھی۔ بچوں کی تعلیم نامکمل رہی اور اپنا بھاری سامان جو اپنے گیراج میں رکھ دیا تھا' وہاں میری کتابیں' تصویریں' میری ڈگریاں' پرانی یادیں برسات کے پانی اور دیمک نے چاٹ لیں۔ شاید اللہ کو یہی منظور تھا کہ ماضی کو بھول جاؤ' مستقبل پر نگاہ رکھو' اپنے خوابوں کی سرزمین کو روشن اور تاباں رکھنے کی جدوجہد میں لگ جاؤ۔

جب میری پوسٹنگ نیشنل ڈیفنس کالج میں بطور چیف انسٹرکٹر وارکورس ہوئی تو آٹھ

سال کے بعد فیملی کے ساتھ سکون سے رہنا نصیب ہوا۔ نیشنل ڈیفنس کالج کے کمانڈنٹ جنرل رحیم تھے۔ ان کو تعجب ہوا کہ اپنی پوری سروس میں' میں نے کوئی فارن کورس نہیں کیا تھا۔ انہوں نے سوال کیا:

"کیا یہ صحیح ہے"

جی ہاں' صحیح ہے' میں اصیل النسل پاکستانی ہوں اور میری تربیت میں کسی غیر ملکی تعلیم و تربیت کی کوئی آمیزش نہیں ہے"

یہ وقت تھا کہ جب وارکورس کو باہر کے ملکوں کا دورہ کرنا ہوتا تھا۔ مجھے اس گروپ کا لیڈر بنایا گیا جسے چین' شمالی کوریا اور جنوبی کوریا جانا تھا۔ یہ دورہ ایسا لگا جیسے ایک سنہرا خواب ہو' اس لئے کہ 1971ء سے لے کر 1976ء تک کا عرصہ میرے لئے بڑا ہی پر آشوب دور تھا۔ یہی وہ دن تھے جب بھٹو حکومت کے خلاف احتجاج زوروں پر تھا۔ افواہیں گرم تھیں کہ فوج اقتدار سنبھال لے گی لیکن فوج اپنی وفاداری کی یقین دہانی کرا رہی تھی۔ وہی جنرل ضیاء الحق تھے کہ 1975ء میں جب وہ ملتان کور کمانڈر تھے' بھٹو صاحب ملتان کا دورہ کر کے نواب صادق حسین قریشی کے گھر قیام پذیر تھے اور لائبریری میں مطالعہ کر رہے تھے کہ جنرل ضیاء کا پیغام آیا کہ وہ ملنا چاہتے ہیں۔ بھٹو نے کہا' ابھی تو وہ ملے تھے' اب کیوں آنا چاہ رہے ہیں۔ بہر حال انہیں بلایا گیا۔ وہ آئے اور دست بستہ حلفیہ عرض کی:

"سر' میں وعدہ کرتا ہوں کہ ہر قسم کے حالات میں' میں آپ کا وفادار رہوں گا' اور جو ذمہ داری بھی آپ مجھے دیں گے' عمل کروں گا۔" بھٹو متاثر ہوئے' ساتھ چائے پی اور سوچ میں گم ہو گئے۔ اس کے چند ماہ بعد جنرل ضیاء کو آرمی چیف بنا دیا۔ (اس واقعے کا ذکر انہوں نے سپریم کورٹ کے سامنے اپنے آخری بیان میں بھی کیا ہے۔)

بھٹو نے جنرل ضیاء کو آرمی چیف بنایا اور آرمی چیف نے بھٹو کو آرمڈ کور کا کرنل انچیف بنایا۔ کھاریاں چھاؤنی میں ایک زبردست تقریب منعقد کی گئی اور بھٹو صاحب کو ایک مرصع

تلوار پیش کی گئی۔ خطبہ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے جنرل ضیاء نے کہا ''ہمیں فخر ہے کہ یہ تلوار ہم ایک ایسے شخص کو پیش کر رہے ہیں جو خود بھی ذوالفقار علی ہے۔'' انہی دنوں بھٹو کے خلاف احتجاج شروع ہوا جو شدت اختیار کرتا گیا۔ ائر مارشل اصغر خان نے' جو احتجاجی جماعتوں میں شامل تھے' جنرل ضیاء کو تفصیلی خط لکھا کہ حالات بڑے نازک مقام پر آ چکے ہیں اور لازم ہے کہ وہ حکومت کا کنٹرول سنبھال لیں۔ یہ خط جنرل ضیاء نے فارمیشن کمانڈروں کو بھیجا' اس کی ایک کاپی مجھے بھی ملی (جو میرے پاس ہے)۔

اس واقعے کے چند دنوں بعد تینوں سروسز چیف (Services Chiefs) اور چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی (Chairman JCSC) نے ایک مشترکہ اعلامیہ جاری کیا جس میں یقین دہانی کرائی گئی کہ ''افواج پاکستان ہر حال میں حکومت کے ساتھ ہیں۔'' اس اعلامیہ کو جاری ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ جنرل ضیاء نے بھٹو حکومت کا خاتمہ کر کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے اور اس کے بعد عسکری حکومت کا طویل دور شروع ہوا۔

میں نیشنل ڈیفنس کالج میں مزید تین سال تک اپنی ذمہ داریاں پوری کرتا رہا۔ میرے لئے یہ مدت بہت ہی اہم تھی' اس لئے کہ خود اعلیٰ عسکری تعلیم سیکھتا اور سکھاتا رہا جس کے سبب فوج میں بڑی تبدیلی یہ آئی کہ ہر اعلیٰ سطح پر وار کورس کوالیفائیڈ (War Course Qualified) آفیسرز پوسٹ ہو چکے تھے۔ آرمڈ فورسز وار کورس کیریئر کورس (Career Course) بن چکا تھا اور جب میں 1979ء میں جی ایچ کیو میں سی جی ایس (CGS) پوسٹ ہوا تو انہی آفیسرز کے تعاون اور تجربے سے استفادہ کیا اور فوج کی ترویج و ترقی کے لئے مکمل منصوبہ بندی تیار کرنے میں کوئی مشکل نہ ہوئی لیکن ذہن میں 1971ء کے واقعے کی چبھن پریشان کرتی رہی' اس لئے کہ جب میں 1971ء میں 9 ڈویژن سے نکالا گیا تھا اور ٹرانزٹ کیمپ راولپنڈی بھیج دیا گیا تھا تو سمجھا کہ میرا کیریئر ختم ہو گیا لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

میں نے وار کورس کے ڈائریکٹنگ سٹاف اور اس کے بعد چیف انسٹرکٹر کے طور پر اعلیٰ عسکری تعلیم حاصل کی۔ تقریباً پانچ سال وار کالج میں رہ کر میں نے فوج کی صلاحیتوں اور اس کی کمزوریوں کا تفصیلی جائزہ لیا اور خصوصاً 65ء کی جنگ' جو ہم جیت سکتے تھے لیکن ناکام رہے اور 71ء کی جنگ جو عسکری منصوبہ بندی کی بدترین مثال تھی جس میں ہم نے آدھا ملک گنوا دیا۔ اس جنگ کے لئے تیاریاں عبرتناک حد تک ناقص تھیں جس کی مثال میں 71 کی جنگ میں 20 سندھ کی کمانڈ کے حوالے سے بیان کر چکا ہوں۔

1978ء میں میجر جنرل پروموٹ ہوا اور مجھے 14 ڈویژن کی کمان ملی جو ان دنوں اوکاڑہ میں تعینات تھا۔ اس کمان کے ملتے ہی میں اعلیٰ عسکری قیادت (Military Hierarchy) کا حصہ بن گیا اور 1978ء سے لے کر 1988ء تک فوج کے تمام معاملات سے متعلق رہا۔ 14 ڈویژن' ملتان میں متعین 2 کور کا حصہ تھا۔ جنرل ضیاء کی حکومت تھی اور وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کا مقدمہ آخری مراحل میں تھا۔ 79ء میں سپریم کورٹ نے بھٹو کو پھانسی کا فیصلہ سنا دیا۔

جنرل ضیاء نے آفیسروں اور جوانوں کا ردعمل معلوم کرنے کے لیے تمام کور کمانڈروں کو جائزہ لینے کو کہا۔ ہمارے کور کمانڈر نے سینئر افیسروں کو بلایا اور ان کا ذہن معلوم کرنے کے لئے بہت سے سوالات پوچھے۔ سبھی نے کہا کہ بھٹو کو پھانسی دینے سے تھوڑا بہت ردعمل تو ہوگا لیکن اسے سنبھالا جا سکتا ہے۔ میں سب کی باتیں سنتا رہا اور بالآخر کور کمانڈر کی اجازت سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ میں نے کہا:

۔'' بھٹو کو پھانسی دینا بہت ہی غلط فیصلہ ہوگا' اس کے نتائج سنگین ہوں گے۔ ایسی سیاسی پیچیدگیاں (Political Abberations) پیدا ہوں گی جنہیں سنبھالنا مشکل ہوگا۔

۔اس عمل سے پنجاب اور سندھ کے لوگوں کے درمیان نفرتیں بڑھیں گی۔

۔'' بہتر ہوگا کہ بھٹو کو جلاوطن کر دیا جائے۔ فلسطین کے یاسر عرفات' سعودی عرب کے شاہ فیصل' لیبیا کے کرنل قذافی اور متحدہ عرب امارات کے حکمران ان کی ذمہ

داری لینے کو تیار ہیں۔"

۔"بھٹو ایک اچھے سٹیٹس مین (Statesman) ہیں اور ایک بڑی جماعت کے مقبول لیڈر ہیں۔ ہمیں کل ان کی ضرورت پڑے گی۔"

۔"ہمارے جوانوں اور افسروں کا کیا ردعمل ہوگا' میں اس کی ضمانت نہیں دیتا۔ آپ نے دیکھا ہے کہ تھوڑا عرصہ پہلے اسی لاہور میں تین بریگیڈئر اور ان کی کمان نے احتجاجیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا۔ کل اگر احتجاج ہوتا ہے تو بہت شدید ہوگا۔ میرے ٹروپس (Troops) کا کیا ردعمل ہوگا' میں ذمہ داری کیسے لے سکتا ہوں؟

میری باتوں پر کور کمانڈر اس قدر ناراض ہو گئے کہ کانفرنس ختم کر دی اور اپنے چیف آف سٹاف' بریگیڈئر حمید گل کو بلایا اور حکم دیا:

"فوراً مجھے چیف سے ملاؤ۔ میں ایسے آفیسر کو اپنی فارمیشن میں نہیں رکھ سکتا۔"

بریگیڈئر حمید گل نے کہا:

"سر' اگر اجازت ہو تو میں رپورٹ تیار کرلوں جو چیف کو بھیج دی جائے تاکہ وہ خود فیصلہ کریں۔ فوراً کوئی ردعمل دینا مناسب نہ ہوگا۔"

کور کمانڈر نے بات مان لی اور چیف کو رپورٹ بھیج دی گئی مگر جنرل ضیاء الحق کی طرف سے فوراً کوئی ردعمل نہیں آیا لیکن شان کریمی دیکھئے کہ چند ماہ بعد مجھے جی ایچ کیو میں چیف آف جنرل سٹاف (CGS) تعینات کر دیا گیا۔ میں نے حق اور اصول کی بنیاد پر بھٹو کو پھانسی دینے کے فیصلے سے اختلاف کیا تھا۔ اگر بھٹو کو پھانسی نہ دی گئی ہوتی تو وہ تمام سیاسی ابتری جو دیکھنے میں آئی' نہ ہوتی۔ مثلاً' نہ جنرل ضیاء کا حادثہ ہوتا' نہ جنرل مشرف کی حکومت ہوتی' نہ بے نظیر کا قتل ہوتا۔

مجھے اختلاف رائے پر مزید اطمینان ہوا جب میں نے ایک سفارتکار جناب ایس ایم قریشی کا ایک مضمون پڑھا۔ وہ لکھتے ہیں: "بھٹو کو پھانسی دیے جانے کے دو سال بعد مجھے

یاسر عرفات سے معاملات سلجھانے کے لیے بھیجا گیا۔ وہ بھٹو کو پھانسی دیے جانے پر سخت ناراض تھے۔ میں ان سے ملنے گیا تو انہوں نے بتایا کہ جنرل ضیاء نے مسجد الحرام میں بیٹھ کر شاہ خالد کی موجودگی میں وعدہ کیا تھا کہ وہ بھٹو کو پھانسی نہیں دیں گے۔ انہوں نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا۔

انہی دنوں ہم ڈویژن کا ریزنگ ڈے (Raising Day) منانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ جنرل ضیاء نے اس تقریب میں شمولیت کے لئے رضامندی کا اظہار کیا تھا لیکن کہلا بھیجا کہ وہ نہیں آ رہے۔ دو دن بعد بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ میں نے ریزنگ ڈے کے حوالے سے ہونے والی تقریبات منسوخ کر دیں' صرف بڑا کھانا ہوا جس کا ماحول بہت افسردہ تھا جو میں آج تک نہیں بھول سکا۔

میں منتظر تھا کہ اب جنرل ضیا میرے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔ اسی انتظار میں چھ ماہ گزر گئے اور میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میری پوسٹنگ جنرل ہیڈکوارٹر (GHQ) میں چیف آف جنرل سٹاف (CGS) کے عہدے پر ہوئی۔ یہ میرے اور کئی اور لوگوں کے لیے باعث حیرت تھی۔ شاید کچھ لوگ اس سے اختلاف کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ جنرل ضیاء نپولین جیسی فہم وفراست کے مالک تھے جو خود پر تنقید کرنے والوں کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ شاید جنرل ضیاء بھی مجھے اسی لیے اپنے قریب چاہتے تھے کہ میری بے لاگ، مخلصانہ اور حقیقت پسندانہ رائے سے فائدہ اٹھا سکیں۔ جیسا کہ آئندہ صفحات سے ظاہر ہوگا۔ سچ ہے کہ سچائی کا پھل چاہے دیر سے پکے لیکن ہوتا ہمیشہ میٹھا ہے۔

باب چہارم

فوج کے اعلیٰ سلسلہ اختیارات میں شمولیت

4اپریل کی صبح بھٹو کو پھانسی دے دی گئی۔ کوئی بڑا ردعمل دیکھنے میں نہیں آیا۔ صوبہ سندھ اور خصوصاً لاڑکانہ میں دکانیں بند رہیں لیکن زندگی معمول کے مطابق رواں دواں رہی۔ میں نے بھٹو کو پھانسی دینے کی مخالفت کی تھی جس پر کور کمانڈر ناراض ہو گئے تھے۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ کب میری پوسٹنگ آتی ہے اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ مجھے قبل از وقت ریٹائر کر دیا جاتا۔ اسی کشمکش و پیچ میں کئی ماہ گذر گئے کہ سال کے آخر میں پوسٹنگ آ ہی گئی جو بالکل غیر متوقع تھی۔

میں جی ایچ کیو میں چیف آف جنرل سٹاف (CGS) پوسٹ ہوا جو سب سے سینئر پرنسپل سٹاف آفیسر (PSO) کی پوزیشن ہے لیکن مجھے یقین آ گیا کہ میں نے حق بات کی تھی اور حق نے مجھے سرخرو کیا ہے۔ 5 سال میں سی جی ایس کی پوسٹ پر رہا۔ یہ عرصہ میری زندگی کا سب سے اہم اور اطمینان بخش دور تھا۔ آرمی چیف کی طرف سے مجھے کھلی آزادی ملی کہ میں فوج کو جدید ترین خطوط پر استوار کر سکوں' پرانے ہتھیاروں کو جدید ترین ہتھیاروں سے بدل سکوں اور فوج کی دفاعی پالیسی نئے انداز سے مرتب کر سکوں۔ اس کی تفصیلات بعد میں بیان کروں گا۔

جی ایچ کیو میں کئی پرنسپل سٹاف آفیسرز ہوتے ہیں جو چیف آف آرمی سٹاف کے دست و بازو ہوتے ہیں اور فرائض کی ادائیگی میں انہیں مشاورت و معاونت فراہم کرتے ہیں۔ ایڈجوٹنٹ جنرل (AG) جو فوج میں افرادی قوت کی فراہمی' ان کی فلاح و بہبود اور نظم و ضبط قائم رکھنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ملٹری سیکرٹری (MS) افسروں کے کیریئر پلاننگ اور

پوسٹنگ کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ کوارٹر ماسٹر جنرل (QMG) فوج میں ضروریات زندگی کی فراہمی' رہائش اور سرکاری عمارات کی تعمیر' فراہمی اور انتظامی معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ انسپکٹر جنرل ٹریننگ اینڈ ایویلیوایشن (IGT&E) فوج میں تعلیم و تربیت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ تمام تعلیمی ادارے ان کے ماتحت ہوتے ہیں۔ سینئر ترین پرنسپل سٹاف آفیسر' چیف آف جنرل سٹاف ہوتا ہے جو آپریشنل معاملات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ ملٹری انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ بھی انہی کے ماتحت ہوتا ہے اور آرمی چیف کے رابطہ کار (Coordinator) کا کام کرتا ہے۔ ہر ہفتہ تمام ڈائریکٹروں کی کانفرنس میں آرمی چیف کے احکامات پر عمل درآمد کا جائزہ لیتا ہے۔

مجھے سی جی ایس بنے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ ایران عراق جنگ پر کیبنٹ میٹنگ بلائی گئی اور مجھے وفاقی کابینہ کے اس اہم اجلاس میں شرکت کرنے کا حکم ملا جس میں عراق' ایران کے مابین شروع ہونے والی جنگ میں پاکستان کے کردار کے بارے میں غور و فکر کرنا تھا۔ اس اجلاس میں نئے اور پرانے سفارتکار بھی شریک تھے۔ جنگ شروع ہوئے دو دن ہوئے تھے' جس کے نتائج کے حوالے سے پالیسی فیصلے کرنے تھے۔ کوئی تین گھنٹے تک تفصیلی بحث ہوئی' اکثریت کی رائے تھی کہ چند ہی دنوں میں عراق کی فوج ایران کے بیشتر علاقوں پر قابض ہو جائے گی' ایران جنگ ہار جائے گا' جنگ بندی ہوگی اور دونوں ممالک کے درمیان امن قائم رکھنے کے لئے اقوام متحدہ کی فوج تعینات کی جائے گی اور زیادہ امکان اس بات کا تھا کہ اس کے لئے پاک فوج کا انتخاب کیا جائے گا جس کے لئے ہمیں ابھی سے تیاری کر لینی چاہیے۔ جب سب شرکاء اپنی بات کہہ چکے تو میں نے درخواست کی کہ مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔ صدر نے مجھے اجازت دی تو میں نے کہا:

۔چین کے ایک دانشور کا قول ہے کہ" کسی انقلابی سے مت ٹکراؤ' جب تک تمہیں یقین نہ ہو کہ تمہارے نظریات انقلابی کے نظریات سے بہتر اور اعلیٰ ہیں۔"

صدام کے بعثی (Bathist) نظریات' ایران کے اسلامی نظریات کے مقابلے میں بہت کم تر ہیں۔ صدام ہار جائے گا۔

۔یہ جنگ چند دنوں' ہفتوں یا مہینوں میں ختم نہیں ہوگی بلکہ کئی سالوں تک چلے گی اوراس میں لاکھوں لوگ مارے جائیں گے۔

۔ایرانیوں کی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی ان پر حملہ ہوا ہے وہ باہمی اختلافات بھلا کر حملہ آور کے خلاف سینہ سپر ہوئے ہیں۔

۔آج شہنشاہ کی فوج بیرکوں میں قید ہے لیکن وہ جلد نکلے گی' سرحدوں پر پہنچے گی اور دشمن کا مقابلہ کرے گی اور ایرانی انقلابی گارڈ زاپنی فوج کی حمایت میں اندرون ملک انقلاب کو مستحکم بنائے گی اور اس کے خلاف جو سازشیں ہورہی ہیں وہ ناکام ہوں گی۔

۔عراق کی فوج عسکری سازوسامان کے حوالے سے مضبوط ضرور ہے لیکن اس کی اعلی قیادت کمزور ہے۔وہ جرمن جنرل اسٹاف کی طرح نہیں ہے کہ جس نے دوسری جنگ عظیم میں فرانس کی دفاعی لائن عبور کر کے چند ہفتوں میں فرانس کے شہرڈنکرک کا علاقہ فتح کرلیا تھا۔

۔یہ جنگ سرحدوں تک محدود رہے گی لیکن دونوں طرف بڑی ہلاکتیں ہوں گی۔

۔عراق کا بنیادی مقصد ہے کہ چند دنوں میں ایران کو شکست دے دے لیکن یہ ممکن نہیں ہے اور جب جنگ طویل ہوگی تو بنیادی مقصد فوت ہو جائے گا اور بے مقصد جنگ ناکام ہوگی۔اس کے برعکس ایران ایک بامقصد جنگ لڑ رہا ہوگا' یعنی جارحیت کا ارتکاب کرنے والے دشمن کو شکست دینا' اور وہی کامیاب ہوگا۔

۔میرا مشورہ ہے کہ دونوں امکانات کو ذہن میں رکھ کے پالیسی بنائی جائے' یعنی ایک طویل جنگ کے لئے جس میں ایران کامیاب ہوگا اور ایک چند دنوں اور ہفتوں کی جنگ جس میں عراق کامیاب ہوگا۔

۔جنرل ضیاء تھوڑی دیر سوچتے رہے پھر بولے" جنرل بیگ کی باتوں میں بڑا وزن ہے۔ہمیں دونوں امکانات کی بنیاد پر پالیسی بنانی چاہیے" اور اسی فیصلے پر عمل ہوا۔

ایران' عراق جنگ کو دو سال ہو چکے تھے۔اسی دوران مجھے ایران سے جنگی ہتھیاروں کے سپئر پارٹس اوردوسرے سامان کی ایک فہرست ملی جس کی ایران کو اشد ضرورت تھی۔ میں

نے وہ فہرست جنرل ضیاء کو پیش کی اور انہوں نے اس پر غور کرنے کا وعدہ کیا۔ کچھ عرصہ بعد ایرانی صدرعلی اکبر ہاشمی رفسنجانی پاکستان کے دورے پر آئے۔ان کے آنے کا بڑا مقصد اس معاملے پر پیش رفت کا جائزہ لینا تھا۔ ہماری جانب سے وعدے تو کئے گئے لیکن ان کی پاسداری نہیں کی گئی۔ جناب رفسنجانی کے رفقاء میں سے ایک نے اپنی ضرورت کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و درماندگی

لیکن افسوس کہ امریکہ کی خوشنودی میں ہم نے ایران کے ساتھ حق دوستی ادا نہ کیا۔

ابھی اجلاس جاری تھا کہ مغرب کی اذان کا وقت ہوگیا۔ جنرل ضیاء نے صدر ہاشمی رفسنجانی سے نماز پڑھانے کی درخواست کی اور انہوں نے عین اسی طرح نماز پڑھائی جس طرح ہم پڑھتے ہیں۔اس اجلاس کا میڈیا میں بہت چرچا ہوا اور ایسا تاثر دیا گیا کہ ہم ایران کو ایٹمی ٹیکنالوجی منتقل کر رہے ہیں۔ چند صحافیوں اور نیم دانشوروں نے' جن میں حسین حقانی سرفہرست تھے' اس حد تک افواہیں پھیلا دیں کہ پاکستان سے ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کے لیے ایران' پاکستان کو دس بلین امریکی ڈالر دینے پر آمادہ ہے اور یہ کام اسلم بیگ کی معاونت سے ہورہا ہے۔یہ محض افواہیں تھیں۔

یہ جنگ آٹھ سال تک جاری رہی جس میں لاکھوں لوگ ہلاک ہوئے۔سلامتی کونسل میں جنگ بندی کرانے کے لئے ایک قرارداد بھی پیش ہوئی جس میں دونوں ممالک سے فوری طور پر جنگ بند کر کے افہام وتفہیم کے ذریعے اپنے معاملات سلجھانے کی تجویز پیش کی گئی تھی لیکن ایرانی نمائندے کا موقف تھا کہ دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکنے کی بجائے یہ طے کیا جائے کہ جارحیت کا ارتکاب کس نے کیا ہے اور اگر یہ طے ہو جائے کہ عراق جارح ہے تو اس کی مذمت کی جانی چاہیے۔سلامتی کونسل کا اجلاس قرارداد منظور کئے بغیر ملتوی ہوگیا۔

اس معاملے میں اسلامی ملکوں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ وہ دشمن طاقتوں کے

خلاف متحد ہوتے جو ایک ایک کر کے اسلامی ملکوں کو تباہ کر رہے تھے۔ لیبیا، یمن، سوڈان اور صومالیہ کو وہ تباہ کر چکے تھے۔ عراق ایران جنگ شروع ہوئی تو امریکہ کے سیکرٹری برائے امور خارجہ ہنری کسنجر نے کہا تھا "میری خواہش ہے کہ دونوں ملک باہم لڑ کر ایک دوسرے کو ختم کر دیں۔"

اسلامی ملکوں کا ایک اجلاس سعودی عرب کے شہر طائف میں منعقد ہوا اور اس میں جنرل ضیاء الحق کی سربراہی میں نو افراد کی ایک کمیٹی بنائی گئی تا کہ وہ دونوں ملکوں کی قیادت سے رابطہ کرے اور جنگ بند کرانے کی کوشش کریں۔ 28 دسمبر 1980ء کو جنرل ضیاء دوران جنگ ہی تہران کے مہر آباد ہوائی اڈے پر اترے۔ اسلامی کانفرنس کے جنرل سیکرٹری تیونس کے حبیب شطی بھی آئے۔ وہ صدر ابوالحسن بنی صدر، امام روح اللہ خمینی اور دوسرے رہنماؤں سے ملے۔

ایرانی رہنما آیت اللہ خمینی نے انہیں سورۃ الحجرات کی آیت سنائی جس کا مفہوم یہ ہے کہ "اگر مسلمانوں کے درمیان لڑائی ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرادو، پھر اگر ایک نے دوسرے پر جارحیت کا ارتکاب کیا ہو تو اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کو مان لے۔ پھر ان میں عدل کے ساتھ صلح کرادو۔" ان کا کہنا تھا کہ عراق نے ہمارے خلاف جارحیت کا ارتکاب کیا ہے تو آپ اس جارحیت کی مذمت کریں اور اس کے خلاف ہمارا ساتھ دیں۔ ایرانی رہنماؤں سے ملاقات کے بعد جنرل ضیاء کویت کے راستے بغداد گئے اور صدر صدام حسین سے ملاقات کی لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہ نکلا اور جنگ آٹھ سال تک جاری رہی۔

آخر کار ایران نے شط العرب عبور کر کے اپنی فوج فاو کے علاقے میں جمع کی اور بصرہ کی سمت پیش قدمی شروع کی تھی کہ صدام نے کیمیکل ہتھیاروں سے حملہ کیا اور چشم زدن میں ہزاروں لوگ ہلاک ہو گئے۔ یہ کیمیکل ہتھیار صدام کو مغربی دنیا نے دیے تھے۔ ایران کے پاس کیمیکل ہتھیاروں کے خلاف دفاعی صلاحیت نہ تھی لہٰذا سیز فائر ہوا اور جنگ ختم ہو گئی۔ ایک سازش کے تحت کہ پاکستان اس جنگ میں شامل نہ ہو جائے، ملک میں فرقہ وارانہ

فسادات کرائے گئے اور جنگجو تنظیمیں بنانے کی اجازت دی گئی مثلاً سپاہ صحابہ، لشکر جھنگوی، سپاہ محمد وغیرہ جنہیں جنگ ختم ہونے پر دہشت گرد قرار دے کر ہم نے اپنے سروں پر دہشت گردی کی ایک نئی تلوار لٹکا لی ہے۔

امریکہ نے 1979ء سے لے کر اب تک ایران کے خلاف تمام حربے استعمال کر لئے، معاشی اور اقتصادی اعتبار سے اس کی معیشت کو مفلوج کرنے کی تمام سازشیں کر لیں لیکن ایرانی قوم نے بڑی ہمت اور دانشمندی سے ان سازشوں کا مقابلہ کیا اور آگے ہی بڑھتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ آج اس کا اثر و رسوخ ایران سے آگے شام، عراق، بحرین، لبنان، یمن اور افغانستان تک پھیل چکا ہے جس کی وجہ سے امریکہ اور اس کے اتحادی پریشان ہیں۔ اسی خطرے کے خلاف وارسا (Warsaw) میں امریکہ، اسرائیل، بھارت اور سعودی عرب نے حال ہی میں ایران کے خلاف بھرپور اقدامات کرنے کی حکمت عملی بنائی ہے اور اس پر عمل درآمد بھی شروع ہو چکا ہے۔

سوال:...... پاکستانی فوج کا ترویجی پروگرام اور اس پر عمل درآمد حیران کن ہے۔ یہ کیسے ممکن ہوا؟

جواب:...... میں خوش قسمت تھا کہ جنرل ضیاء کی سرپرستی میں وائس چیف آف آرمی سٹاف فوج کی انتظامی و انصرامی ذمہ داریاں سنبھالتے تھے اور میں بطور چیف آف جنرل سٹاف فوج کے ترویجی پروگرام پر توجہ مرکوز رکھتا تھا۔ مجھے بڑا مختصر اور واضح مشن ملا تھا:

> "فوج کی ترتیب نو اس انداز سے کی جائے کہ وہ 2000ء کی مدت سے آگے تک ہماری فوج ملک کے بیرونی اور اندرونی خطرات سے نمٹنے کی بھرپور صلاحیت حاصل کر لے۔"

اس مشن کے تحت ہم نے اپنے کام کا آغاز کیا جبکہ ہمیں وائس چیف آف آرمی سٹاف (VCOAS)، جنرل سوار خان اور ان کے بعد جنرل خالد محمود عارف کی مکمل ہدایات اور سپورٹ حاصل رہی۔ ان کی سرپرستی ہماری کامیابی کی ضمانت بنی۔

1980ء کے آغاز میں ہم نے اپنے وائس چیف آف جنرل سٹاف (VCGS) میجر جنرل محمد افضال کی سربراہی میں آرمی ماڈرنائزیشن کمیٹی بنائی اور انہیں اختیار دیا کہ تجویز بنانے میں متعلقہ حاضر و ریٹائرڈ سینئر آفیسرز سے ضرور رجوع کریں اور فوج کے تربیتی و تعلیمی اداروں سکول آف انسٹرکشن (Schools of Instructions) کے سربراہوں سے بھی مشورہ کریں۔ انہوں نے ڈیڑھ سال کی انتھک محنت کے بعد تجاویز مکمل کیں اور انہیں حتمی شکل دینے سے پہلے پی ایس اوز (PSOs) کانفرنس میں اس کی تفصیلی پریذنٹیشن (Presentation) دی۔ بحث و تمحیص کے بعد کمزوریوں کو دور کر کے حتمی شکل دی گئی اور اس پوری منصوبہ بندی کو جنرل ضیاء کے سامنے پیش کیا گیا اور ان سے منظوری لی گئی۔ اس طریقہ کار کا فائدہ یہ ہوا کہ جتنی بھی تجاویز پر عمل شروع ہوا ان میں ہمارے متعلقہ آفیسرز کا مشورہ شامل رہا اور اس طرح ماڈرنائزیشن پروگرام کے حوالے سے چودہ مختلف کانسپٹس (Concepts) بھی وضع کیے گئے جن کا عملی تجربہ ضرب مومن مشقوں کے دوران کیا گیا اور انہیں قابل عمل پایا گیا۔

1981ء میں فوج کے ترقیاتی پروگرام پر عمل درآمد کا آغاز ہوا۔ آرمی ماڈرنائزیشن کمیٹی کی تجاویز کے تحت فوج کے اندر متعدد Structural اصلاحات لائی گئیں۔ ان اصلاحات میں سے ایک اہم اصلاح آرمی ائر ڈیفنس کمانڈ کا قیام تھا جو ایسے عمل میں آیا کہ فیلڈ آرٹلری اور ائر ڈیفنس آرٹلری کو الگ کر دیا گیا اور اس طرح ہماری ہر سٹرائیک فورس کو ایک آرٹلری ڈویژن کے ساتھ ساتھ Dedicated ائر ڈیفنس ڈویژن کی سپورٹ حاصل ہوئی جسے نئے میزائلوں اور ہتھیاروں سے مسلح کیا جا چکا ہے۔ اس ائر ڈیفنس سپورٹ سسٹم کو منظم کرنا ایک پیچیدہ کام تھا جو میجر جنرل آغا مسعود الحسن کی کمان میں مکمل ہوا۔ فوج کی صلاحیت کو ہر ممکن طریقے سے نئی جہت دی گئی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ ہماری جنگی حکمت عملی جو دفاعی حکمت عملی تھی، وہ جارحانہ دفاعی حکمت عملی میں تبدیل ہو چکی ہے اور یہی وہ صلاحیت ہے جو ایک مضبوط اور قابل اعتماد مزاحمت (Deterrence) کی بنیاد ہے۔

سوال:..... فوج میں افسروں کی اعلیٰ تعلیم کا دور 1971ء کی جنگ کے بعد شروع ہوا جو اہم صلاحیت تھی۔ اس نئی صلاحیت سے آپ کے ترقیاتی پروگرام کو کیا سپورٹ ملی؟

جواب:...... فوج کو دور حاضر کے تقاضوں کے تحت منظم اور مضبوط بنانے میں وار کالج (War College) کے پانچ سال کا اعلیٰ تعلیمی دور میرے لئے بڑا اہم تھا، اس لئے کہ میرے فیلڈ کمانڈر اور اسٹاف افسران جو وار کورس کے تعلیم یافتہ تھے، میرے اس مشن میں بڑے معاون و مددگار ثابت ہوئے۔ ہم نے "آرمی ماڈرنائزیشن پروگرام برائے سال 2000ء اور اس سے آگے" پر کام شروع کیا اور اٹھارہ مہینوں کی محنت سے ایک جامع منصوبہ تیار کر لیا۔ میرے فارمیشن کمانڈرز، اداروں کے سربراہوں اور اسٹاف افسروں نے تمام منصوبے بنائے اور مختلف کانسپٹس (Concepts) وضع کئے جو سب کے سب قابل عمل ثابت ہوئے۔

ہمارا طریقہ کار یہ تھا کہ بتدریج ہم اپنے ترقیاتی پروگرام مرتب کر کے مرحلہ وار تمام سفارشات چیف آف آرمی سٹاف کے سامنے پیش کر کے منظوری لیتے تھے۔ یہاں تک تو کام آسان تھا لیکن مشکل اس وقت پیش آئی جب اپنے پروگرام کو مکمل کرنے کے لیے ہتھیاروں اور جنگی سازوسامان کی فراہمی کا مسئلہ درپیش ہوا۔ سب سے پہلے اپنی ٹیم لے کر میں امریکہ گیا لیکن امریکہ زیادہ تر اپنا پرانا سامان بیچنے میں دلچسپی رکھتا تھا اور تکنیکی مہارت دینے پر تیار نہ تھا۔ یہی حال یورپی ممالک کا بھی تھا۔ بالآخر ہم نے چین کا رخ کیا اور چین ہمارا قابل اعتماد دوست ثابت ہوا۔ دراصل اللہ تعالیٰ نے ایسی آسانیاں مہیا کر دیں جس سے میرا کام آسان ہوتا گیا، مثلاً:

- پی او ایف واہ کے چیئرمین لیفٹیننٹ جنرل صبیح قمر الزمان نے نئی ٹیکنالوجی اور اس کی ڈیویلپمنٹ کی پوری ذمہ داری اٹھالی اور بغیر کسی دفتری رکاوٹ کے، کام کی رفتار تیز رہی۔ وزارت دفاع سے ہمیں پوری سپورٹ ملی۔ جنگی سامان کی رقم کی ادائیگی میں کوئی مشکل نہ ہوتی۔
- چین نے دوستی کا حق ادا کیا۔ ہماری ضروریات پوری کیں، جدید ٹیکنالوجی دی،

فراہم کردہ ہتھیاروں اور ٹیکنالوجی کو استعمال کرنے کی مہارت دی اور ہمارے افسروں اور جوانوں کو تربیت دی۔ صحیح معنوں میں اس تعاون سے دونوں ملکوں کے درمیان تذویراتی محور (Strategic Pivot) قائم ہوا جس کی بنیاد پر اب سی پیک (CPEC) کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔

اس طرح چین کے ساتھ ہماری دفاعی شراکت کی بنیاد پڑی اور ہماری جنگی صلاحیت میں اضافہ ہوا۔ چین کے ساتھ ہماری دفاعی شراکت مثالی ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد نوعیت کی بھی ہے۔ اسی شراکت کی بدولت ہماری مسلح افواج اور بالخصوص بری فوج 1971ء کی جنگ کے بعد اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ ہمیں اپنی فوج کی کمزوریوں کو دور کرنے اور مستقبل میں مسلح افواج کو جدید تقاضوں کے مطابق ترقی دینے کی شدید ضرورت تھی۔ خوش قسمتی سے 1980ء کا یہ وہ وقت تھا جب بری فوج کو مستقبل کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے ہماری عسکری قیادت اعلیٰ عسکری تعلیم سے مزین تھی اور ساتھ ہی ہمیں چین کی غیر مشروط مدد بھی حاصل تھی جسے ہم رحمت ایزدی سمجھتے ہیں۔ یہی وہ عوامل تھے جن کی بدولت پاکستانی فوج دنیا کی جدید ترین فوج بننے کے اہداف حاصل کر سکی اور نوے فیصد تک خود انحصاری حاصل ہوئی۔ جنگ لڑنے کی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ اگر ہم پر جنگ مسلط کی گئی تو نہ صرف کافی دیر تک اپنا دفاع کر سکتے ہیں بلکہ مؤثر جارحانہ کاروائی کے عمل سے دشمن کے منصوبوں کو ناکام بنا سکتے ہیں۔ الحمد للہ ہماری مسلح افواج جدید ترین لڑاکا قوت ہیں جن کا شمار دنیا کی بہترین مسلح افواج میں ہوتا ہے۔

چینی دوستوں کی فراخدلی مثالی ہے۔ ایک دلچسپ حقیقت ہے جو میں بیان کرنا چاہوں گا۔ 1982ء کے اوائل میں ہم نے مطلوبہ سامان کی تلاش کے لئے چین کا پہلا دورہ کیا۔ ہمارے پاس مطلوبہ سامان کی ایک فہرست تھی اور ہمیں 600 ملین ڈالر کے اندر رہتے ہوئے خریداری کرنی تھی۔ ہماری چینی حکام کے ساتھ تین ملاقاتیں ہوئیں اور ہمیں بتایا گیا کہ معاملات کو حتمی شکل دینے کے لئے ہم چار ہفتوں بعد دوبارہ آئیں۔ اگلے ماہ ہم پھر چین جا

پہنچے جہاں ہمارا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور ہمیں ایک کانفرنس روم میں لایا گیا جہاں سول کپڑوں میں ملبوس متعدد چینی بزرگ ہستیاں ہماری منتظر تھیں۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا:

''کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ آپ ہمیں غلط جگہ پر لے آئے ہیں؟

''نہیں' بلکہ ہم آپ کو اپنی معروف دفاعی پیداواری کمپنیوں کے سربراہوں سے ملاقات کے لئے یہاں لائے ہیں جو آپ کو بتائیں گے کہ ان کے پاس آپ کو دینے کے لئے کیا کچھ ہے۔

اور کب تک وہ آپ کو مطلوبہ سامان حرب دے سکیں گے۔''

ہمیں اطمینان ہوا اور اجلاس شروع ہوا۔ سامان کی فہرست جو ہم نے گذشتہ ماہ ان کے حوالے کی تھی اس پر بات چیت کرنے میں ایک گھنٹہ لگا اور وہ ہمارا تمام مطلوبہ سامان بغیر کسی پیشگی شرط کے دینے پر رضا مند ہو گئے۔ ہم نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پیشتر اس کے کہ ہم رخصت ہوتے' ہمارے میزبان نے پوچھا:

''کیا آپ کو یہی کچھ چاہیے تھا یا کچھ اور بھی ہے؟''

میں نے جواب دیا:

''ہمیں چاہیے تو اور بھی بہت کچھ لیکن ہمیں اپنے وسائل کے اندر رہ کر خریداری کرنی ہے' یعنی 600 ملین ڈالر' جو ہمیں فراہم کئے گئے ہیں۔''

''ٹھیک ہے' لیکن ہم آپ کے مطلوبہ سامان کی فہرست دیکھنا چاہیں گے۔''

میں نے فہرست نکالی اور ایک ایک آئٹم (Item) پر بات شروع ہوئی۔ ہمارے چینی دوستوں نے ہر مطالبے کو خوش دلی سے قبول کیا لیکن جب حساب کتاب کیا گیا تو معاملہ 1.7 بلین ڈالر تک جا پہنچا۔

میں نے کہا:

''ہم اتنی بھاری رقم کیسے ادا کریں گے؟''

ہمیں جواب ملا:

''آپ اپنی سہولت کے مطابق جیسے چاہیں آئندہ پچیس برسوں میں برائے نام سروسز چارجز کے ساتھ ادائیگی کریں۔''

ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی اور پورے اعتماد کے ساتھ وطن واپس لوٹے اور کامیابی کی کہانی چیف آف آرمی سٹاف اور ساتھیوں کو سنائی۔ ہماری زندگی کا یہ ایک یادگار دن تھا۔

ہماری خود انحصاری کے حصول کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے جب فوج میں ٹیکنالوجی کی منتقلی' خود انحصاری' اسلحہ سازی کے نظام کی وسعت' ہتھیاروں اور میزائل کے نظام کی ترقی اور ملکی سطح پر انجینئرنگ کے شعبہ کی ترقی کے نئے دور کا آغاز ہوا' جس کی بدولت ایک دہائی سے بھی کم مدت میں ہم نے بھرپور صلاحیت حاصل کر لی۔ جہاں مشکل پیش آئی وہاں عظیم سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی زیر قیادت ماہر سائنسدانوں کی ایک بڑی جماعت موجود تھی جو ہر پروگرام کو پایہ تکمیل تک پہنچاتی رہی۔

1988ء میں ہم نے الخالد ٹینک کا تجربہ کیا جس نے ''پانچ تجرباتی مراحل'' میں امریکہ کے بہترین ٹینک' ایم ون اے ون (M1A1)' کو مات دی۔ اسی طرح ہم نے اعلیٰ تکنیکی ہتھیاروں' عسکری سازوسامان اور گولہ بارود تیار کرنے کے میدان میں نوے فیصد (90%) تک خود انحصاری حاصل کر لی جو ایک خواب تھا' جس کی تعبیر چین کی عسکری قیادت اور اس کی دفاعی پیداواری صنعتوں کی غیر مشروط مدد سے ممکن ہوئی۔ کوئی اور ملک اس حد تک ہماری مدد نہیں کر سکتا تھا کیونکہ ان کا مفاد محض فوجی سازوسامان فروخت کر کے پیسے بنانا ہوتا ہے۔

سوال:۔۔۔۔۔ چین نے جس طرح ہماری توقع سے بڑھ کر مدد کی' اس کے بارے کچھ کہنا چاہیں گے؟

جواب:۔۔۔۔۔ چین کے عوام انتہائی مخلص اور کھلے دل کے لوگ ہیں۔ انہوں نے کبھی ہماری اندرونی سیاست میں دخل اندازی نہیں کی' نہ ہی وہ ہماری حکومتوں کو گرانے اور بنانے کے مکروہ کھیل میں ملوث ہوئے ہیں اور نہ ہی ہماری فوجی یا سویلین حکومتیں ان کی ترجیحات

میں شامل رہی ہیں۔ ان کی واحد ترجیح پاکستانی عوام کی بھلائی ہے' اور یہی وہ تعلق ہے جس کی وجہ سے دونوں ممالک کے عوام ایک دوسرے کا دل کی گہرائیوں سے احترام کرتے ہیں' ایسا احترام جو کسی اور ملک کے نصیب میں نہیں ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اسی دفاعی اشتراک نے ہمیں الخالد جیسا ٹینک' کثیر الجہتی کردار کا حامل جے ایف-17 تھنڈر طیارہ اور جدید ترین فریگیٹ ایف 22 بحری جہاز دیے ہیں اور ایٹمی سب میرین بنانے کا کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ اسی تعلق کی بنیاد پر آج پاک چین اقتصادی راہداری (CPEC) کے منصوبے کی عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ یہ کامیابی نہ صرف پاکستان کے لئے ترقی و امن کی ضمانت' بلکہ پورے خطے کی اقتصادیات میں انقلاب لانے کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

دو ملکوں کے اشتراک سے ہمارا تذویراتی محور قائم ہوا۔ عسکری تعاون کا یہ عمل ایک تذویراتی حقیقت ہے جو دشمنوں کے عزائم کے خلاف ایک مضبوط چٹان ہے' قومی سلامتی اور ترقی و کمال کی ضمانت بھی ہے۔ دونوں ملکوں کا یہ اشتراک ہمارا تذویراتی محور Strategic (Pivot) ہے۔ الحمدللہ' ہم نے اب وہ صلاحیت حاصل کر لی ہے جس کی بدولت اپنی تذویراتی سوچ کو جنگی منصوبوں سے ہم آہنگ کیا ہے' یعنی پہلے حملہ کرنے (Pre-emption) اور جارحانہ دفاع کی صلاحیت (Offensive Defence) میں حقیقت کا رنگ بھرنے اور حریف قوت کے خلاف فیصلہ کن جنگ لڑنے کی صلاحیت جیسے اہداف حاصل کئے ہیں۔ یہ ایسی صلاحیت ہے جو بذات خود ''مزاحمت'' بھی ہے اور جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی فتح یاب ہونے کی نوید بھی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر ٹیکنالوجی پر کام شروع ہوا۔ ڈاکٹر اکرم چوہدری (مرحوم) جو چکری گاؤں سے تعلق رکھتے تھے' ان کا امریکہ کی سلکون ویلی Silicon Valley میں بڑا کاروبار تھا' ان سے معاہدہ ہوا۔ میں ایران گیا اور وہاں سے چند چھوٹے ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی جو ہمارے پاس نہیں تھی وہ لے آیا۔ اس طرح کوئی گیارہ مختلف پراجیکٹس (Projects) پر کام جاری رہا۔ اسی دوران ایک مربوط منصوبے کے تحت ہم نے مختلف مضامین میں جو ہمارے

ترقیاتی پروگرام کے لئے ضروری تھے' اپنے آفیسرز کو امریکہ اور دوسرے ممالک میں تعلیم کے لئے بھیجا اور 1990ء تک گیارہ پی ایچ ڈی (Ph.D) اور 170 کے قریب ایم ایس سی (M.Sc) اور گریجوئس نے تعلیم مکمل کر لی۔

یہ سلسلہ اس کے آگے بھی جاری رہا۔ ہمارے نوجوان آفیسرز بڑے باصلاحیت ہیں' وہ بیرون ملک (Foreign) کورسز میں ٹاپ پوزیشن حاصل کرتے رہے جنہیں ہر چھ ماہ بعد میں خود انعام دیتا تھا۔ ان کی کارکردگی کی بدولت ہمارا ماڈرنائزیشن پروگرام صحیح معنوں میں نالج بیسڈ (Knowledge based) پروگرام بن گیا جس کی افادیت انشاءاللہ 2025ء تک قائم رہے گی۔ یقیناً ہمارے سائنسدان اور افسر اس پر مزید کام کرتے رہیں گے اور جدید ترین ٹیکنالوجی کو دفاعی نظام میں شامل کرتے رہیں گے اور انشاءاللہ پاک فوج ناقابل تسخیر رہے گی۔

جنرل ضیاء نے 1985ء میں ایک نیا سیاسی نظام لانے کا ارادہ کیا۔ ان کی حکومت کو 9 سال ہو چکے تھے جب انہوں نے ملک میں سیاسی نظام بحال کرنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے اور جنرل حمید گل کو یہ ذمہ داری دی کہ "ملک کے سیاسی ماحول کو نظر میں رکھتے ہوئے تجزیہ کیا جائے کہ سیاسی نظام کی بحالی کے لئے طریقہ کار کیا ہونا چاہیے اور کب اس پر عمل کیا جائے۔" ہم بیٹھ گئے' تفصیلی جائزہ لیا اور دو ہفتے بعد رپورٹ جنرل ضیاء کو پیش کر دی۔ انہوں نے ہمیں بلایا' بحث ہوئی' سفارشات پڑھیں جن کا خلاصہ یہ تھا:

"اب وقت آ گیا ہے کہ صاف ستھرے الیکشن کرا کے اقتدار عوامی منتخب نمائندوں کو منتقل کر دیا جائے' اس عمل سے قوم آپ کو اچھے الفاظ میں یاد رکھے گی۔"

کچھ دیر وہ سوچتے رہے' پھر بولے:

"چاہتے ہو کہ پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ہو۔"

میں نے کچھ معروضات پیش کرنا چاہیں لیکن اجازت نہ ملی۔ ہم خاموش ہو گئے۔

جنرل ضیاء نے غیر جماعتی بنیادوں پر انتخابات کرائے جن میں پاکستان پیپلز پارٹی نے

حصہ نہیں لیا اور محمد خان جونیجو کی حکومت قائم ہوئی۔

اسی دوران میری پوسٹنگ جی ایچ کیو سے پشاور 11 کور کمانڈر کی حیثیت سے ہو گئی۔ افغانستان پر روسی جارحیت کی وجہ سے اس کور کی بہت اہم ذمہ داریاں تھیں۔

1986ء میں بھارت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل کرشنا سوامی سندرجی نے براس ٹیک (Brasstack) مشقیں شروع کیں جو ان کی ویسٹرن کمانڈ کے ذمہ داری کے علاقے میں شروع ہوئیں جو ہماری مشرقی سرحدوں سے متصل ہے۔ ان مشقوں کے لئے ان کی نئی لاکھ فوج راجستھان میں مجتمع ہوئی۔ ہزاروں ٹینک اور بکتر بند گاڑیاں بھی سرحدوں کے قریب پہنچا دی گئیں۔ ان کے چند بحری جہاز بھی کورنگی کریک کے ارد گرد منڈلاتے پائے گئے۔ بھارتی عسکری قیادت کے مطابق ان مشقوں کے دو مقاصد تھے:

- ☆ وہ اپنے میکانکی دستوں کی صلاحیتوں کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔
- ☆ فضائیہ اور بحری دستوں کی مشترکہ مشقوں میں بری فوج کی صلاحیت پرکھنا چاہتے تھے۔"

سکیورٹی انفارمیشن کی ویب سائیٹ گلوبل سکیورٹی نے اسے دوسری جنگ عظیم کے بعد فوجوں کا سب سے بڑا اجتماع قرار دیا اور لکھا کہ نارتھ اٹلانٹک ٹریٹی آرگنائزیشن (نیٹو) کی کسی بھی فوجی مشق کا حجم براس ٹیک کے حجم کے برابر نہیں تھا۔ نیٹو کی قیادت کا خیال یہ تھا کہ گرچہ بھارت کی عسکری قیادت یہی کہتی رہی کہ وہ اپنے حربی منصوبوں میں نئی حکمت عملی کو آزمانے کے لیے ان مشقوں کا اہتمام کر رہے ہیں لیکن بھارتی فوج کے چند سینئر کمانڈروں نے ان مشقوں کے مقاصد کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی' جبکہ بھارتی آرمی چیف سندرجی کا بنیادی مقصد فوج میں تنظیمی اصلاحات اور نئے کانسپٹس (Concepts) کا تجزیہ کرنا تھا۔ ہماری انٹیلی جنس ایجنسیاں اور وزارت خارجہ بھی چوکس تھیں۔ وزارت خارجہ نے بھارتی سفیر ایس کے سنگھ کو طلب کیا۔ وزیر مملکت برائے امور خارجہ زین نورانی نے انہیں صدر پاکستان کی طرف سے یہ پیغام دیا کہ اگر پاکستان کی سلامتی کو کوئی خطرہ لاحق ہوا تو ہندوستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ یہ تھے وہ حالات جب جنرل ضیاء نے مشاورت کے لئے جی

ایچ کیو میں اجلاس طلب کیا۔

ہماری انٹیلی جنس کے نمائندوں کی متفقہ رائے تھی کہ صورت حال بہت خطرناک ہے۔ بھارت کی نیت خراب ہے اور اس کے لئے پاکستان کو فوری طور پر دفاعی اقدامات لینے چاہیئں۔ میں نے اس تجزیے سے اختلاف کیا اور اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ:

''بھارت کی اتنی بڑی فوج کا ایک جگہ اکٹھا ہونا دانشمندی نہیں ہے۔ یہ سارے انڈے ایک ہی ٹوکری میں رکھنے والی بات ہے۔ اس کے پیچھے کوئی جنگی مقاصد ہیں تو ہمیں چاہیے کہ راوی چناب کے دوآبے میں ہم اپنی جارحانہ فورس (Strike Force) بھیج دیں' اس سے بھارت کا کشمیر سے رابطہ منقطع ہو جائے گا اور پھر بھی ہمارے پاس اتنی صلاحیت موجود ہو گی کہ اپنی سرحدوں کی موثر حفاظت کر سکیں گے۔''

لیکن اکثریت کی رائے تھی کہ بھارت کی فوج پاکستان کے خلاف بھرپور جنگ کی تیاری کر چکی ہے لہٰذا اس سوچ کے تحت فوج کو آپریشنل پلان کے مطابق سرحدوں پر بھیج دیا گیا۔ سب سے پہلے 5 کور کو ڈیپلائے (Deploy) کیا گیا۔ بکتر بند دستے اور ٹینکوں کی یونٹیں ان کی زیر کمان کر دی گئیں۔ جنوبی فضائی کمان کو چوکس کر دیا گیا۔ پاک نیوی کے جنگی جہاز اور آبدوز اپنے ٹھکانوں سے نکل کر بحر عرب کے کھلے سمندر میں پہنچ گئیں۔ ان اقدامات کا ردعمل یہ ہوا کہ بھارت نے اپنی مشقیں روک دیں اور فوراً دو انفنٹری ڈویژن راوی چناب کاریڈور میں بھیج کر اسے محفوظ کر لیا۔

بھارت کے ان اقدامات سے یہ بات واضح ہوئی کہ سندر جی کا مقصد پاکستان کے خلاف جنگ کرنا نہیں تھا ورنہ اپنی مشقیں روکنے کی بجائے بھارتی فوج ہماری سرحدوں کی جانب چل پڑتی۔ ہماری اس حکمت عملی کے سبب ہمارا نقصان یہ ہوا کہ ہمارا وار پلان (War Plan) افشا ہو گیا۔

ریٹائرمنٹ کے کچھ سالوں بعد میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے ناروے (Norway) گیا۔ وہاں جنرل سندر جی بھی مدعو تھے۔ ان سے بڑی دلچسپ باتیں ہوئیں۔

لوگ حیران تھے کہ یہ دونوں گتھم گتھا ہونے کی بجائے مسلسل باتوں ہی میں لگے ہوئے ہیں۔ براس ٹیک مشقوں کے متعلق انہوں نے خود واضح کیا کہ ''جنگ ہمارا مقصد نہیں تھا۔ ہمیں تو تنظیمی اصلاحات کا تجربہ کرنا تھا' سالہا سال کے جمود کے بعد یہ مشقیں ضروری تھیں۔''

روس نے 1980ء میں افغانستان پر حملہ کیا جو اس کی تذویراتی مجبوری تھی کیونکہ تمام تر جغرافیائی وسعت کے باوجود اس کے پاس کوئی ایسی بندرگاہ نہیں ہے جو سارا سال کھلی رہے۔ ان کی تمام بندرگاہیں سردیوں میں برفباری کی وجہ سے کئی کئی مہینوں تک بند رہتی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی بندرگاہ مشرق میں ولاڈیواسٹک ہے جہاں سردیوں میں درجہ حرارت نقطہ انجماد سے بھی نیچے گر جاتا ہے اور بندرگاہ کو کھلا رکھنے کے لیے برف شکن مشینوں کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس امریکہ کے مشرق میں نیویارک کی بندرگاہ ہے جو خط استوا سے اتنی ہی دوری پر واقع ہے جتنی ولاڈیواسٹک لیکن قدرت نے اس پر یہ احسان کیا ہے کہ اس کے مشرق میں بحراوقیانوس میں گرم پانی کی ایک رو بہتی ہے جو تقریباً تین سو میل چوڑی ہے۔ اس کی وجہ سے نیویارک میں سردیوں میں بھی درجہ حرارت نقطہ انجماد تک نہیں پہنچتا اور بندرگاہ سارا سال کھلی رہتی ہے۔

اس مسئلے کے حل کے لیے روس کی ہمیشہ سے یہ خواہش رہی ہے کہ وہ گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرے۔ ادھر مغربی طاقتوں اور برطانیہ کو بھی اس کا بخوبی اندازہ تھا۔ برطانیہ نے برصغیر پر قبضے کے بعد پشاور اور لنڈی کوتل تک جو ریلوے لائن بچھائی تھی اس کا مقصد یہاں کے لوگوں کو سہولتیں فراہم کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ بوقت ضرورت وہ اپنی فوجیں اور اسلحہ تیزی سے شمال کی طرف پہنچا سکیں اور روس کی ممکنہ پیش قدمی روک سکیں۔

سوال:...... روس کو گرم پانیوں تک پہنچنے کی ضرورت تھی لیکن کچھ تدبیریں امریکہ نے بھی کیں جس سے روس کی جانب سے جارحیت کی ترغیب ہوئی اور امریکہ کی سازش کامیاب ہوئی۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب:...... سازشیں اور جوڑ توڑ تو ان بڑے ملکوں کا وطیرہ رہا ہے لیکن اس سازشی حکمت

عملی کو امریکہ کے دانشور اور حکومت کے مشیر برازینسکی نے اپنی کتاب گرینڈ چس بورڈ (The Grand Chess Board) میں لکھتے ہوئے گیم پلان (Game Plan) بھی دیا ہے:

''یوریشیا پر جس کا کنٹرول ہوگا وہ پوری دنیا پر دسترس حاصل کرے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ یوریشیا میں امریکہ کا کوئی مدمقابل سامنے نہ آنے پائے جو امریکہ کی بالادستی کو چیلنج کر سکے۔''

امریکہ نے اس منصوبے پر عمل کیا اور افغانستان میں ایسی سیاسی تبدیلیاں پیدا کیں جو روس کے مفادات کے خلاف تھیں اور روس اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر افغانستان پر حملہ آور ہوا۔ اس جارحیت کے خلاف پاکستان بھی امریکہ کا ہم نوا بن گیا۔ امریکہ نے مجاہدین کو استعمال کیا جو روسی استعمار کے خلاف برسرپیکار ہوئے۔ صدر جنرل ضیاء الحق نے امریکہ کے ساتھ مل کر روسی جارحیت کے خلاف جنگ کا فیصلہ کیا۔ اس جنگ کی اصل قوت وہ جہادی تھے جو افغانستان و پاکستان کے پختونوں کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے ستر ممالک سے آئے ہوئے سرفروش تھے جنہوں نے روس کو شکست دی۔

دس سال کی طویل کشمکش کے بعد روس کو احساس ہوا کہ وہ افغانستان کی جنگ نہیں جیت سکتا۔ اس جنگ نے ان کی معیشت کو برباد کر دیا تھا اور خود ان کی فوج ان پر بوجھ بن گئی تھی۔ میخائل گورباچوف جب کیمونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے تو انہوں نے روسی فوجوں کو افغانستان سے نکالنے کا فیصلہ کیا جس کے لئے انہیں کسی آبرومندانہ ذریعے کی تلاش تھی۔ اسی دوران 14 اپریل 1988ء کو جنیوا میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں امریکہ، روس، افغانستان اور پاکستان شامل تھے۔ اس معاہدے کے مطابق روس نے افغانستان سے اپنی فوجیں نکال لینی تھیں اور افغانستان میں ایک مستحکم حکومت قائم کرنے کی کوششیں کی جانی تھیں۔ روسی کوششوں سے افغانستان کے صدر ببرک کارمل کو ہٹا کر نجیب اللہ کو جو افغانستان کی کیمونسٹ پارٹی کے سیکرٹری جنرل تھے، افغانستان کا صدر بنا دیا گیا جو روس کے خیال میں زیادہ موثر تھے اور روسی فوج کے انخلاء کے دوران امن و امان قائم رکھ سکتے تھے۔ 15 مئی 1988ء

کو روسی فوج کا انخلاء شروع ہوا اور 15 فروری 1989ء کو یہ انخلا مکمل ہوا جو غیر متوقع تھا۔

اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ 1987ء میں افغان جنگ میں اہم موڑ آیا تھا جب افغان جہادیوں کو امریکی سٹنگر میزائل ملے۔ روسی جارحیت کے خلاف جنگ جاری تھی۔ روسیوں نے ہیلی بورن (Heliborn) کمانڈو بریگیڈ Spitnaz Brigade جنگ میں شامل کر دیے تھے جس سے مجاہدین کو مشکل کا سامنا تھا۔ میں گیارہ کور کی کمانڈ کر رہا تھا جو پشاور میں تعینات تھی۔ اس جنگ سے قطعاً ہمارا کوئی تعلق نہ تھا لیکن سرحد پار حالات پر نظر رکھنا میری ذمہ داری تھی۔ امریکی سینٹ کام Centcom سے جنرل کریسٹ (Christ) دورے پر آئے۔ انہوں نے ہمارے کور ہیڈ کوارٹر کا بھی دورہ کیا جہاں میں نے انہیں بریفنگ دی اور بتایا کہ روسی کمانڈوز کے آنے کے بعد سے مجاہدین سخت دباؤ میں ہیں' مار کھا رہے ہیں اور اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ان کے لئے مشکلات پیدا ہوں گی۔''

ان کو حیرت ہوئی' ہر زاویے سے سوالات کئے اور اسلام آباد جا کر متعلقہ لوگوں کو خبردار کیا۔ پینٹاگان بھی یہ خبر پہنچی تو جنرل وکھم (General Wikham) پاکستان کے دورے پر آئے۔ میرے کور ہیڈ کوارٹر کا دورہ کرنا چاہا تا کہ تمام امور پر تفصیلی معلومات حاصل کر سکیں لیکن ان کے دورے سے پہلے وزارت دفاع سے جنرل راجہ محمد اقبال تفصیلی بریفنگ لے کر آئے۔ میں نے پڑھا اور ان کو بتایا کہ:

''یہ بریفنگ درست نہیں ہے' میں وہ بریفنگ دوں گا جو میں درست سمجھتا ہوں۔''

بولے ''آپ کو معلوم ہے یہ بریفنگ جنرل ضیاء نے بھجوائی ہے''

میں نے کہا ''تو جنرل ضیاء کو بتا دیجئے کہ اسلم بیگ اپنی بریفنگ دے گا جو وہ صحیح سمجھتا ہے۔''

اس طرح جنرل وکھم کی بریفنگ کینسل ہو گئی۔

ان باتوں کا اثر یہ ہوا کہ امریکہ نے مجاہدین کو اسٹنگر میزائل دینے کا فیصلہ کیا جن کی مدد سے روس کے گن شپ ہیلی کاپٹروں کو نشانہ بنایا جا سکا۔ ان میزائلوں کی فراہمی سے جنگ کا

نقشہ بدل گیا۔ اس طرح روس کی شکست میں میرا بھی رول ہے۔ اسی کے بعد روس نے اپنی شکست کو مانتے ہوئے وہاں سے نکل جانے کا دانشمندانہ فیصلہ کیا۔ اسی فیصلے کا نتیجہ ہے کہ آج روس افغان طالبان کا قابل اعتماد دوست ہے۔ اور اس کے برعکس امریکہ شکست کھانے کے باوجود بھی سازشوں میں لگا ہوا ہے۔ طالبان کی مزاحمت کے سامنے بے بس اور مجبور ہے۔ یہ صورت حال امریکہ جیسی عالمی طاقت کے لئے کسی المیے سے کم نہیں ہے۔

سوال: غالباً اسی سوچ کا نتیجہ ہے کہ امریکہ اور بھارت کی اسٹریٹیجک پارٹنرشپ کو عملی شکل دی گئی تا کہ چین کا گھیراؤ کیا جاسکے اور پاکستان کو بھی دباؤ میں رکھا جا سکے۔ اس منصوبے کو قابل عمل بنانے کے لئے امریکہ نے اپنی عسکری قوت کو یورپ سے مشرق بعید کے علاقوں تک منتقل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ان عالمی شطرنجی چالوں کے تناظر میں افغانستان کے حالات اور فریقین کی جنگی تیاریاں اور بھی اہم ہیں۔ امریکہ کے ساتھ دفاعی تذویراتی شراکت (Strategic Defence Partnership) کے بعد بھارت کو علاقے میں بالادستی حاصل ہوگی جس طرح اسرائیل کو مشرق وسطی میں حاصل ہے۔ فوجی اہمیت کے ہائی ٹیک ہتھیار اور حربی سامان اسرائیل کے ہاتھوں بھارت کو ملنا شروع ہو گئے ہیں۔ ان حالات میں پاکستان کی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے؟

جواب: یہ وقت پاکستان کے لئے بڑا اہم ہے۔ ہمیں فہم وفراست سے کام لینے کی ضرورت ہے اور یہ سمجھنا لازم ہے کہ افغان قوم نے اپنی تقدیر کا فیصلہ خود کیا ہے۔ ان کی کامیابیوں کے سامنے عالمی طاقتیں، پڑوسی ممالک اور دشمن مجبور و بے بس نظر آتے ہیں۔ مشیت ایزدی نے طالبان کے مصمم ارادوں کی عظیم الشان کامیابیوں کا تعین کرتے ہوئے اس پیغام کو تقویت پہنچائی ہے کہ محض سامان حرب کی فراوانی کامیابی کی ضمانت نہیں ہوتی۔ اصل کامیابی ان لوگوں کے اخلاقی ضابطوں پر منحصر ہے جو اصولوں پر سودے بازی نہیں کرتے اور اپنی بقا کو عظمت کا نشان بنانا جانتے ہیں۔ طالبان نے قادر مطلق کی مدد پر بھروسہ کیا ہے جس کے سامنے آج دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتیں بے بس ہیں۔ امریکہ نے تمام حربے استعمال

کر لئے لیکن طالبان کو ان کے موقف سے ہٹنے پر مجبور نہیں کر سکا ہے۔ طالبان کا مطالبہ ہے کہ پہلے یہ بتاؤ کہ تمہارے ناپاک قدم افغانستان کی سرزمین سے کب نکلیں گے، تبھی مذاکرات شروع ہو سکتے ہیں۔ امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے تمام تر منفی ہتھکنڈوں اور سازشوں کے باوجود طالبان کے حملے جاری ہیں جو امریکہ کے لیے جانکاہ ثابت ہو رہے ہیں۔

قوموں کے عروج وزوال اور عالمی طاقتوں کی جنگوں کا مطالعہ کریں تو افغانستان اور دنیا کی دو سپر پاور یعنی روس اور امریکہ کے خلاف افغان جہادیوں کی کامیابی نہ صرف مثالی ہے بلکہ عہد ماضی کی جنگوں سے مماثلت بھی نظر آئے گی، مثلاً 1683ء میں سلطنت عثمانیہ کے لشکروں نے ویانا(Viana) کے حصار کو دوسری بار توڑنے کی کوشش کی تو بری طرح ناکامی ہوئی اور پھر یہیں سے اس کی ناکامیوں کا سلسلہ شروع ہوا جو سلطنت عثمانیہ کے زوال کا سبب بنا۔ اسی طرح کابل اور ویانا میں ایک مماثلت نظر آتی ہے۔ 1990ء میں کابل سے سوویت یونین کی شکست و ریخت کا منظر ساری دنیا نے دیکھا اور آج ہم امریکہ کی شکست اور اس کی اٹھارہ سالوں کی ناکام جنگ کا حشر دیکھ رہے ہیں۔ امریکہ امن کی بھیک مانگ رہا ہے اور افغانیوں کا مطالبہ ہے کہ "یہاں سے نکلو" تم نے اور پاکستان نے 1990ء میں ہمیں دھوکہ دیا جب کہ فاتح کی حیثیت سے ہمارا حق تھا کہ ہم امن کی راہوں کا تعین کرتے۔ اللہ کا وعدہ پورا ہو چکا ہے کہ "خواہ تمہارا دشمن طاقت میں تم سے کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور اگر تم ثابت قدم رہے تو تمہارا دشمن پیٹھ پھیر کر بھاگ جائے گا۔" دشمن ناکام ہے، پسپا ہو چکا ہے، صرف اس کی سازشی دم اٹکی ہوئی ہے۔

روس کی شکست اور پسپائی کے بعد افغان مجاہدین کو اپنی حکومت بنانے سے روکا گیا اور ایسی حکومت بنائی گئی جس میں مجاہدین افغانستان کا کوئی حصہ نہ رکھا گیا۔ شمالی اتحاد کی حکومت بنا دی گئی اور انہیں کابل لا کر اقتدار سونپ دیا گیا۔ اسی سبب خانہ جنگی شروع ہوئی اور افغان مجاہدین دہشت گرد کہے جانے لگے۔ اس جنگ کے سبب افغان مجاہدین کے اندر سے نوجوان قیادت ابھری جسے طالبان افغانستان کہا گیا۔ اگست 1994ء میں قندھار کے مضافات کے

ایک مدرسے کے سربراہ ملا عمر کی زیر قیادت صرف 45 افراد پر مشتمل گروہ نے مقامی آبادی اور دیگر طبقہ ہائے زندگی کی مکمل تائید سے دسمبر 1994ء میں قندھار پر قبضہ کرلیا۔

1994ء اور 1995ء کی مدت میں طالبان کو افغان عوام کی جانب سے حیران کن پذیرائی ملی جس سے طالبان کو مزید آگے بڑھنے کا حوصلہ ملا۔ ان کی کامیابی کا راز یہی تھا کہ تمام مدمقابل طاقتوں نے اپنے آپ کو اسلحہ سمیت ان کے حوالے کر دیا تھا۔ صرف ان مقامات پر ان کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جو احمد شاہ مسعود اور رشید دوستم کے زیر کنٹرول تھے۔ ایک ایک کر کے طالبان ان کو شکست دیتے گئے اور 2001ء میں افغانستان کے زیادہ تر علاقے ان کے تسلط میں آ گئے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ طالبان کی تحریک کا وجود میں آنا اندرون ملک موجود سماجی برائیوں کے خلاف جہاد کا عمل تھا۔

افغانیوں کے ایمان و یقین کی یہ بلندیاں ہیں جو ان کے نظریہ حیات کو جلاء بخشتی ہیں' پاکستانی قوم کو سبق و رہنمائی دیتی ہیں' جس طرح سے مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کی روشنی خلق خدا کو تمازت بخشتی ہے۔

افغان جہاد کے دوران جنرل ضیاء کا کردار بڑی اہمیت کا حامل تھا اور روسیوں کی پسپائی کے بعد ان کا مقام جہادیوں کے دوست اور مددگار کے لحاظ سے بڑا اہم تھا اور یہ صورت حال امریکہ کی بدلی ہوئی حکمت عملی کے سامنے رکاوٹ تصور کی جاتی تھی۔ در اصل روسیوں کے انخلاء کے بعد امریکہ نے یوٹرن لے لیا۔ مجاہدین 'دہشت گرد' کہے جانے لگے جو جیتی ہوئی قوت تھے اور انہی کا حق بنتا تھا کہ وہ مستقبل کی امن کی راہوں کا تعین کرتے اور انتقال اقتدار کی ذمہ داریاں پوری کرتے لیکن سازش کے تحت شمالی اتحاد کو اقتدار سونپ دینے کی تیاریاں شروع ہوئیں جو خانہ جنگی کا سبب بنیں۔ یہ سارا کھیل ایک فریب تھا جو امریکہ نے کھیلا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ افغانستان میں اسلامی حکومت قائم ہو اور پاکستان' ایران اور وسطی ایشیا کے ممالک پر امن ہوں' مستحکم ہوں اور آج بھی یہی وہ سازش ہے جو خود امریکہ کی شرمناک شکست کے بعد طالبان کے خلاف جاری ہے۔

سوال:...... امریکہ کی سازشوں کے نتیجے میں افغان خانہ جنگی کے بطن سے طالبان ایک قوت بن کر ابھرے ہیں جنہوں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کو شکست دی ہے۔ یہ ناقابل شکست طاقت کیا ہے؟

جواب:...... طالبان' افغان قوم کی اجتماعی مدافعتی قوت کا نام ہے جس کے سامنے دنیا کی دو سپر طاقتیں شکست کھا چکی ہیں اس لئے ان کو سمجھنا اور ان کی سوچ اور عمل کو جاننا ضروری ہے۔ افغانستان اور اس کے ملحقہ علاقوں کی سلامتی اور امن کا تصور طالبان کی سوچ اور ترجیحات کو سمجھے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لوگوں کے ذہنوں میں طالبان سے متعلق بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا طالبان کی اصلیت جاننے کے لئے ان کا پس منظر بیان کرنا ضروری ہے کہ وہ کون ہیں' کہاں سے آئے ہیں اور کس طرح افغانستان کے سیاسی افق پر چھا گئے ہیں؟

طالبان کا مطلب ہے طالبان علم۔ موجودہ طالبان کی جڑیں خراساں (فارس) کی تاریخ سے ملتی ہیں جو خلافت بغداد کا ایک صوبہ تھا جس کی سرحدیں افغانستان تک تھیں۔ افغانستان کی تاریخ میں طالبان کی موجودگی گذشتہ کئی صدیوں پر محیط ہے۔ ان کے لئے ''معلمین اور طالبان'' جیسے القابات عموما استعمال ہوتے ہیں جن کو معاشرے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انہوں نے ماضی میں ہر مشکل وقت میں بیرونی جارحیت اور معاشرتی محاذ پر متعدد اصلاحی کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں۔ سوویت یونین کی جارحیت کو روکنے کے لئے انہی طالبان نے اپنے اساتذہ کی زیر کمان ہراول دستے کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ ان مدرسوں کی پیداوار ہیں جو افغانستان کی نظریاتی' معاشرتی اور قومی قدروں کا تعین کرتے ہیں۔ نویں صدی عیسوی میں جب خراسان میں اسلام کا سورج طلوع ہوا تو اسی وقت مدرسوں کا قیام عمل میں آیا جہاں سے سلسلہ تعلیم و تدریس شروع ہوا جس طرح موجودہ دور کی یونیورسٹیاں ہیں۔ ان مدارس نے مفکر' دانشور' ریاضی دان' حکماء اور عسکری ماہرین پیدا کئے۔ مولانا روم' فردوسی' جامی' ابن سینا' امام بخاری' ترمذی اور دیگر بے شمار شخصیات ان ہی مدارس کے فارغ التحصیل تھے۔ نامور عسکری ماہرین شہاب الدین غوری' محمود غزنوی' احمد شاہ ابدالی اور نامور بزرگان دین علی ہجویری

(داتا گنج بخش)' خواجہ معین الدین چشتی جیسی جید ہستیاں انہی مدارس سے تعلق رکھتی تھیں۔

الغرض مدارس نے مذہبی اور دنیاوی تعلیم کا حسین نمونہ پیش کیا جس کو ''دعوۃ اور جہاد'' سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کا مفہوم ہے علم حاصل کرنا اور ناانصافیوں اور مظالم کے خلاف جدوجہد کرنے کی ترغیب دینا۔ یہ امر دلچسپ ہے کہ احادیث اور فقہ کی معروف کتابیں صحیح حنفیہ اور السنہ خراسان کے مدارس میں امام بخاری' ابوداؤد' امام ابن ماجہ' امام مسلم اور امام ترمذی جیسے نامور علمائے دین اور دانشوروں نے ہی لکھی تھیں۔ یہ مدارس محض حصول تعلیم کا ذریعہ ہی نہ تھے بلکہ عسکری تربیت کے مراکز بھی تھے جہاں ہتھیاروں کے بغیر جہاد کی تعلیم دی جاتی ہے۔ نوجوان نسل کے دلوں کو خدا کی وحدانیت سے ان مدارس نے روشناس کرایا جو کہ ہر مسلمان کی نظریاتی اساس ہے۔

قیام پاکستان سے پورے دو سو سال پہلے 1747ء میں احمد شاہ درانی نے مملکت افغانستان کی بنیاد ڈالی۔ ایران کی طرح افغانستان بھی ان مدارس کے نظام سے منسلک رہا ہے جو کہ اسلامی سوچ کا محور اور اندرونی و بیرونی جارحیت' ناانصافیوں اور ہر قسم کی برائیوں کے خلاف کمر بستہ رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسلامی انقلاب ایران 1978ء کے محرک یہی مدارس بنے جہاں سے برائی کے خاتمے کے لیے نظریاتی تگ و دو کا عمل شروع ہوا اور انہی مدارس کے عالم دین آیت اللہ سید روح اللہ خمینی اور ان کے رفقاء نے اسلامی انقلاب ایران کو قیادت مہیا کی۔

ماضی میں افغانستان کے طالبان نے پیادہ سپاہیوں کی حیثیت سے محمود غزنوی' شہاب الدین غوری اور احمد شاہ ابدالی کے جھنڈے تلے جنگوں میں حصہ لیا جبکہ ماضی قریب میں انہوں نے ''روشنی تحریک'' کے نام سے (1525-75) میں شاہ محمود کی زیر کمان صفوی شہنشاہیت (1710-15) کے خاتمے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہی وہ ملا اور طالبان تھے جنہوں نے برطانیہ کے جھنڈے تلے لڑنے والے ہندوستانی فوجیوں کو افغانستان کی طرف پیش قدمی سے روک دیا تھا۔ ملا شور بازار نے برطانیہ اور افغان شہنشاہ امان اللہ کے خلاف مزاحمت

کرنے پر بڑی شہرت حاصل کی۔

افغانستان پر روسی جارحیت کے خلاف طالبان نے مزاحمت کی نئی تاریخ رقم کرتے ہوئے روس جیسی عالمی سپر پاور کو شرمناک شکست سے دوچار کیا۔ افغان جہاد میں ستر ممالک سے آئے ہوئے جہادی شامل ہوئے' جنہیں امریکہ' پاکستان اور دوسرے اتحادیوں نے سوویت یونین کے خلاف کھلے عام استعمال کیا۔ جب افغانستان پر روس کے قبضے کے وقت یہ مدارس جبرا بند ہو گئے تو زیادہ تر طلبہ پاکستان کی طرف ہجرت کر کے یہاں مدرسوں میں مقیم ہو گئے۔ جب اس حقیقت کا ادراک ہو گیا کہ روسیوں کو افغانستان سے بآسانی نہیں نکالا جا سکتا تو سعودی حکومت کی مالی مدد اور پاکستان اور امریکہ کی مشترکہ تائید سے پاک افغان سرحد کے ساتھ ساتھ ''نظریاتی تحفظ'' کے لیے مدارس کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا اور انہی مدارس نے جہاد کے لیے بنیادی نرسریوں کا کردار ادا کیا۔ لہٰذا ان مدارس کو پاکستان پیپلز پارٹی' جمعیت علمائے اسلام یا آئی ایس آئی کی پیداوار قرار دینا قطعی غلط ہے۔

بعد ازاں طالبان' اپنے سرداروں کی زیر کمان مجاہدین کے ساتھ مل گئے۔ مثلاً پروفیسر برہان الدین ربانی' عبدالرب رسول سیاف' صبغت اللہ مجددی' خلیلی' یونس خالص' نبی محمدی' انجینئر گلبدین حکمت یار اور احمد شاہ مسعود نے ان کی قیادت کی۔ 1989ء میں افغانستان سے روسیوں کے انخلاء کے بعد اکثر و بیشتر طالبان سلسلہ تعلیم جاری رکھنے کے لیے افغانستان واپس چلے گئے جہاں مدارس دوبارہ کھل گئے اور جو مدارس پاکستان میں کھولے گئے تھے وہ بھی اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف رہے۔

سوال:...... افغانستان میں روس کی پسپائی کے بعد بھی امن قائم نہیں ہو سکا' اس کی کچھ وجوہات تو آپ نے بیان کر دی ہیں۔ امریکہ کا افغانستان کی موجودہ صورت حال میں کیا کردار ہے اور حکومت پاکستان کی کیا پالیسی ہونی چاہیے؟

جواب:...... امریکہ افغانستان میں رہتے ہوئے اپنی سازشوں پر عمل درآمد کر رہا ہے تا کہ عالمی جہاد کے نتیجے میں ابھرتی ہوئی طاقتوں کو دبا سکے۔ کئی طاقتیں جن کا تذکرہ اوپر بیان

کیا گیا ہے۔ سپر پاور سوویت یونین' امریکہ اور یورپی یونین کے خلاف 'عالمی جہاد' کی کامیابی کے سبب معرض وجود میں آ گئیں جو عالمی استعماری قوتوں کے مفاد میں نہ تھیں' مثلاً:

۔ایک مدافعتی قوت پیدا ہوئی جو پاکستان کی سرزمین سے لے کر افغانستان میں آمو دریا کی سرحدوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ اسے پختون پاور کہتے ہیں۔ امریکہ کے نزدیک اسے کمزور کرنا ضروری تھا۔ سوویت یونین کے پسپا ہونے کے بعد اسی قوت کے سہارے ''اسلامی مملکت افغانستان'' کا قیام ناگزیر تھا جسے روکنا امریکہ کے لئے انتہائی ضروری تھا۔

۔مملکت اسلامی افغانستان کے قیام کے بعد انقلابی ایران اور اسلامی پاکستان پر مشتمل دنیائے اسلام کے اتحاد سے امہ کی مرکزی تذویراتی گہرائی کا تصور حقیقت بن جاتا۔ اسے روکنا ضروری تھا۔ پاکستان کے خلاف قوم کی نظریاتی اساس کو کمزور کرنے کی سازش 2008ء میں شروع ہوئی جس کا نام ''پاکستانی قوم کی نظریاتی درستگی'' (Perception Management of Pakistani Nation) تھا جو اس وقت سے اب تک جاری ہے اور اس کا زہر پھیلتا جا رہا ہے۔

۔ پاکستان کا سکیورٹی ادارہ آئی ایس آئی کہ جس نے سی آئی اے کے ساتھ مل کر یہ کارنامہ انجام دیا تھا وہ خطرناک حد تک صلاحیت حاصل کر چکا تھا۔ اسے کمزور کرنا ضروری تھا۔ لہٰذا کچھ عرصہ بعد آئی ایس آئی کو ایسے افسران اور کارکنوں سے پاک کر دیا گیا جن کا تعلق افغان مجاہدین سے تھا۔

۔عراق اور ایران آٹھ سال کی طویل جنگ کے بعد لہولہان تو ہو گئے تھے لیکن دونوں عسکری قوت بھی بن چکے تھے۔ یہ صورت حال امریکہ کے مفاد میں نہیں تھی۔ عراق کے خلاف سازش شروع ہوئی۔ اس پر ایٹمی ہتھیار بنانے کا الزام لگاتے ہوئے پوری طاقت سے حملہ کر کے ملک کو تباہ کر دیا گیا۔

۔ایران کے خلاف ظلم و زیادتی جو 1979ء سے جاری تھی اس میں مزید شدت آئی۔ عرب ممالک کے دلوں میں ایران کا خوف بٹھا کر اسرائیل کو تیار کیا گیا کہ جنگ کی حکمت عملی بنائے کہ کس طرح ایران کو طاقت کے زور پر تباہ کر دے۔ امریکہ اور اتحادی اس کی ہر طرح کی مدد کریں گے۔ اس دہشت گردی کا سلسلہ جاری تھا کہ ایران نے سازش کو ناکام بنانے کے لئے یمن کی جانب سے سعودی عرب کی تیل کی تنصیبات پر میزائل اور ڈرون سے حملہ کر دیا جس سے بڑی تباہی آئی۔ امریکہ اور سعودی عرب مزید تباہی کے امکان سے ڈر گئے اور ایران پر دباؤ میں کمی آ گئی۔ ایران کی اس حکمت عملی کو فوجی اصطلاح میں Fundamental Blow یعنی ضرب کاری کا نام دیا جاتا ہے جسے صحیح وقت پر استعمال کر کے مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔ یہ پاکستان کے لئے بھی ایک مثال ہے کہ ہم کیسے اس طرح کی حکمت عملی پر عمل کر کے قومی مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔

۔ایک بڑی سازش جو دنیائے اسلام کے خلاف روز بروز واضح ہوتی جا رہی ہے وہ شیعہ سنی فرقوں کے درمیان تقسیم اور بڑھتی ہوئی نفرت ہے۔ ایران کے خلاف 1979ء سے لے کر اب تک سنی مسلمانوں کے دلوں میں نفرت پھیلائی گئی ہے۔ ایران و عراق کے درمیان جنگ کرائی گئی۔ شام میں تباہ کن جنگ ہوئی اور اب وارسا پلان (Warsaw Plan) کے منصوبے کے تحت امریکہ' سعودی عرب میں اپنی پندرہ ہزار فوج اتارے گا تا کہ پورے مشرق وسطیٰ میں بسنے والوں کی زندگی حرام کر دے۔ افغانستان سے نکلنے سے پہلے امریکہ نے اسرائیل کو ذمہ داری دی ہے کہ وہ ایران کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو محدود کرے تا کہ پورے علاقے میں اسرائیل کی بالادستی اور امریکی مفادات کو تحفظ مہیا کر سکے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق
نے ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند

اپنے بھی خفا مجھ سے بیگانے بھی ناخوش
میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

طالبان کی اس تحریک کو بجا طور پر افغانستان کی اپنی پیداوار کہا جا سکتا ہے جس نے چھ سال کے معمولی عرصے میں باہمی اتحاد سے حیران کن کامیابیاں حاصل کیں۔ 1995ء میں ربانی حکومت کے خاتمے کے بعد اسامہ بن لادن افغانستان واپس آ گئے۔ طالبان نے جہاد میں ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے انہیں افغانستان میں پناہ دی۔ اسامہ نے عالمی اسلامی محاذ سے اپنے روابط از سر نو منظم کئے اور افغانستان سے باہر متحرک رہے۔ 1998ء میں جلال آباد میں ان کا کیمپ اور سوڈان میں واقع ان کی دوا ساز فیکٹری امریکی میزائلوں سے تباہ کر دی گئی اور طالبان حکومت پر سخت پابندیاں لگا دی گئیں جس کے نتیجے میں القائدہ کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا اور اس کی سرگرمیاں کافی حد تک محدود ہو گئیں۔

باب پنجم

مسلح افواج کا اہم ترین فیصلہ

1987ء میں' میری وائس چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے پر ترقی ہوئی۔ ہمارے وائس چیف آف آرمی سٹاف جنرل خالد محمود عارف کی مدت ملازمت پوری ہو چکی تھی۔ جنرل ضیاء نے لیفٹیننٹ جنرل زاہد علی اکبر کو VCOAS بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وزیراعظم محمد خان جونیجو کی منظوری کے لئے جب یہ فیصلہ ان کے پاس بھیجا گیا تو انہوں نے چاروں سینئر افسران کا ڈوزئیر Dossier دیکھا اور جنرل ضیاء سے ملے اور کہا کہ "اسلم بیگ سب سے سینئر ہے' کمانڈ' اسٹاف اور انسٹرکشنل (Instructional) تجربہ زیادہ رکھتا ہے' ان میں کیا کمزوری ہے کہ پروموٹ (Promote) نہ کیا جائے" جنرل ضیاء قائل ہو گئے اور مجھے VCOAS کا عہدہ مل گیا۔

صحیح معنوں میں یہ مداخلت ایزدی (Divine Intervention) تھی۔ ڈیڑھ سال بعد میں اسی گھر میں آ گیا جہاں سی جی ایس کی حیثیت سے 5 سال رہا تھا اور جب میں چیف آف آرمی سٹاف بنا تب بھی وہیں رہا جو چار بیڈ روم اور ایک سٹڈی روم پر مشتمل تھا۔ میری گارڈ دس (10) جوانوں پر مشتمل تھی جس کا کمانڈر ایک جے سی او (JCO) تھا۔ وائس چیف اور چیف آف آرمی سٹاف بننے کے بعد بھی ٹیوٹا کراؤن 1600 سی سی گاڑی استعمال کی۔ یہ وزیراعظم محمد خان جونیجو کا حکم تھا اور مرسڈیز 500 ماڈل 1955 جو جنرل ایوب خان اور ان کے بعد آنے والے تمام آرمی چیفس کے استعمال میں رہی تھی اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

1988ء میں دوبارہ جنرل ضیاء کے ذہن میں ایک نئے سیاسی نظام کا تصور ابھرا۔ انہوں نے مجھے اور جنرل حمید گل کو دوبارہ بلایا اور ایک رپورٹ تیار کرنے کو کہا جس میں یہ واضح ہو کہ "نئے سیاسی نظام کی ترجیحات کیا ہونی چاہئیں جو وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں۔"

ہم نے عرق ریزی کے بعد رپورٹ تیار کی اور انہیں پیش کردی۔ ہمیں بلایا گیا' بحث ہوئی اور رپورٹ کا خلاصہ میں نے پڑھا:

''اللہ آپ پر بڑا مہربان ہے۔ 1985ء میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو موقع دیا تھا کہ آپ تاریخی فیصلہ کرتے۔ لیکن آپ کی ترجیحات کچھ اور تھیں اور اب دوسری بار اس کا کرم ہے کہ آپ ایک بڑا تاریخی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ الیکشن کرایئے اور اقتدار سے الگ ہو جایئے تاکہ قوم ان مشکل حالات کا مقابلہ کر سکے۔ تاریخ آپ کو ایک (Benovelent) ڈکٹیٹر کے نام سے یاد کرے گی۔''

بولے'' آپ نے بہت صحیح کہا ہے لیکن اقتدار کی کچھ مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ فی الوقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔''

بات ختم ہوگئی۔

1988ء کا سال شروع ہوا تو افغانستان کی جنگ اختتام کے قریب تھی۔ ایران' عراق جنگ آٹھ سال کے خونریز تصادم کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ پاکستان کے اندر دنیا جہان کے جہادیوں کا اژدہام تھا۔ ہماری بری فوج کے نئے ہتھیاروں اور جنگی سامان کی تیاریاں عروج پر تھیں' ہمارا ماڈرنائزیشن پروگرام (Modernization Programme) تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔

ہمارا اہم ہتھیار مین بیٹل ٹینک (Main Battle Tank) 'الخالد کا پروٹو ٹائپ (Proto Type)' چین اور پاکستان کی مشترکہ کوششوں سے مکمل ہو رہا تھا جس کے ساتھ ٹرائل (Trial) کے لیے امریکہ کا ایم ون اے ون ابراہم (M1A1 Abraham) ٹینک پاکستان لانے کی تیاریاں تھیں۔ ہمارے سینئر افسروں کو اور خود جنرل ضیاء کو قطعاً یقین نہیں تھا کہ ہم کوئی ایسا ٹینک بنا سکیں گے جو دور حاضر کے جنگی تقاضوں پر پورا اتر سکے۔ ایم ون اے ون ٹینک کی لابی بڑی مضبوط تھی اور صحیح بھی تھا کہ اس وقت سٹیٹ آف دی آرٹ (State of the Art) ٹیکنالوجی کے حوالے سے یہ بہترین ٹینک تھا۔

بھارت نے بھی ٹینک بنانے کی کوششیں کیں لیکن ان کی ساری کوششیں اب تک ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ ہم نے ان کی ناکامیوں کا بغور جائزہ لیا۔ پتہ چلا کہ وہ ٹینک اور اس میں نصب تمام نظاموں (Systems) کو خود بنانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ ٹینک کا ایک بیرونی ڈھانچہ یا فریم ہوتا ہے جو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ اس پر چھوٹے موٹے ہتھیار بے اثر ہوں۔ پھر اس کا ٹریک جس پر ٹینک چلتا ہے یہ اتنا مضبوط اور لچکدار ہونا چاہیے کہ چھوٹی موٹی رکاوٹوں' کھائیوں کو عبور کر سکے' کیچڑ' دلدل' ریت میں پھنس نہ جائے۔ اس کا انجن بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ پچاس ساٹھ ٹن کے ٹینک کو چلاتے ہوئے یہ اوور ہیٹ ہو جائے تو رک جائے گا۔ اس کا ایک برقی نظام ہوتا ہے اور فائر کنٹرول کا ایک نظام ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ الخالد ٹینک سے پہلے ہمارے ہاں ٹینک کے بیرونی ڈھانچے (Hull) اور ٹریک وغیرہ T-59 ٹینک کے پروگرام کے تحت بن رہے تھے۔ باقی نظام ہم نے جرمنی اور یورپ سے لئے۔ جرمنی سے ان کے ٹینک پانزر 2 (Panzer II) کا انجن لیا اور یورپ سے فائر کنٹرول کا نظام لیا۔

یہ تمام ٹیکنالوجی تو بازار میں بکتی ہے جو ہم نے خریدی لیکن اصل کمال ہمارے اور چینی ماہرین کا ہے جنہوں نے جوڑ توڑ کے ایک بہترین ٹینک کی شکل دے دی اور اس میں وہ تمام عوامل شامل کر دیے جو ہماری ضرورت تھی۔ ماشاء اللہ۔ مختصر یہ کہ ہماری حکمت عملی کامیاب ہوئی۔ الخالد ٹینک کے تین نمونے (Proto Types) تیار ہوئے اور حتمی ٹیسٹ کے لئے الخالد اور ایم ون اے ون ٹینک ملتان پہنچ گئے۔

ملتان سے بہاولپور لے جانے کا انتظام کیا گیا' جہاں ٹامے والی فیلڈ فائرنگ رینج پر ٹیسٹ ہونے تھے۔ بہاولپور جانے کے لئے جی ایچ کیو نے اہم شخصیات اور متعلقہ افسران کی دو فہرستیں تیار کیں۔ ایک جنرل ضیاء کا گروپ تھا اور دوسرا چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی جنرل اختر عبدالرحمٰن کا۔ دوسرے گروپ نے تین دن بعد ٹرائل (Trial) دیکھنا تھا۔ 17 اگست کو پہلا ٹرائل تھا' اس سے ایک دن پہلے جنرل اختر عبدالرحمٰن مجھے گالف کورس پر ملے

اور شکایت کی کہ انہیں پہلے گروپ میں کیوں نہیں رکھا۔ میں نے کہا:

"اصول کے تحت سب سینئر افسران ایک جہاز میں سفر نہیں کرتے۔"

وہ خاموش ہو گئے۔

سترہ اگست کو جنرل ضیاء الحق تقریباً گیارہ بجے اپنے قافلے (Entorague) کے ساتھ اپنے خصوصی جہاز سی ون تھرٹی (Pakistan-One, C-130) سے بہاولپور ائر پورٹ پہنچے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے میں اپنے جہاز میں ان کے استقبال کے لیے بہاولپور پہنچ گیا تھا۔ جب وہ آئے تو ان کے ساتھ جنرل اختر عبدالرحمٰن' امریکی سفیر' ان کے ملٹری سیکرٹری اور دیگر متعلقہ افسران بھی تھے۔ ایوان صدر سے یہ نام شامل کئے گئے تھے۔

میں نے اور کور کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل محمد شفیق نے ان کا استقبال کیا۔ وہیں ائر پورٹ کے لاؤنج میں فریش اپ (Fresh-up) ہوئے اور دو ہیلی کاپٹروں میں ٹامے والی رینج کی طرف روانہ ہوئے۔ ٹرائل ٹیم کے سربراہ میجر جنرل محمود درانی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں موجود تھے۔ ٹرائل شروع ہوا جو تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہا۔ الخالد ٹینک تمام ٹیسٹوں میں کامیاب ہوا۔ امریکی ایم ون اے ون (M1A1) ٹینک صرف چند ایک ٹیسٹ میں کامیاب ہوا۔ اس کے نتیجے پر سب کو حیرت ہوئی لیکن اپنی آنکھوں سے دونوں ٹینکوں کی کارکردگی دیکھنے کے بعد کسی کو شک و شبے کی گنجائش نہیں رہی۔ وہاں سے تقریباً ڈیڑھ بجے بہاولپور کے لئے روانہ ہوئے۔ کور ہیڈ کوارٹر میں تمام شرکاء کے لئے کھانے کا انتظام تھا۔ ظہر کی نماز پڑھی' اس کے بعد وہاں موجود بہاولپور کی کچھ شخصیات کے ساتھ جنرل ضیاء نے ملاقات کی۔ تقریباً ساڑھے چار بجے بہاولپور ائر پورٹ کے لیے روانہ ہوئے۔

میں جنرل ضیاء کے ساتھ تھا اور انہیں جہاز تک چھوڑنے آیا۔ سب لوگ جہاز میں بیٹھ چکے تھے' جہاز میں داخل ہوتے ہوئے انہوں نے کہا:

"آپ بھی آ رہے ہیں' آیئے' مگر آپ کا تو اپنا جہاز ہے (جو سامنے کھڑا تھا)۔

"جی ہاں' میں اپنے جہاز سے آؤں گا' اللہ حافظ۔"

ان کا جہاز ٹیک آف (Take-off) کر گیا اور اس کے بعد میں بھی روانہ ہوا۔ ابھی کوئی دس منٹ ہوئے تھے کہ میرے پائلٹ کرنل منہاج نے پریشانی کے عالم میں بتایا:

"سر' اسلام آباد کنٹرول کا پاکستان۔ ون (Pakistan-One) سے رابطہ نہیں ہو رہا ہے۔ میں بھی کوشش کر رہا ہوں لیکن کوئی ریسپانس (Response) نہیں ہے۔"

"اللہ رحم کرے' کیا ہو سکتا ہے۔"

ہم سب دعائیں پڑھنے لگے' پائلٹ نے بتایا:

"وہ سامنے دھواں نظر آ رہا ہے' اور دوسرے لمحے ہمارا جہاز اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ نیچے ایک ہیلی کاپٹر بھی اتر رہا تھا جو ملتان جا رہا تھا۔ ہمارا جہاز اوپر چکر لگاتا رہا۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ سی ون تھرٹی کریش (Crash) ہو گیا ہے۔ آگ لگی ہوئی ہے' کوئی زندہ نظر نہیں آ رہا۔

اس قسم کے انتہائی مخدوش لمحوں میں مجھے اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کرنا تھا۔ اگر واپس بہاولپور جا کر جائے حادثہ پر پہنچتا ہوں تو رات ہو جاتی ہے اور اگر جائے حادثہ پر پہنچ بھی جاتا تو کچھ کر نہ پاتا۔ نیچے رابطہ کیا تو بتایا گیا کہ "سب کچھ جل کے خاک ہو چکا ہے۔"

میں نے پائلٹ کو کہا:

"سیدھے راولپنڈی چلو"

جی ایچ کیو (GHQ) رابطہ کیا' وہاں حالات پرسکون تھے۔ حکم دیا "فارمیشنز (Formations) کو ریڈ الرٹ (Red Alert) کردو اور اگلے حکم کا انتظار کرو۔"

اس دن بہاولپور سے واپسی پر مندرجہ ذیل افسران میرے ساتھ جہاز میں سوار تھے:

- بریگیڈیئر اعجاز امجد' میرے پرائیویٹ سیکرٹری
- کرنل منہاج' جہاز کے پائلٹ
- کیپٹن عمر فاروق درانی' میرے اے ڈی سی

۔کیپٹن عبدالخالق چشتی میرے پبلک ریلیشنگ آفیسر

میرے ساتھ جہاز میں بیٹھے ہوئے آفیسرز میری طرف دیکھ رہے تھے اور میں گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ اقتدار اپنے ہاتھوں میں لے لینا ہے یا اسے دینا ہے جس کی امانت ہے۔ ذہن میں والد محترم کی نصیحت گونج رہی تھی ''حقدار کو اس کا حق دے دینا۔'' اسی سوچ کے مطابق میرا ذہن بھی بنا ہوا تھا کیونکہ 1985ء کے بعد 1988ء میں بھی میں نے جنرل ضیاء الحق کو مشورہ دیا تھا ''الیکشن کرایئے اور اقتدار عوام کو سونپ دیں۔''

اب جب حالات نے مجھے اس مقام پر لا کھڑا کیا تھا' اور مجھے خود فیصلہ کرنا تھا تو دیے گئے مشوروں کے برعکس فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ ''اقتدار عوام کی امانت ہے' انہی کو دیا جائے گا جن کا یہ حق ہے۔'' اس فیصلے سے دل و دماغ کو سکون ملا' ذہن پر چھائے ہوئے خوف اور بے یقینی کے بادل چھٹ گئے۔ اسی سوچ میں گم تھا کہ ہم قاسم ایوی ایشن بیس دھمیال پر پہنچ گئے۔ 10 کور کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل عمران اللہ مجھے لینے آئے تھے' ہم سیدھے جی ایچ کیو پہنچے جہاں سب حیران و پریشان ہمارے منتظر تھے اور دکھ بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

جی ایچ کیو پہنچنے سے پہلے میں نے چیف آف نیول سٹاف ایڈمرل سعید احمد خان اور چیف آف ائر سٹاف ائر مارشل حکیم اللہ کو پیغام دیا کہ وہ فوراً جی ایچ کیو پہنچیں' ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی لیفٹیننٹ جنرل حمید گل اور جج ایڈووکیٹ جنرل بریگیڈیئر عزیز احمد خان کو بھی بلا بھیجا۔ آدھے گھنٹے کے اندر چاروں حضرات پہنچ گئے۔ میں نے ساری صورت حال انہیں بتائی اور مشورے کا طالب ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ سبھی نے وہی مشورہ دیا جو میرے دل میں تھا۔ متفقہ فیصلہ تھا کہ آئین کے مطابق چیئرمین سینیٹ غلام اسحٰق خان کو بلایا جائے اور اقتدار کی ذمہ داریاں ان کو سونپ دی جائیں۔ جناب غلام اسحٰق خان کو پیغام دیا اور وہ بھی پہنچ گئے۔ وہ حیران رہ گئے جب ان کو میں نے کہا:

''اس مشکل وقت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھاری ذمہ داری دی ہے' جو آئین

میں بھی آپ ہی کی ذمہ داری ہے کہ آپ معاملات کو سنبھالیں گے۔ ہماری طرف سے صرف یہ عرض ہے کہ ضروری انتظامات کرنے کے بعد نوے (90) دنوں کے اندر اقتدار عوام کے نمائندوں کو سونپ دیا جائے۔ آپ کے اس کام میں آپ کو ہمارا مکمل تعاون حاصل ہوگا۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔''

امید وبیم اور بے یقینی کے آثار جو ہم نے ان کے چہرے پر دیکھے وہ بیان نہیں کر سکتا۔ وہ رخصت ہوئے تو تقریباً رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ 10 بجے تک صدر غلام اسحٰق خان نے قومی نشریاتی رابطے پر قوم سے خطاب کیا اور اس فیصلے کا اعلان کیا۔ یہ ایسا فیصلہ ہے کہ دور حاضر میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ماشاء اللہ

۔جنرل ضیاء کے انتقال کے تین گھنٹوں کے اندر اندر آئین بحال ہو چکا تھا۔

۔انتقال اقتدار کی کاروائی کا آغاز ہوا' جسے 90 دنوں میں مکمل ہونا تھا۔

۔یہ افواج پاکستان کا فیصلہ تھا۔

سوال:...... 17 اگست 1988ء کو طیارے کا حادثہ فوج کا بہت بڑا نقصان تھا۔ آپ نے فوج کی قیادت سنبھالنے کے بعد اس حادثے کی تفصیلات معلوم کرنے کی کوشش کی؟ یہ ایک عظیم قومی سانحہ تھا جس کی تحقیقات ضروری تھیں' مثلاً:

☆...... آموں کی پیٹیاں کون لایا تھا؟ بغیر چیکنگ کیسے یہ پیٹیاں جہاز میں رکھ دی گئیں؟ اس غفلت کا ذمہ دار کون تھا اور اس کے خلاف کوئی کاروائی کی گئی؟

☆...... اس سلسلے میں پارلیمانی کمیشن بھی بنا تھا اور آپ بھی اس میں پیش ہوئے تھے۔ آپ نے کیا موقف اختیار کیا اور کمیشن کی رپورٹ کے بارے میں آپ کو کوئی علم ہے؟

☆...... حادثے میں شہید ہونے والوں کا پوسٹ مارٹم نہیں کروایا گیا جس سے حادثے کے سبب سے متعلق کچھ نہ کچھ سراغ مل سکتا تھا۔ کیا آپ کے حکم سے سب کو بغیر پوسٹ مارٹم دفنا دیا گیا؟

جواب:...... راولپنڈی پہنچ کر سب سے پہلے میں نے لیفٹیننٹ جنرل محمد شفیق' بہاولپور

کے کور کمانڈر سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ ہلاک ہونے والوں کی شناخت مشکل ہے۔ جنرل ضیاء کی کچھ باقیات ملی ہیں جنہیں ہم جمع کر رہے ہیں تاکہ ان کی میت کو تیار کیا جائے۔ یہاں سی ایم ایچ کے ڈاکٹروں کی ٹیم موجود ہے جو پوسٹمارٹم کے لئے اعضاء اکٹھے کر رہی ہے۔ جنرل ضیا کی میت دوسرے دن راولپنڈی پہنچی۔

دوسرے دن میں نے جنرل شفیق سے تفصیل سے بات کی۔ میں نے پوسٹمارٹم رپورٹ کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ سی ایم ایچ سے رپورٹ کا انتظار ہے۔ چند دنوں بعد رپورٹ ملی تو اس میں کسی قسم کے کیمیکل کی نشاندہی نہیں ہوئی اور چند ہفتوں بعد جب امریکہ سے رپورٹ آئی تو اس میں بھی کسی قسم کی آلائش نہیں پائی گئی۔ البتہ آدھے سے زیادہ جسموں کے ٹکڑے انہوں نے واپس کر دیے تھے جو امریکیوں کے نہیں تھے۔

حادثے کے دوسرے دن ڈی جی ملٹری انٹیلی جنس کو ہدایت دی کہ بڑی مستعدی کے ساتھ انکوائری کریں اور تجاویز پیش کریں۔ صدر غلام اسحاق خان سے بات کی کہ جوائنٹ انکوائری کا حکم جاری کریں اور ساتھ ہی ڈی جی آئی ایس آئی کو حکم دیں کہ وہ اپنی رپورٹ الگ تیار کریں۔ پاکستان ائرفورس نے پہلے ہی اپنی انکوائری کمیٹی متحرک کر دی تھی جس نے جائے حادثہ پر پہنچ کر اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ ان تمام رپورٹوں کی تفصیل تین ہفتوں کے اندر حکومت کو مل چکی تھیں۔ اس کے بعد حکومت وقت کی ذمہ داری تھی کہ اگلے اقدامات کا حکم نامہ جاری کرتی۔

''سی 130 ہوائی جہاز پاکستان - ون'' جو صدر مملکت کے لئے خصوصی جہاز ہوتا ہے' اس کی ذمہ داری پاکستان ائرفورس کی ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک کسی اور کو جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جو سامان بھی جہاز میں رکھا جاتا ہے اس کی تلاشی ہوتی ہے۔ البتہ جو مینیفسٹ (Manifest) بنتا ہے' یعنی مسافروں کی لسٹ بنتی ہے وہ صدر کے آفس کی ذمہ داری ہوتی ہے جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے کہ جنرل اختر عبدالرحمان نے ایک دن پہلے مجھ سے شکایت کی تھی کہ میں نے صدر کے ساتھ ان کا نام کیوں نہیں رکھا' میں نے انہیں وجہ بتائی تھی

لیکن پھر بھی انہوں نے صدر کے ملٹری سیکرٹری سے کہہ کے اپنا نام ڈلوالیا تھا۔

چار ہفتوں کے اندر اندر پاکستان ائرفورس کی انکوائری اور تینوں دوسری انکوائریوں کی تحقیقات کے مطابق یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ:

- کسی کیمیکل یا گیس کی کوئی بھی نشاندہی نہیں ہو سکی۔
- جب جہاز ڈگمگانے لگا تو اندر سے کسی نے پائلٹ کا نام لے کر پکارا تھا کہ ''کیا ہو رہا ہے۔''

لیکن پائلٹ کی طرف سے کوئی جواب نہیں ملا۔ بلیک باکس سے اس بات کی تصدیق بھی ہوئی۔ غالباً کسی (Crew Member) نے یہ بات کہی ہو جسے مانیٹرنگ ڈیسک نے سنا ہو۔ پائلٹ نے ایس او ایس (SOS) بھی نہیں مانگا۔ انہی باتوں سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید اس حادثے کے پیچھے کوئی سازش تھی۔

محترمہ بے نظیر بھٹو جب وزیراعظم بنیں تو میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اس حادثے کی کریمنل انکوائری (Criminal Inquiry) کرائیں تاکہ حقائق سامنے آ سکیں۔ انہوں نے بندیال کمیشن بنایا جس کی رپورٹ یہ تھی کہ "It was an act of good riddance" یعنی ایک ڈکٹیٹر کا یہی انجام ہوتا ہے جس نے ان کے والد کو پھانسی دی تھی۔

جب نواز شریف وزیراعظم بنے تو ان سے بھی میں نے یہی درخواست کی۔ انہوں نے بھی جسٹس شفیع الرحمٰن کے تحت ایک جوڈیشل کمیشن بنایا۔ میں بھی اس کے سامنے پیش ہوا لیکن اس کمیشن نے بھی اس واقعے کو حادثہ قرار دیا۔ امریکہ اور سی ون تھرٹی جہاز بنانے والی کمپنی کے مطابق جہاز کے اندر تکنیکی خرابی کے سبب یہ حادثہ پیش آیا ہے۔

دوسرے دن میں نے جی ایچ کیو ہال میں تمام گیریژن افسروں سے خطاب کیا۔ بہت سی باتوں کے علاوہ خطے کی تذویراتی تبدیلی کا ذکر کیا اور اسی حوالے سے تذویراتی گہرائی (Strategic Depth) کا تصور بھی پیش کیا۔ یہ ایک تفصیلی خطاب تھا جسے آئی ایس پی آر (ISPR) نے ریکارڈ کیا تھا۔ میں صرف چند باتیں بیان کرنا چاہوں گا:

''یہ امر باعث اطمینان ہے کہ مشکل کی اس گھڑی میں ہم تنہا نہیں ہیں' ہماری قوم ہمارے ساتھ ہے جس نے انتہائی مشکل حالات کا نہ صرف مردانہ وار مقابلہ کیا ہے بلکہ عزت و وقار کے ساتھ زندگی گذارنا جانتی ہے۔ اس وقت ہمارے اردگرد ایک نئی حقیقت رونما ہو رہی ہے جو قابل غور ہے۔ ہماری مغربی سرحدوں پر افغان حریت پسندوں کی جدوجہد آزادی اپنے منطقی انجام کے قریب ہے۔ وہاں آزاد اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ سپر پاورز کے توسیع پسندانہ عزائم کے دن گزر چکے ہیں۔ ہمارے ملک میں جمہوریت کی ترویج کی کوششیں شروع ہو چکی ہیں۔ ہمارے پڑوس میں ایرانی قوم نے عراق کی جانب سے کی جانے والی جارحیت کو جذبہ حریت سے کچل دیا ہے۔ اس طرح تینوں اسلامی ممالک میں اسلامی قوتوں نے اپنی جڑیں گہری کر لی ہیں۔ بالفاظ دیگر ایک نئی صبح طلوع ہو رہی ہے جو ہمارے لئے بڑی اہم ہے۔ پاکستان' ایران اور افغانستان تینوں ممالک کے لئے باہم متحد ہو کر پرعزم انداز سے مشترکہ منزل کی جانب بڑھنے کا وقت ہے۔ ان تینوں ممالک پر مشتمل عالم اسلام کا اتحاد ''تذویراتی گہرائی کا نظریہ'' ہے۔ اس اتحاد سے ہماری سلامتی کے تقاضے مستحکم ہوں گے اور کسی دشمن کو ہمارے خلاف آنکھ اٹھانے کی جرات نہیں ہوگی۔''

یہ بات ہمارے آقاؤں کو ناگوار گذری اور اس کے فوراً بعد ہی ان کے ہمنواؤں نے اس سوچ کو الٹے سیدھے معنی پہنانے شروع کر دیے اور اب چالیس (40) سالوں کے بعد سازشوں کے گرداب سے نکل کر ہم پھر اسی مقام پر آ گئے ہیں جہاں تذویراتی گہرائی کا نظریہ حقیقت کا روپ دھارنے کا منتظر نظر آتا ہے۔ 1988ء کے بعد امریکہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ افغانستان میں افغان مجاہدین کو حکومت بنانے کا اختیار نہیں دیا جائے گا۔ اگر انہوں نے حکومت بنا لی تو جہادی افغانستان' انقلابی ایران اور اسلامی پاکستان مسلمانوں کی طاقت کا محور اور مضبوط قلعہ بن جائے گا۔ اس لئے سازشوں کا سلسلہ شروع ہے۔ افغان جہادی' دہشت گرد

بن گئے اور شمالی اتحاد کو کابل لا کر ان کی حکومت بنا دی گئی اور یہیں سے خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا اور آخر کار افغان نوجوانوں نے تحریک کی قیادت سنبھال لی جو طالبان کے نام سے آہستہ آہستہ پورے افغانستان پر حاوی ہو گئے۔ یہ ایک ایسی صورت حال تھی جو امریکی مفادات کے خلاف تھی۔ ان حالات سے نمٹنے کے لیے نئی سازشوں کا دور شروع ہوا اور سانحہ نائن الیون (9/11) کا بہانہ بنا کر افغانستان پر حملہ کر دیا گیا۔

الخالد ٹینک کے کامیاب ٹرائل کے بعد ایک سازش کے تحت امریکہ نے جرمنی پر پابندی لگا دی کہ وہ اپنے پانزر (Panzer II) ٹینک کا مطلوبہ نظام ہمیں نہ دے۔ اس پابندی کی وجہ سے الخالد ٹینک کی پیداوار کا عمل تین سال تک رکا رہا۔ اس سلسلے میں ہم نے یوکرائن سے بھی بات کی تھی لیکن ان کی شرط تھی کہ ہم ان سے مطلوبہ نظام کے ساتھ ساتھ ان کے تین سو ٹینک بھی خریدیں۔ اگر ہم نے ان سے تین سو ٹینک خریدنے تھے تو ہمیں الخالد ٹینک بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ بین الاقوامی تعلقات میں ایسا ہوتا رہتا ہے' ہر ملک کو اپنا مفاد عزیز ہوتا ہے اور اپنے مفاد کو سامنے رکھتے ہوئے ہی شرائط طے کی جاتی ہیں۔ الغرض ہماری کوششیں جاری رہیں اور اللہ تعالی کے فضل و کرم سے کامیابی ہمارا مقدر بنی۔

شان کریمی ہے کہ تین دہائیاں گذرنے کے بعد بھی الخالد ٹینک' ٹیکنالوجی اور صلاحیت کے لحاظ سے ہماری فوج کا مایہ ناز Weapon System ہے جو پاکستان اور چین کے ہنرمندوں کی اعلی صلاحیتوں کی درخشندہ تصویر ہے۔

باب ششم:

فوج کی قیادت سنبھالنے کے بعد اہم اقدامات

1980ء کی دہائی کے آٹھ سال پاک فوج کے ترقیاتی منصوبے مکمل کرنے میں لگے جس کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ مربوط طریقے سے ان منصوبوں کی افادیت کا اندازہ کیا جائے اور متعدد نئے کانسپٹس (Concepts) کو بھی آزمایا جائے کہ وہ کہاں تک قابل عمل ہیں۔ اس لئے جی ایچ کیو میں وار گیمز (War Games) شروع کئے گئے تاکہ ذہنی طور پر صحیح اندازہ ہو سکے کہ ترقیاتی عمل اور ہماری جنگی ترجیحات ایک دوسرے سے کہاں تک ہم آہنگ ہیں۔ ایسے تجربات ایک سال تک جاری رہے۔ اس کے بعد عملی طور پر تجربہ کرنے کے لئے ضرب مومن مشقوں کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔ پاکستان میں پہلی بار اتنی بڑی مشقوں کا فیصلہ کیا گیا جس میں پاک فوج کی پوری نفری کے تقریباً پچاس فیصد سے زیادہ نے حصہ لیا۔

نئے حقائق کا ادراک کرتے ہوئے ابلاغ عامہ کے کردار کو تسلیم کیا گیا اور گلاس ناسٹ (Glossnost) کی پالیسی اختیار کی گئی تاکہ مسلح افواج کے بارے میں جو اطلاعات وہ حاصل کرنا چاہیں' انہیں فراہم کی جائیں اور عوام کو عملی دفاعی معاملات سے باخبر رکھا جائے۔ اس مقصد کے لئے آئی ایس پی آر کو خصوصی مشن سونپا گیا اور تین سالوں تک مختلف شہروں میں دفاعی معاملات پر سیمینار منعقد کروائے گئے جن میں دانشوروں' صحافیوں' سابق سفیروں اور سابق فوجی افسروں نے بھرپور شرکت کی اور دفاع کے مختلف پہلوؤں پر اپنی آراء کا اظہار کیا' آگہی پیدا کی گئی تاکہ سول ملٹری تعلقات بہتر ہوں۔

یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان نے جو تین جنگیں لڑی ہیں ان پر سیمینار کروائے جائیں اور ان میں ایسے افراد اپنے خیالات کا اظہار کریں جنہوں نے ان جنگوں میں عملاً حصہ لیا تھا۔ اس سلسلے میں 1948ء کی جنگ کے بارے میں سات سیمینار منعقد کروائے گئے جو راولپنڈی' کراچی' لاہور' پشاور' مظفرآباد' بھمبر اور سکردو میں منعقد ہوئے۔ ان سیمیناروں میں 1948ء

کے جہاد کشمیر کے بہت سے اہم پہلو سامنے آئے جو اس سے پہلے منظر عام پر نہیں آئے تھے۔ مثلاً عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اس خبر کے ملنے پر کہ بھارتی فوج سری نگر میں اترنے کو ہے' قائداعظم نے اس وقت کے کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی کو حکم دیا تھا کہ وہ دو بریگیڈ فوج جموں اور سری نگر بھیج دیں لیکن جنرل گریسی نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔

مظفرآباد میں ہونے والے سیمینار میں میجر جنرل (ریٹائرڈ) وجاہت حسین نے جو 1948ء میں قائداعظم کے اے ڈی سی تھے' ایک مختلف کہانی بیان کی جو سیاق و سباق میں درست معلوم ہوتی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ جو لوگ قائداعظم کو قریب سے جانتے ہیں وہ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اگر جنرل گریسی نے قائداعظم کی حکم عدولی کی ہوتی تو قائداعظم انہیں فوراً برطرف کر دیتے۔ قائداعظم نے تو برطانیہ کے وائسرائے کی بات نہیں مانی تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی خواہش تھی کہ وہ آزاد ہونے والے دونوں ممالک' پاکستان اور ہندوستان کے گورنر جنرل بنیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کی بات مان لی تھی لیکن قائداعظم نے صاف انکار کر دیا تھا۔

ماؤنٹ بیٹن اس پر سخت ناراض تھا۔ اس نے قائداعظم کو دھمکی دی کہ" آپ کو اس کا انجام معلوم ہے؟" قائداعظم نے جواب دیا تھا "چند سو ملین ڈالر کے اثاثے۔" ان کا اشارہ تقسیم کے وقت دونوں ملکوں کے درمیان اثاثوں کی تقسیم کی طرف تھا۔ تو ایسے آہنی ارادے اور مضبوط کردار کے مالک سے یہ توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے ماتحت کمانڈر انچیف کی حکم عدولی برداشت کر لیتے بلکہ تین سالوں تک انہیں عہدے پر برقرار بھی رکھتے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ نہ صرف وہ اپنے عہدے پر برقرار رہے بلکہ تین سالوں تک کمانڈر انچیف کے طور پر پاکستان ہی میں رہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حقائق کچھ اور تھے۔

جنرل گریسی کی جانب سے قائداعظم کی حکم عدولی کی بات سب سے پہلے ایک کتاب "مشن ود ماؤنٹ بیٹن" (Mission with Mountbatten) میں لندن سے شائع ہوئی۔ جب جنرل وجاہت نے یہ بات جنرل گریسی کو بتائی تو وہ ہنسے اور انہوں نے اس

الزام کی تردید کرتے ہوئے وضاحت کی کہ

''انہیں قائداعظم کی طرف سے یہ احکامات ملے ضرور تھے لیکن جب انہوں نے قائداعظم کو اصل صورت حال سے آگاہ کیا کہ پاک فوج کو جو افسر اور جوان ملے تھے وہ اس وقت تک بھارت میں پھنسے ہوئے تھے۔ لٹ پٹ کر جو افراد پاکستان پہنچ رہے تھے انہیں مختلف یونٹوں اور فارمیشنوں میں تعینات کیا جا رہا تھا لیکن نفری پوری نہیں تھی۔ پوری فوج منتشر حالت میں تھی۔ انہی دنوں سیلاب کی تباہ کاریوں نے قیامت برپا کر رکھی تھی۔ سیالکوٹ بریگیڈ کی یونٹیں سیالکوٹ سے لے کر میانوالی تک پھیلی ہوئی تھیں اور پنڈی بریگیڈ کی یونٹیں مردان، سرگودھا اور لائل پور (موجودہ فیصل آباد) تک پھیلی ہوئی تھیں اور سیلاب زدگان کی امداد میں مصروف تھیں۔ کوئی ایک یونٹ بھی سالم حالت میں موجود نہیں تھی۔ میں نے یہ ساری صورت حال قائداعظم کو بتائی تو وہ خاموش ہو رہے۔''

دلچسپ ترین سیمینار سکردو میں منعقد ہوا۔ شمالی علاقہ جات جنہیں اب گلگت بلتستان کہا جاتا ہے کشمیر کا حصہ تھے اور چونکہ یہاں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی اس لئے عوام کی خواہش پاکستان میں شمولیت کی تھی لیکن جب مہاراجہ کشمیر نے ہندوستان سے الحاق کا فیصلہ کیا تو گلگت بلتستان کے لوگوں نے اپنے طور پر آزادی کی جنگ شروع کر دی۔ گلگت میں موجود گلگت سکاؤٹس کے دلیر صوبیدار میجر محمد بابر نے اپنے کمانڈنگ آفیسر اور سیکنڈ ان کمانڈ کو بیرکوں میں بند کر دیا۔

شمالی علاقوں کی آزادی کی جنگ پر سکردو میں ہونے والے سیمینار کے مقررین

مہاراجہ کی طرف سے مقرر کردہ گورنر بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ کو گرفتار کر لیا۔ پھر گورنر کی طرف سے ایک پیغام بونجی میں موجود بھارتی یونٹ 6 جموں اینڈ کشمیر بٹالین کے کمانڈنگ آفیسر لیفٹیننٹ کرنل عبدالمجید کو بھیجا کہ وہ فوراً گلگت آئیں۔ وہ گھوڑے پر سوار گلگت پہنچے تو صوبیدار میجر بابر نے ان کا استقبال کیا اور گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے انہیں بتایا کہ

گلگت سکاؤٹس کے کمانڈنگ آفیسر میجر براؤن اور سیکنڈ ان کمانڈ کیپٹن میتھی کو بیرکوں میں بند کر دیا گیا ہے اور گورنر گھنسارا سنگھ کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ عوام بھارت سے آزادی چاہتے ہیں اور اب آپ ان کی رہنمائی کریں۔

کرنل عبدالمجید نے صوبیدار میجر کو ڈانٹ پلائی کہ یہ کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ بھارت ایک بہت بڑی قوت ہے اور اس سے لڑنا حماقت ہوگی۔ یہ سن کر صوبیدار میجر بابر نے کرنل عبدالمجید کو بھی بیرکوں میں قید کر دیا۔ ادھر بونجی میں بھارتی یونٹ کے مسلمان افسروں نے مجاہدین کی آمد کا حوا کھڑا کر کے ہندو اور سکھ افسروں کو بھگا دیا اور اسلحہ اور گولہ بارود پر قبضہ کر لیا۔ پاکستان آرمی کی طرف سے میجر اسلم کو گلگت سکاؤٹس کا آفیسر کمانڈنگ پوسٹ کیا گیا اور انہی کے بھائی میجر انور کو ڈی کیو پوسٹ کیا گیا۔ میجر اسلم نے 6 جموں اینڈ کشمیر بٹالین کے مسلماں افسروں کے ساتھ مل کر منصوبہ بندی کی اور 28 ہزار مربع میل کا علاقہ آزاد کرایا۔

جنرل گریسی نے ان آپریشنز پر تبصرہ کرتے ہوئے انہیں نپولین بونا پاٹ کے بعد جنگی اصولوں کے استعمال کی بہترین مثال قرار دیا۔ سیمینار میں بریگیڈیئر اسلم بھی موجود تھے' میجر انور بھی اور وہ افسر بھی جو بھارتی یونٹ سے ان کے ساتھ آ شامل ہوئے تھے' جیسے گروپ کیپٹن شاہ خان' میجر محمد خان جرال اور بہت سے نان کمیشنڈ آفیسرز اور سویلین جنہوں نے بہادری کی نئی داستانیں رقم کیں۔ میجر محمد خان جرال نے دو مختلف موقعوں پر سری نگر سے آنے والے دو بریگیڈ فوج کو آگے بڑھنے سے روکا تھا۔ میجر (اس وقت لیفٹیننٹ) محمد خان جرال اس فوجی دستے کے کمانڈر تھے جس نے سری نگر سے بریگیڈیئر فقیر سنگھ کی قیادت میں آنے والے بریگیڈ کو گھات لگا کر تباہ کیا۔ انہوں نے اس واقعے کی تفصیلات سنائیں:

مجھے دو پلاٹون دے کر یہ مشن سونپا گیا کہ بریگیڈیئر فقیر سنگھ کی قیادت میں آنے والے بریگیڈ کا راستہ روکوں جو سکردو میں محصور بھارتی فوجیوں کی مدد کے لئے آ رہا تھا۔ میں نے علاقے کی ریکی کی اور سکردو اور گول کے درمیان ایک جگہ "تورگ پڑی" میں گھات لگانے کا فیصلہ کیا۔ اس جگہ دریا یکدم پڑتا ہے اور اس کے کنارے کا راستہ بھی تنگ ہو جاتا ہے۔

گزرنے والے دستے کے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ وہ یہاں سے گزرنے کے لئے سمٹ جائیں۔ میں نے حوالدار نذیر احمد کو ایک مشین گن دے کر اس جگہ "سٹاپنگ پوائنٹ" بنانے کا حکم دیا کہ دشمن کے کسی شخص کو اس جگہ سے آگے نہیں جانے دینا۔ بھارتی دستے ۱۷ مارچ ۱۹۴۸ء کو گھات والے علاقے میں داخل ہوئے۔ یہاں رک کر پہلے انہوں نے کھانا کھایا اور پھر یہ سمجھ کر کہ ان کے سفر کا مشکل ترین راستہ تو طے ہو چکا' وہ لاپرواہی سے سکردو کی طرف بڑھنے لگے۔

جیسے ہی ان کے آگے چلنے والے افراد "سٹاپنگ پوائنٹ" پر پہنچے' حوالدار نذیر احمد نے مشین گن سے فائرنگ شروع کر دی۔ یہ باقی لوگوں کے لئے بھی سگنل تھا کہ وہ فائر کھول دیں۔ دریا پار متعین دونوں پلاٹونوں نے فائر کھول دیا۔ بھارتی فوجیوں کو جوابی کاروائی کا موقع ہی نہ مل سکا۔ وہ اندھا دھند ادھر ادھر بھاگنے لگے لیکن کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ زیادہ تر فوجی ہلاک ہو گئے: صرف وہ چند افراد بچ گئے جو بالکل آخر میں تھے۔ وہ بھاگ کر گھات کے علاقے سے نکل گئے۔ ان میں بریگیڈیئر فقیر سنگھ بھی شامل تھا۔ مجاہدین کے ہاتھ لگنے والی چیزوں میں ایک لاکھ گولیاں' مارٹر توپیں' مشین گنیں اور اشیائے خورد و نوش کی بڑی مقدار شامل تھی جو وہ سکردو میں محصور فوجیوں کے لئے لا رہے تھے۔

بھارتیوں نے سکردو گیریژن کی رہائی کے لئے ایک اور کوشش کی اور ایک دوسرا بریگیڈ مختلف راستے (براستہ استور) بھیجنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ وہ زیادہ محتاط اور چوکنے تھے لیکن لیفٹیننٹ محمد خان جرال ان سے زیادہ مستعد اور ہوشیار تھے۔ انہوں نے گھات لگائی اور دشمن کو کافی جانی نقصان پہنچا کر راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔

گروپ کیپٹن شاہ خان 1948ء میں لیفٹیننٹ تھے۔ جب یہ خبریں ملیں کہ بھارت کا ایک بریگیڈ کارگل دراس میں مجتمع ہو رہا ہے اور برف پگھلنے پر درہ برزل کو عبور کر کے استور کے راستے گلگت' سکردو آئے گا اور مجاہدین کو نقصان پہنچائے گا' میجر اسلم نے لیفٹیننٹ شاہ خان کی قیادت میں 600 افراد اکٹھے کئے' انہیں "اسکیموفورس" کا نام دیا گیا۔

ان کے ساتھ 150 بوجھ اٹھانے والے افراد بھی تھے جنہوں نے ایمونیشن کے 130 بکس، مارٹر کے 6 بکس اور ایک مشین گن اٹھائی۔ ہر شخص نے تین دن کا کھانا اور 150 گولیاں اٹھائی ہوئی تھیں۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ جوتے تھے تو جرابیں نہیں تھیں۔ قمیض تھی تو سویٹر نہیں تھا۔ آٹے میں خوبانیاں وغیرہ ملا کر روٹیاں بنائی گئیں جسے مقامی زبان میں "بچٹی" کہتے ہیں، وہ کھانے کے طور پر جوانوں میں تقسیم کر دی گئیں۔ بھوک کے وقت اس بچٹی کو تھوڑا تھوڑا کر کے کھانا تھا اور پیاس کی شکل میں برف چوسنی تھی۔ آٹے کی بوریوں کو پھاڑ کر اس کے ٹکڑے جوانوں میں تقسیم کر دیے گئے جو انہوں نے اپنے پیروں پر لپیٹ لئے۔ ایک اور مسئلہ دھوپ سے بچنے کا تھا، جب برف پر سورج چمکتا ہے تو اتنی زیادہ چمک پیدا ہوتی ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ شہتوت کے پتوں میں چھوٹے چھوٹے سوراخ کر کے لچکدار شاخوں کی مدد سے کمانیاں بنائی گئیں اور انہیں عینکوں کے طور پر استعمال کیا گیا۔

اس "تیاری" کے ساتھ "اسکیموفورس" کو درہ برزل عبور کر کے کارگل کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ راستے میں کوئی درخت، جھاڑی یا غار نہیں تھی جہاں ستانے کے لئے قیام کیا جاتا۔ حکم یہ تھا کہ چلتے رہنا، چلتے رہنا۔ میجر اسلم نے ہدایت کی تھی کہ رات کے وقت اور صبح سویرے برف سخت ہوگی اور اس پر چلنا آسان ہوگا۔ جو بات نہیں بتائی گئی تھی، یہ تھی کہ جب سورج نکلتا تو برف اتنی نرم ہو جاتی کہ لوگ کمر کمر تک برف میں دھنس جاتے لیکن چلتے رہنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

تین دن تک وہ چلتے رہے، چلتے رہے، گلتری پہنچے تو مقامی لوگوں نے کھلی بانہوں سے ان کا استقبال کیا، جس کے پاس جو کچھ تھا لا حاضر کیا۔ آٹا، گھی، چینی، سوجی، ایک شخص نے آٹے کا ایک کنستر مجاہدین کے لئے بچا کر رکھا تھا وہ خود بھوک سے مر گیا لیکن اس نے آٹے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ یہ تھا گلگت بلتستان کے لوگوں کی قربانیوں کا عالم، جنہیں ہم نے ساٹھ سالوں تک ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا اور پاکستان کے کسی فورم پر مناسب نمائندگی

تک نہیں دی۔

بہت سے لوگوں کی آنکھیں، برف سے منعکس ہوتی ہوئی تیز کرنوں کی وجہ سے سوج گئی تھیں۔ اس کا یہ علاج کیا گیا کہ چائے بنا کر لوگوں کو پلائی گئی اور چائے کی پتیوں کا پلپس بنا کر بند آنکھوں پر رکھ دیا گیا۔ اللہ کے فضل سے ایک ہی رات میں اکثریت کی آنکھیں ٹھیک ہو گئیں۔ ایک دن آرام کے بعد یہ فورس کارگل اور دراس کی طرف بڑھی۔ بھارت کے زولو بریگیڈ کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ فروری کے مہینے میں کوئی فورس درہ برزل کو عبور کر لے گی۔ وہ بے خبری میں مارے گئے۔ اسکیموفورس نے حیرانگی (Surprise) کے جنگی اصول پر عمل کرتے ہوئے پورا بریگیڈ تباہ کر دیا۔ صوبیدار نصیب علی اپنے ساتھیوں سمیت سکردو سے بہت دور زاسکر میں مصروف کار تھے۔ گلگت سکاؤٹس کی کمان میں تبدیلی کے بعد نئے کمانڈر نے معاملات کو سمجھنے تک تمام کاروائیاں روک دیں اور کارگل اور لداخ میں مصروف کار فوجی دستوں کو واپسی کا حکم دیا۔ اس کے نتیجے میں زاسکر کے فوجی دستے تنہا رہ گئے اور انہیں دشمن نے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ صوبیدار نصیب علی ان محصورین میں شامل تھے۔ انہوں نے واقعہ تفصیل سے بتایا، سامعین گوش برآواز تھے۔ انہوں نے بتایا۔

> "ہم پدم ہی میں محصور تھے جب دونوں ملکوں میں جنگ بندی ہوگئی۔ ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں تھی۔ ہندوؤں نے صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہمیں لکھا کہ گلگت تک کا علاقہ بھارت میں شامل ہو چکا ہے اور مزید مزاحمت کا کوئی فائدہ نہیں، ہتھیار ڈال دو۔ ہم سے وعدہ کیا گیا کہ ہمیں بحفاظت دہلی بھجوا دیا جائے گا۔ ہم نے جواب دیا کہ اگر پوری دنیا بھی بھارت میں شامل ہو جائے پدم پاکستان کا حصہ ہی رہے گا۔"

ہمیں خدشہ ہوا کہ کہیں ہماری حکومت یہ نہ سمجھ لے کہ ہم مارے گئے ہیں، ہم نے صوبیدار غلام علی کو دو جوانوں کے ساتھ پاک فوج کی طرف بھیجا کہ وہ انہیں ہمارے حال سے مطلع کریں۔ دو مہینوں کے بعد میجر غلام مرتضیٰ ہمیں لینے آئے اور ہمیں نکال کر پیارے

پاکستان کی آزاد سرزمین میں لے گئے۔ بعد میں گلگت میں وزیراعظم پاکستان لیاقت علی خان سے ہماری ملاقات کرائی گئی جنہوں نے شاندار الفاظ میں ہماری خدمات کو سراہا۔

گلگت' بلتستان کی آزادی کی جنگ کے ایسے کئی واقعات ہیں جو کہیں ریکارڈ پر نہیں آسکے۔ آئی ایس پی آر کے زیر اہتمام ہونے والے مذاکروں کی کاروائیاں ''ڈیفنس اینڈ میڈیا'' (Defence & Media Journal) میں شائع ہوتی رہی ہیں جسے راقم الحروف نے مرتب کیا تھا اور یہ جریدے اس وقت کے ڈائریکٹر آئی ایس پی آر بریگیڈئر سید محمد اقبال اور ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل ریاض اللہ کی سرپرستی میں شائع ہوئے تھے لیکن عام آدمی کی ان تک رسائی نہیں ہوئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ کاروائی اردو میں شائع کی جائے تاکہ گلگت بلتستان اور پاکستان کے عوام شجاعت و دلیری کی ان داستانوں سے آشنا ہوسکیں۔ ہماری رائے تو یہ ہے کہ اسے گلگت بلتستان کے تعلیمی اداروں کے نصاب میں شامل کیا جانا چاہیے۔

آزادی کے بعد گلگت میں ایک ''انقلابی کونسل'' قائم کی گئی جس کے سربراہ گلگت کے راجہ شاہ رئیس خان تھے۔ انہوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ پشاور کے راستے قائداعظم کو ٹیلیگرام دیا کہ ہم نے اس علاقے کو آزاد کرالیا ہے' یہ پاکستان کی امانت ہے' آپ اپنے کسی نمائندے کو بھیجیں جو آکر یہاں کا انتظام و انصرام سنبھالے۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ حکومت پاکستان کی طرف سے یہ جواب دیا جاتا کہ آپ ہی پاکستان کے نمائندے ہو' آپ ہی کاروبار حکومت بھی چلائیں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ حکومت پاکستان کی طرف سے ایک بیوروکریٹ سردار عالم خان کو پولیٹیکل ایجنٹ کے طور پر بھیجا گیا۔ اس کے بعد کی کہانی ایک دکھ بھری داستان ہے کہ ان علاقوں کے عوام کو کہیں نمائندگی نہیں ملی۔ پیپلز پارٹی کے دور میں انہیں مقامی سطح پر اپنے نمائندے چننے اور اپنے معاملات خود چلانے کا اختیار حاصل ہوا۔

پاک فوج کی قیادت سنبھالنے کے فوراً بعد میں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ پاکستانی فوج کی ترتیب نو اس طرح کی جائے کہ ملینیم 2000ء اور اس سے آگے بھی وہ اپنی دفاعی ذمہ داریاں احسن طریقے سے انجام دے سکے اور مندرجہ ذیل اہداف بھی حاصل کرلے:

☆ دفاعی حکمت عملی (Defensive Strategy) کو جارحانہ دفاعی حکمت عملی (Offensive Defense Strategy) کے ساتھ ہم آہنگ کردیا جائے۔

☆ پاکستانی قوم کو فوج کی نئی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہوسکے جو 1971ء کی جنگ کے بعد مشکوک ہوگیا تھا۔

☆ دشمنوں کو بھی واضح پیغام دیا جائے کہ پاکستانی فوج ملک کی سرحدوں کی حفاظت کی بھرپور صلاحیت حاصل کرچکی ہے۔

پاکستانی قوم کو اپنی فوج کی نئی صلاحیتوں سے آگاہ کرنے کے لئے میڈیا کا بھرپور سہارا لینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ایک سو (100) نوجوان صحافیوں کو ضرب مومن مشقوں میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ یوں ''ضرب مومن'' کے نام سے نومبر 1989ء میں مشقوں کا آغاز ہوا۔ ان نوجوان صحافیوں کو پہلے مختلف یونٹوں اور ہیڈکوارٹروں کا دورہ کرایا گیا تاکہ وہ فوج کی تنظیم اور طریق کار سے اچھی طرح واقف ہوجائیں پھر انہیں بلیولینڈ اور فوکس لینڈ کی مختلف یونٹوں سے منسلک کردیا گیا۔ انہیں وردیاں مہیا کی گئیں اور سردیوں کی مناسبت سے جیکٹیں بھی فراہم کی گئیں' بوٹ اور فیلڈ کٹ بھی دی گئیں۔ انہی کے ساتھ میرے بیٹے مرزا وجاہت مصطفیٰ بیگ نے بھی جوانوں کے ساتھ تین ہفتے گذارے۔

اگرچہ نوجوان صحافیوں کی ایک بڑی تعداد نے بڑے جوش و خروش سے مشق میں شامل ہونے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ پریس میں سوالات کی بارش شروع ہوگئی:

☆ مشقیں تو ہوتی رہتی ہیں لیکن ان کی نمائش کا ایسا اہتمام اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا؟

☆ ان مشقوں کے پس پردہ کون سی مشقیں ہورہی ہیں؟

☆ فوج کو گلاس ناسٹ کی ضرورت کیا ہے؟

☆ اس سے کیا حاصل کرنا مقصود ہے؟

☆ اتنے زیادہ اخراجات کی کیا ضرورت تھی؟

☆☆ اور بہت سے سوالات۔

اس طرح کے بہت سے سوالات کے جواب دینے کے لئے پریس کانفرنس بلائی گئی جو 13 ستمبر 1989ء کو آرمی آڈیٹوریم میں منعقد ہوئی' جس میں قومی اخبارات اور ممتاز رسائل کے ایڈیٹروں' کالم نگاروں' قلمکاروں اور سینئر رپورٹروں نے شرکت کی۔ اس بریفنگ کا مقصد اخباری دنیا سے متعلق افراد کو اس مشق کے مقاصد اور وسعت سے آگاہ کرنے کے علاوہ فوج میں افرادی قوت کی بھرتی' تربیت' کیریئر کی منصوبہ بندی' اسلحہ کی فراہمی اور بجٹ کی تفصیلات سے متعلق اطلاعات فراہم کرنا تھا۔ اس موقع پر مندرجہ ذیل موضوعات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ متعلقہ پی ایس اوز (PSOs) اور ڈائریکٹر جنرلز (Director Generals) نے خود بریفنگ دی:

(۱) فوجی مشق ضرب مومن: انسپکٹر جنرل ٹریننگ اینڈ ایویلوایشن لیفٹیننٹ جنرل عارف بنگش

(۲) فوج میں افسروں کی تربیت: ڈائریکٹر جنرل ملٹری ٹریننگ میجر جنرل نصیر اختر

(۳) کیریئر مینجمنٹ: ملٹری سیکرٹری لیفٹیننٹ جنرل فرخ خان

(۴) اسلحہ کی خریداری: ڈائریکٹر جنرل کمبیٹ ڈیویلپمنٹ میجر جنرل ایم اے طارق

(۵) آرمی میں بجٹ کی تیاری: ڈائریکٹر جنرل بجٹ میجر جنرل عزیز محمد خان

اس کے بعد میں نے صحافیوں سے خطاب کیا۔ مختصر متن پیش خدمت ہے:

جناب میر خلیل الرحمٰن صاحب' پریذیڈنٹ آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

معزز خواتین و حضرات:

السلام علیکم

میری دعا ہے: "اے میرے رب' میرا سینہ کشادہ کردے اور میرا کام آسان بنادے اور میری زبان سے گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔"

میرے لئے یہ امر خوشی کا باعث ہے کہ میں آج یہاں نامور صحافیوں اور اہل قلم کے

درمیان ہوں۔ بالخصوص میرے کچھ سینئر بھی یہاں تشریف فرما ہیں جو میرے لئے حوصلہ افزائی اور اعتماد کا باعث ہے۔ جس خوشدلی کے ساتھ آپ نے ہماری ان مشقوں کے حوالے سے ہمارا ساتھ دیا ہے میں اس کے لئے اپنے تمام رفقاء اور اپنی جانب سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ امید رکھتا ہوں کہ ہماری یہ جدوجہد آپ کی توقعات پر پوری اترے گی۔ اسی طرح کی ایک بریفنگ چند ماہ پہلے منعقد ہوئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ اس خلا کو پر کیا جائے جو مسلح افواج اور قوم کے درمیان موجود ہے۔ انشاء اللہ آپ کی رہنمائی اور حمایت سے ہم یہ خلا پر کرسکیں گے۔

افواج پاکستان اور پاکستان کے عوام کے درمیان مکمل ہم آہنگی اور مفاہمت ہونی لازم ہے۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو سوالات کی دعوت دوں' میری گذارش ہے کہ سیاسی سوال سے گریز کیجئے گا۔ ہمارا مشن بالکل واضح ہے' کہ ہم ملک کو اندرونی اور بیرونی جارحیت کے خطرے سے محفوظ رکھیں۔ آپ ہمارے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے 17 اگست کے واقعات کو ضرور مدنظر رکھیں جب ایک ایسا المیہ رونما ہوا جس میں ہمارے صدر' ہماری فوج کے چیف آف آرمی سٹاف اور کئی سینئر ساتھی لقمہ اجل بن گئے۔ اس صورت حال میں ہم نے جو فیصلہ کیا وہ نیک نیتی پر مبنی تھا۔ اسے ملک کے اندر اور باہر سراہا گیا۔ اس فیصلے کے صحیح ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس سے آج فوج کا وقار بلند ہوا ہے اور ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اس فیصلے کا پاس رکھیں اور اس کی اس حد تک تائید کریں کہ ہم ان مقاصد کو حاصل کرسکیں جو ہمارے ذہن میں ہیں کہ ہم ملک کو اندرونی اور بیرونی خطرے کے خلاف مضبوط حفاظتی چھاتہ مہیا کریں۔

سوال:...... جنرل صاحب' میرا سوال ہے کہ ضرب مومن کا مرکزی خیال اور مقصد کیا ہے اور کیا پاکستان کو دشمن کی طرف سے درپیش کسی مخصوص خطرے سے اس کا تعلق ہے؟

جواب:...... جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ ضرب مومن سے ہم سلامتی کے بدلے ہوئے ماحول میں ایک فورس کی حیثیت سے اپنی جانچ پڑتال اور آزمائش کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اب ہمیں دوطرفہ جنگ کا خطرہ درپیش نہیں ہے۔ اگرچہ افغانستان کے مسائل

ابھی تک حل نہیں ہوئے لیکن فوجی خطرہ بڑی حد تک کم ہو گیا ہے۔ مغربی محاذ پر جو کچھ تھا' اس میں سے بہت کچھ ہمیں اب میسر ہے۔ الحمد للہ آج ہمارے ہاتھ میں ریزرو کی ایک بڑی تعداد ہے جسے ہم اپنی مضبوط جنگی حکمت عملی بنانے کے لئے استعمال کریں گے۔

ایک چھوٹے ملک کے لئے جس کے وسائل بھی کم ہوں' دفاعی حکمت عملی اختیار کرنا شکست کے مترادف ہے۔ ماضی میں اس پر عمل ہوتا آیا ہے۔ اب ہماری سوچ میں بہت بڑی تبدیلی آئی ہے اور وہ ہے جارحانہ دفاع کی پالیسی۔ اس لئے مجھے یہ سوچنا تھا کہ اس پالیسی کو عملی شکل کیسے دی جائے۔ مشقوں کا ایک بڑا مقصد یہی ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے سات آٹھ برسوں میں ہم نے بھاری تعداد میں نیا اسلحہ اور سازوسامان حاصل کیا ہے جس کا ٹیسٹ ضروری ہے اور وہ بھی ہمارے تزویراتی نقشے کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ ہم نے فوج میں تنظیمی تبدیلیاں بھی بہت کی ہیں۔ اس مشق میں ان کا امتحان بھی ہو جائے گا لیکن میرا اہم سرمایہ میرے سینئر افسران ہیں جو ماضی کے کمانڈروں سے بہت مختلف ہیں۔ صرف اس لئے کہ وہ زیادہ پڑھے لکھے ہیں' بہتر تربیت یافتہ اور بہتر پیشہ ور ہیں' انہوں نے ایک نظم کے تحت تعلیم و تربیت مکمل کی ہے۔ اس لئے ہماری تمام ترجیحات اور اقدامات knowledge based ہیں۔

نیشنل ڈیفنس کالج جیسے ادارے میں ہمارے سینئر افسروں کی تربیت ہوتی ہے۔ وہاں سے فارغ التحصیل ہو کر یہ افسر اپنے پیشے میں زیادہ مہارت رکھتے ہیں اور جنگی منصوبے سوچنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کے ماہر ہیں۔ فوجی حکمت عملی بنا سکتے ہیں' اسٹریٹجی اور Tactics کو آپس میں مربوط کر کے وار پلان تیار کر سکتے ہیں۔ بڑی فارمیشن اور فوج کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ میں ان کی اس صلاحیت پر فخر کر سکتا ہوں۔ اسی لئے یہ مشقیں منعقد کرنے کے بارے میں پر اعتماد ہوں۔

سوال:...... آپ براہ کرم اپنی اس اسٹریٹجی اور نظریے کی تشریح کریں جسے آپ مشق میں ٹیسٹ کرنا چاہتے ہیں۔ اس بڑی مشق کے لئے بے شمار انتظامی مسائل درپیش ہوں گے۔ آپ ان پر کیسے قابو پائیں گے۔ آپ کو اور کن محاذوں سے جارحیت کا خطرہ درپیش ہوگا؟

جواب:...... ہمارا بنیادی مقصد جارحانہ دفاع (Offensive Defence) کی حکمت عملی اپنانا ہے جس کے لئے ہمیں بہت سی تنظیمی تبدیلیاں کرنا پڑی ہیں۔ نئی یونٹیں اور فارمیشنیں تشکیل دی ہیں' چودہ مختلف جنگی منصوبے (Concepts) وضع کئے ہیں۔ وار گیمنگ (War Gaming) کی ہے اور اب ان مشقوں کے ذریعے ان کانسپٹس (Concepts) کا تجزیہ کر سکیں گے۔ انتظامی اور دفاعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہم نے دفاعی محاذوں پر فوج کو چوکس رکھا ہے اور ہمارا پورا لاجسٹک سپورٹ سسٹم (Logistic Support System) ان مشقوں میں شامل ہے۔ ان مشقوں میں پہلی دفعہ تمام شعبوں کی صلاحیت کو پرکھا جائے گا اور پہلی دفعہ ہمارے کور کمانڈر تک کی صلاحیتوں کو آزمایا جائے گا۔

سوال:...... 29 سال پہلے "تیز گام" مشقوں کے بعد یہ فوج کی پہلی بڑی مشق ہے۔ یہ تیز گام سے کتنی مختلف ہے؟

جواب:...... پہلی بات تو یہ ہے کہ "تیز گام" اور اس مشق کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ "تیز گام" مشق میں ایک ڈویژن سے کچھ زیادہ فوج نے حصہ لیا تھا' جبکہ ضرب مومن مشقوں میں 5 کوریں اور فوج کا پورا لاجسٹک سپورٹ کا نظام شامل ہوگا۔ اس مشق کی جہت' اس کا تصور مختلف ہے اور اس میں ایک بالکل مختلف سٹریٹجی کو ٹیسٹ کیا جائے گا۔

سوال:...... پاک فضائیہ کا ضرب مومن میں کیا کردار ہوگا۔ دوسرے بحریہ کو مشق میں شامل کیوں نہیں کیا گیا جبکہ بھارت کی طرف سے بحری خطرہ کئی گنا ہو چکا ہے؟

جواب:...... فضائیہ ایک جارحانہ قوت ہے۔ ہم نے فضائیہ کو محدود حد تک شامل کیا ہے اس لئے کہ وسائل کی کمی تھی۔ حکومت نے ہمیں صرف بارہ کروڑ کی رقم دی ہے اور انہی حدود میں رہ کر ہم اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اسی سبب بحریہ بھی ان میں شامل نہیں ہے لیکن اس ضرورت کو ہم War Gaming کے ذریعے پورا کرتے ہیں جو Tri Service وار گیم کی شکل میں منعقد ہوتی رہی ہیں۔

سوال:...... 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں ہمیں جو تجربہ حاصل ہوا تھا کیا وہ ہماری

مستقبل کی منصوبہ بندی میں مدد دے گا۔ آپ نے اس مشق میں ان تجربات کو کس حد تک مد نظر رکھا ہے؟

جواب:...... ہم نے 1965ء اور 1971ء کی جنگیں کسی فوجی منصوبے کے بغیر لڑیں۔ وار کورس کے نصاب میں ان جنگوں کا گہرائی سے تجزیہ کیا جاتا ہے جس سے بڑی دردناک کہانی سامنے آئی ہے۔ یہ تجزیے ہمیں یہ سکھاتے ہیں کہ جنگیں ایسے نہیں لڑی جاتیں۔ 65ء میں ہم نے بڑی ہمت سے جنگ لڑی لیکن اسٹریٹیجی کی سطح پر فائدہ اٹھانے میں ناکام رہے۔ اس طرح 71ء میں ہمیں بڑی شرمناک شکست ہوئی اور اب ہم نے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ ہم ایسی غلطیاں نہیں کریں گے۔ ہم نے مربوط جنگی منصوبے تیار کئے ہیں۔ جنگ لڑنے کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ دفاعی جنگ اس طرح لڑی جائے کہ جارحیت کی حکمت عملی آسان ہو یعنی (Offensive Defence) کے مقاصد حاصل ہو سکیں۔ ماشاء اللہ آج ہمارے پاس ایک فوجی منصوبہ ہے' ایک ایسا تصور ہے جس سے جنگی فوائد حاصل ہوں گے۔ وہ اس لئے ممکن ہے کہ اب ہماری اعلیٰ تربیت یافتہ قیادت قومی سطح پر جنگی منصوبے بنانے اور وسائل مہیا کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

اعلیٰ ٹیکنالوجی کے میدان میں الیکٹرونک جنگ کا خطرہ درپیش ہے۔ اس شعبے میں ہم نے قابل ذکر پیشرفت کی ہے۔ آج کی دنیا میں اعلیٰ ٹیکنالوجی اور الیکٹرونک کی جنگ لڑی جاتی ہے' راڈار استعمال ہوتے ہیں' اسلحے کے ساتھ گائیڈنس نظام کام کرتا ہے' الیکٹرونک مواصلاتی نظام زیر استعمال آتا ہے اور یہ بھی ممکن ہو گیا ہے کہ مواصلات کو مفلوج کر دیا جائے' راڈار کو جام کر دیا جائے' میزائلوں کا گائیڈنس سسٹم تباہ کر دیا جائے۔ ہمیں ان خطرات کا جواب دریافت کرنا ہوتا ہے' دشمن کی اس صلاحیت کا توڑ کرنا ہے اور اسے ناکارہ بنانا ہے' اس کی صلاحیت کم کرنی ہے۔ ہم جو تیاریاں کر رہے ہیں یا کر چکے ہیں وہ انہی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔

سوال:...... یہ مشق بھارت کی براس ٹیک مشقوں سے کتنی مختلف ہے؟

جواب:...... ہم نے ان کی طرح اس مشق کو خفیہ نہیں رکھا۔ انہوں نے جب یہ مشق کی تو ہمیں قطعاً نہیں بتایا کہ اس مشق کا حجم کیا ہے' یہ مشقیں کہاں ہوتی ہیں اور ان کے کیا مقاصد ہیں۔ ہماری مشقیں ہر قسم کے شک و شبے سے بالاتر ہیں۔ ہم نے انہیں پوری طرح باخبر رکھا ہے۔ آج صبح ہی ہمارے ڈائریکٹر جنرل ملٹری آپریشن نے بھارتی ہم منصب سے بات کی ہے اور انہیں مشق کی تفصیلات بتائیں۔ میرا خیال ہے کہ انہیں ہماری مشق کے بارے میں کوئی شبہ یا تشویش نہیں ہونی چاہیے۔

سوال:...... آپ ان مشقوں کے اخراجات کا براس ٹیکس سے کیسے موازنہ کریں گے؟

جواب:...... آپ ہماری مشق کے اخراجات کی تفصیل سن کر حیران رہ جائیں گے۔ بھارتیوں کا کہنا ہے کہ انہوں نے اپنی مشقوں پر تین ارب روپے خرچ کئے۔ ہمارا خرچ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔ حکومت نے ہمیں اس کے لئے صرف 12 کروڑ روپے دیے ہیں اور دو سال کی ٹریننگ گرانٹ ہم نے بچائی ہے۔ انہی پیسوں سے ہم نے آرمی لاجسٹک سپورٹ سسٹم کے اخراجات' جوانوں اور افسروں کے روزانہ الاؤنسز' کسانوں کو تباہ فصلوں کا معاوضہ' 23 ملکوں کے وفود کی مہمانداری اور دوسرے متفرق اخراجات پورے کرنے ہیں۔

سوال:...... کیا آپ جہاد افغانستان پر تبصرہ کریں گے؟

جواب:...... میری خواہش ہے کہ میرے پاس اتنا وقت ہوتا کہ اس مسئلے پر آپ سے تفصیلی بات کرتا کیونکہ میں نے افغان جنگ کا مطالعہ اور تجزیہ بڑے قریب سے کیا ہے۔ 1980ء میں چیف آف جنرل سٹاف اور اس کے بعد پشاور کور کمانڈر کی حیثیت سے مجھے قریب سے جنگ کو دیکھنے کا موقع ملا ہے اور حیران کن امر یہ ہے کہ بعض اوقات میرے تبصرے اور تجزیے سرکاری نظریے اور تجزیات سے مختلف ہوا کرتے تھے اور میں یہ کہنے میں فخر محسوس کرتا ہوں کہ میرے اکثر تجزیے درست ثابت ہوئے ہیں۔ افغان جہاد اور اسے کنٹرول کرنے کی ہماری صلاحیت کو سمجھنے کے لئے میں گزشتہ سال کے اوائل کے واقعات کا تذکرہ کروں گا جب روس نے افغانستان سے فوجیں واپس لے جانے کا غیر متوقع فیصلہ کر لیا تھا۔

اس غیر متوقع فیصلے اور روس کی افغانستان سے پسپائی میں مجھ ناچیز کا بھی حصہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ 1986ء میں روسیوں نے افغانستان کی جنگ میں ہیلی بورن کمانڈو بریگیڈ شامل کر دیے تھے جس کے سبب مجاہدین کو بری طرح مار پڑ رہی تھی۔ اسی دوران امریکہ کی سنٹرل کمانڈ کے جنرل کرسٹ (Christ) آئے' انہیں میں نے بریفنگ دی۔ وہ حیران تھے کہ ایسا تو انہیں کسی نے بھی نہیں بتایا۔ وہ واپس گئے تو دوسرے ہفتے امریکی فوج کے کمانڈر جنرل وکھم (Wikham) آئے۔ انہوں نے بھی حالات کا جائزہ لیا اور واپس جا کر مجاہدین کو اسٹنگر میزائیل دینے کا فیصلہ کیا اور چند ہفتوں میں مجاہدین نے سات روسی ہیلی کاپٹر مار گرائے۔ اس طرح روسیوں کا آخری جنگی حربہ بھی ناکام ہوگیا۔ وہ ہار مان گئے اور مجاہدین سے اجازت مانگی کہ ان کی فوج کو افغانستان سے نکل جانے کی اجازت دی جائے۔

یہ فرق ہے روس اور امریکہ میں کہ جنگ ہار جانے کے باوجود امریکہ افغانستان سے نکلنا نہیں چاہتا اور 1990ء کی طرح اپنی سازشوں میں مصروف ہے۔ روسیوں کی پسپائی کے بعد افغانستان میں ایک خطرناک صورت حال پیدا ہوئی ہے کیونکہ امریکہ نے افغانستان کے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں اور پاکستان کو الگ کر دیا ہے۔ مجاہدین کو اقتدار سے دور رکھ کر اپنی مرضی کی حکومت بنانا چاہتا ہے۔ مجاہدین کو آپس میں لڑانے کا منصوبہ ہے۔ بڑے خطرناک عزائم ہیں۔ اللہ ہم پر رحم کرے۔

سوال:..... پاکستان میں کئی لوگوں کا خیال ہے کہ سیاچین کی جنگ بے مقصد ہے جہاں آخری فتح موسم کی ہوگی۔ سیاچن میں صورت حال کیا ہے؟

جواب:..... اس سے پہلے کہ میں آج کی صورت حال بیان کروں' میں آپ کو سیاچن کے جھگڑے کا پس منظر بتانا چاہوں گا۔ 1982ء میں' میں چیف آف جنرل سٹاف تھا جب یہ مسئلہ پہلی بار کھڑا ہوا۔ ہم نے اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا اور پھر کچھ فیصلے کئے۔ ان فیصلوں کے باوجود ہم وہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہے جو ہم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ 82 میں ہمیں پتہ چلا کہ بھارتی سیاچن کے علاقے میں آتے رہے ہیں۔ انہوں نے سیاچن

کے راستے 'اندراکولی' کی طرف ایک مہم جو پارٹی روانہ کی تھی۔ اسی سال جنوری میں ہم نے مقامی کور کمانڈر سے کہا کہ فوجی دستے بھیج کر پتہ چلایا جائے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ خراب موسم اور ضروری ساز و سامان میسر نہ ہونے کی وجہ سے ہمارے دستے سالتورو رینج کو عبور نہ کر سکے اور یوں دشمن کے بارے میں معلومات نہ مل سکیں۔

اگلے برس 1983ء میں جی ایچ کیو نے فیصلہ کیا کہ سیاچن میں ایس ایس جی کی ایک ٹیم بھیجی جائے۔ اگست 83ء میں ایس ایس جی کی ایک کمپنی حرکت میں آئی۔ یہ کمپنی سیالا کو عبور کر کے سیاچن میں داخل ہوگئی۔ جب وہ مشرق کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے گلیشئر کے جنکشن پر پہنچے تو انہیں کچھ فوجی کیمپ لگے نظر آئے۔ ہمارے جوانوں نے مزید ہدایات مانگیں۔ ہم نے انہیں کہا کہ وہ آگے بڑھیں اور انہیں علاقے سے باہر نکال دیں۔ جب ہمارے جوان آگے بڑھے تو دشمن راہ فرار اختیار کر گیا۔ وہاں سے جو کاغذات اور دوسرا سامان ملا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کا تعلق لداخ اسکاؤٹس سے تھا۔ وہ ہمارے جوانوں سے مڈبھیڑ کئے بغیر پسپا ہو گئے۔ ہمارے دستے وہاں دس ستمبر تک رہے۔ اس وقت موسم خراب ہونے لگا تو ہم نے انہیں کہا کہ واپس آ جائیں وہ بیلا فونڈلا کے راستے واپس آ گئے۔

اطلاعات کی بنیاد پر ہم نے منصوبہ بندی کی اور حکومت کو یہ تجویز دی کہ اگلے سال اس علاقے میں فوج بھیجی جائے۔ ہمارا یہ فیصلہ کہ اگلے سال فوج بھیجی جائے' غلط تجزیے پر مبنی تھا۔ اتنی سردی یعنی دسمبر' جنوری اور فروری کے مہینوں میں فوج کے لئے مستقل قیام ممکن نہ تھا۔ اس سوچ کو تقویت اس لئے بھی ملی ہے کہ ایل او سی (LOC) کے پار وہ پہاڑی سلسلہ جو پندرہ ہزار فٹ سے بلند ہے' انہیں بھارتی فوج بھی سردیوں میں خالی کر دیتی تھیں۔ یہی وہ خالی پہاڑیاں تھیں جن پر جنرل مشرف نے کارگل آپریشن کے تحت قبضہ کر لیا اور اپنی فوج کو بے نیل و مرام چھوڑ دیا۔ ایک بے مقصد آپریشن جو ہماری بدنامی کا سبب بنا۔

یہی وہ غلط فیصلہ تھا جس پر ہم نے اپنا منصوبہ بنایا اور اسے ڈی سی سی (ڈیفنس کیبنٹ کمیٹی) کے سامنے رکھا۔ جی ایچ کیو میں دو مرتبہ اس منصوبے پر بحث ہوئی اور خاصے

غور وخوض کے بعد بھرپور تیاری شروع کی۔ بھارت کو ایک اور فائدہ میسر تھا' ان کے پاس لاما ہیلی کاپٹر بھی تھے جو ان کے فوجیوں کو بلند چوٹیوں پر اتار سکتے تھے۔ چنانچہ وہ ہم سے چند دن آگے تھے۔ ہماری جانب سے نچلو سے آگے سڑکیں نہیں تھیں' صرف پیدل چلنے کے راستے تھے۔ اس لئے ہم چند دن پیچھے رہ گئے۔ بھارتی فوج ہیلی کاپٹروں کے ذریعے ہم سے پہلے دروں پر پہنچ گئی اور قابض ہوگئی۔

یہ انتظام وانصرام کی جنگ ہے اور اس معاملے میں اب ہم ان سے بہتر ہیں۔ ہم بہتر پوزیشن میں اس لئے ہیں کہ ان پانچ برسوں میں ہم نے اپنے اگلے مورچوں اور توپوں کی پوزیشن تک ٹرک اور جیپ چلنے کے قابل سڑکیں تعمیر کرلی ہیں۔ ہمیں ہیلی کاپٹر استعمال کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی' سوائے یہ کہ کسی زخمی کو اٹھانا ہو یا کوئی ہنگامی صورت حال ہو۔ بھارتیوں کو اس علاقے میں اپنی فوج پر روزانہ اوسطاً ایک کروڑ روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں جبکہ ہمارا سال بھر میں خرچ صرف 30 سے 40 کروڑ روپے ہے۔

سوال:...... بھارت کو سیاچن میں ہمارے مقابلے میں زیادہ جنگی فوائد اور برتر پوزیشن میسر ہے۔ کیا ہمارے اندر یہ صلاحیت ہے کہ ہم مقبوضہ علاقوں سے انہیں اٹھا کر باہر پھینک سکیں؟

جواب:...... یقیناً ہم انہیں اٹھا کر باہر پھینک سکتے ہیں جس کے لئے وسائل کی ضرورت ہوگی اور جانی نقصان بھی زیادہ ہوگا۔ میں تو چاہوں گا کہ بھارت اس نام نہاد فائدے کی وجہ سے وہاں رہنے کا فیصلہ کرے۔ انہیں کوئی جنگی فائدہ میسر نہیں ہے۔ انہیں صرف یہ سیاسی فائدہ حاصل ہے کہ انہوں نے ہمیں چین کے ساتھ ہماری 70 کلومیٹر کی مشترکہ سرحد سے فائدہ اٹھانے سے محروم کررکھا ہے۔ ان کی طرف سے مزید پیش قدمی اور کوئی بھی مہم جوئی نری حماقت ہوگی۔ وہ جتنی زیادہ فوج کھپائیں گے' اتنا ہی زیادہ پھنستے چلے جائیں گے۔

سوال:...... بھارت نے 74ء میں ایٹمی دھماکہ کیا تھا اور آج ان کے سامنے ایٹمی جنگ کا راستہ کھلا ہے۔ کیا آپ نے ضرب مومن کی مشق میں ایٹمی جنگ کے امکان کو مدنظر رکھا ہے۔ کیا پاکستان ایسی صلاحیت کا مالک ہے؟

جواب:...... ایٹمی امکانات پر بات کرتے ہوئے وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے کافی کچھ کہہ دیا ہے۔ یہ حقیقت کہ اب لوگوں کو یقین ہے کہ ہم ایٹمی صلاحیت کے مالک ہیں جو Deterrance' یعنی خطرے کو ٹالنے کا کام دے رہی ہے۔ ان مشقوں میں ایٹمی جنگ کے امکانات کو ذہن میں نہیں رکھا گیا ہے۔

سوال:...... میزائلوں کی تیاری میں پاکستان پر بھارت کو اچھی خاصی برتری حاصل ہے۔ ہماری صلاحیت کیا ہے اور آپ وہ کیا اقدامات تجویز کرتے ہیں جن سے بہتر توازن قائم رہے؟

جواب:...... میزائلوں کے شعبے میں بھارت کو جو فوائد میسر ہیں وہ نمایاں ہیں۔ گذشتہ سال فروری میں انہوں نے ''پرتھوی'' کا تجربہ کیا جس کی رینج 250 کلومیٹر ہے اور ہمارے پاس اس کے جواب میں کچھ نہ تھا۔ خوش قسمتی سے کئی سال سے ہم اپنے ایک پروگرام پر عمل پیرا ہیں۔ یہ مکمل طور پر ملکی پروگرام ہے۔ ہمیں قدرے کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس دن میزائل کا تجربہ کرنے کو تیار تھے جس دن مسٹر راجیو گاندھی پہلی بار ہمارے ہاں آئے تھے۔ یہ تجربہ کسی فنی خرابی کی وجہ سے ناکام رہا۔

بالآخر آپ نے اچھی خبر سن لی کہ ہمارے پاس بھی یہ صلاحیت ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہماری یہ صلاحیت مکمل طور پر ہماری اپنی ہے۔ ہمارے پاس دو قسم کے میزائل ہیں' ایک جو 80 کلومیٹر تک اور دوسرا 300 کلومیٹر تک مار کرسکتا ہے۔ اب جو تیسرا بن رہا ہے اس کی مار 600 کلومیٹر تک ہوگی۔ بھارت نے 2500 کلومیٹر رینج کے ''اگنی'' میزائل کا بھی تجربہ کرلیا ہے جو ہمارے لئے کوئی بڑا خطرہ نہیں ہے کیونکہ اس سے وہ ایسے ٹارگٹ کو نشانہ بنا سکتے ہیں جو پاکستان سے باہر ہوں گے۔ صلاحیت میں برابر ہونے کے لئے ہمیں ابھی کافی محنت کرنا ہوگی۔ ہماری پاس جو صلاحیت ہے وہ ڈیٹرنٹ کا کام دے رہی ہے۔

سوال:...... آپ نے حملے کی بات کی ہے اور پہل قدمی کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا مطلب ہے کہ خطرے کو روکنے کے لئے کاروائی کی جائے۔ آپ کا کیا مطلب ہے؟

جواب:...... حملہ روکنے کی کاروائی کا آپشن تو ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے لیکن یہ ایک سیاسی فیصلہ ہے چنانچہ اگر حکومت کا دل بڑا ہو تو وہ جارحانہ حملے کا فیصلہ کر سکتی ہے قبل اس کے کہ دشمن جنگ کا آغاز کرے' اس کے خلاف Pre-emptive Strike کریں لیکن جب ایک دفعہ جنگ شروع ہو جائے تو پھر فیصلے فوجی ہائی کمان کے ہاتھ میں چلے جاتے ہیں۔ میں اس صورت حال میں کہہ رہا ہوں کہ دشمن کے جارحانہ اقدام سے پہلے ہمارے اندر بھرپور حملہ کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

سوال:...... آپ نے صرف ایک سال میں اعلیٰ پیشہ ور افسروں کی ٹیم کیسے تیار کر لی ہے؟

جواب:...... اگر میں نے یہ تاثر دیا ہے کہ یہ سب کچھ پچھلے ایک سال میں حاصل کیا گیا ہے تو یہ درست نہیں ہے۔ ایک سال میں افسر کی تربیت نہیں ہو سکتی اس کے لئے کئی عشروں کا وقت چاہیے۔ خاص طور پر جو اعلیٰ نظام تعلیم ہم نے اپنا رکھا ہے۔ یہ سلسلہ 1971ء میں شروع ہوا تھا جب نیشنل ڈیفنس کالج راولپنڈی منتقل ہو چکا تھا۔ اس مدت میں ہمارے کرنل اور بریگیڈئر کے عہدے کے وار کورس کے تربیت یافتہ افسران آج ہر اہم عہدے پر متعین ہیں اور یہی وہ حقیقت ہے جو ہماری فوج کے ترویجی پروگرام کی کامیابی کی بنیاد ہے ورنہ اکیلا میں اور میرے چند ساتھی وہ مقاصد حاصل نہ کر پاتے جو آج ہماری فوج کی پہچان ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں اس وقت کمانڈر کے منصب پر فائز ہوں جب کہ میرے پاس پیشہ ور' ماہر تجربہ کار افسروں کی ایک ٹیم موجود ہے۔ اس عرصے میں ہم نے نالج بیسڈ (knowledge based) حکمت عملی حاصل کی ہے اور فوج کا (Modernization Programme 2000 and Beyond) ترتیب دیا ہے جسے 80ء کی دہائی میں عملی جامہ پہنایا گیا تھا۔

سوال:...... آپ ایک بالاتر دشمن کے مقابلے میں اپنی فوج کی صلاحیت کا کس طرح موازنہ کرتے ہیں۔ کیا یہ جنگ روکنے کی صلاحیت رکھتی ہے؟

جواب:...... ہمارا مقصد نہ تو جنگ لڑنا ہے نہ جنگ کی دعوت دینا ہے نہ جنگ کے

حالات پیدا کرنا ہے۔ ہمارا مقصد جنگ کے خطرے کو روکنا ہے اور ایسا ڈیٹرنٹ تشکیل دینا ہے جو طاقتور اور نتیجہ خیز ہو اور جسے دشمن بھی اچھی طرح سمجھتا ہو۔ ڈیٹرنس ہمہ جہت ہوتا ہے' ایسا کہ جس سے دشمن پر خوف طاری ہو۔ آپ فوج کی عزت کرتے ہیں اس لئے کہ ہم نے 17 اگست 1988ء کو اہم فیصلے کئے ہیں اور ایسا طرز عمل اختیار کیا ہے اور مسلح افواج کو پوری قوم کی تائید و حمایت حاصل ہوئی ہے۔ اگر دشمن کو یہ پتہ ہو کہ جنگ کی صورت میں پوری قوم ہماری مسلح افواج کی پشت پر ہو گی تو یہ بذات خود ایک موثر ڈیٹرنس ہے۔ ہمارا دوسرا فریضہ ہے کہ ہم بہترین صلاحیت کے مطابق اس جنگ کے لئے تیار رہیں جو ہم پر مسلط کی جا سکتی ہے اور ایسا کرتے ہوئے ہم اللہ تعالیٰ کے احکامات کی بھی پیروی کر رہے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح حکم ہے: "اے ایمان والو! اپنے بچاؤ کا سامان کر لو۔" (سورۃ النساء آیۃ ۷۱)۔ تو ہمارا ہر وقت جنگ کے لئے تیار رہنا بھی ایک ڈیٹرنس ہے۔ اگر دشمن کو اس حقیقت کا پتہ ہو کہ ہم ہر طرح سے مستعد اور اپنے فرائض اور دفاع وطن کے مقدس فریضے سے غافل نہیں ہیں تو اس سے خود بخود دشمن کو یہ پیغام ملتا ہے کہ اس نے پاکستان کو میلی نظر سے دیکھا تو ہماری مسلح افواج نہ صرف موثر جواب دیں گی بلکہ انہیں شرمناک شکست سے بھی دوچار ہونا پڑے گا اور یہ بات انہیں بڑی گراں گزرے گی۔

سوال:...... کیا آپ پاکستان' افغانستان اور ایران کے درمیان نئے اتحاد کے نظریے کی وضاحت کرنا پسند کریں گے؟

جواب:...... میں نے پچھلے سال اسٹریٹیجک اتحاد کی بات کی تھی وہ بذات خود ایک نیا تصور ہے اور نئے حقائق پر مبنی ہے۔ تینوں ملکوں یعنی ایران' افغانستان اور پاکستان کی سرحدیں مشترک ہیں۔ ان میں یکسانیت پائی جاتی ہے' مقاصد کا اشتراک ہے اور دین کی بالادستی قائم کرنا ہے۔ ان مقاصد کو کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے' یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ جدوجہد کا طریقہ اور انداز تو مختلف ہے لیکن مقاصد یکساں ہیں۔ افغانستان میں پچھلے آٹھ سالوں سے جنگ لڑی جا رہی ہے۔ یہاں خون پسینہ بہا ہے' جانیں قربان کی گئی ہیں۔ روس پسپا ہو چکا ہے۔

ایران میں بھی ایک انقلاب برپا ہوا اور کتنی ہی قربانیوں کے بعد وہ پہلے سے بھی زیادہ طاقتور بن کر ابھرا ہے۔

اس کے باوجود دنیا کے کئی ممالک نے مل کر اسے تباہ کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی جدوجہد کی تاریخ میں کسی انقلاب کو طاقت کے بل پر ختم نہیں کیا جا سکا۔ اسے کسی زیادہ طاقتور فلسفہ سے ہی دبایا جا سکتا ہے۔ انقلاب اگر کسی طاقتور خیال یا نظریے سے کنٹرول نہ کیا جا سکے تو وہ اپنے آپ کو خود تباہ کر لیتا ہے۔ ایران کا اسلامی انقلاب تاریخ اسلام میں انوکھی مثال ہے۔ ماضی میں دنیا میں بے شمار انقلاب برپا ہوئے' فرانس میں جمہوریت کے لئے انقلاب آیا' مارکس' لینن اشتراکی اور سوشلسٹ انقلاب برپا ہوئے لیکن ایرانی انقلاب ان سب سے مختلف نوعیت کا انقلاب ہے جو پوری تمازت کے ساتھ دشمن کی سازشوں کا مقابلہ کر رہا ہے۔

پاکستان میں بھی ایک تبدیلی رونما ہو رہی ہے لیکن مقصد ایک ہی ہے' یعنی مقصد کی ہم آہنگی' جو تینوں ملکوں کو یکجا کر رہی ہے۔ انشاء اللہ جلد یا بدیر تینوں ممالک اپنے مقاصد تک پہنچ جائیں گے۔ بنیادی طور پر یہی وہ نظریہ ہے جو میں نے پیش کیا تھا اور Strategic Depth کا نام دیا تھا یعنی اتحادی ملکوں کی تذویراتی سلامتی کی گہرائی۔ ان نظریات و تصورات کو حقیقت بننے اور کامیاب ہونے تک کافی وقت درکار ہے۔ کسی آئیڈیل کے حصول کے لئے انسانی جدوجہد بعض اوقات لمبے عرصے تک جاری رہتی ہے' مثلاً افغانستان جو حاصل کرنا چاہتا ہے ابھی تک حاصل نہیں کر پایا۔ وہ پچھلے آٹھ سالوں سے لڑ رہے ہیں اور مقصد تک پہنچنے کے لئے انہیں ابھی کئی مراحل سے گذرنا ہے۔ اس لحاظ سے زمان و مکان کی حدود و قیود مختلف ہیں لیکن جو حقائق اب ابھر رہے ہیں' وہ اس جیسے اتحاد کے بننے کی نوید دیتے ہیں۔

سوال:...... آپ کے خیال میں اس طرح کے اتحاد کو روس اور امریکہ کی طرف سے تشویش کی نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا؟

جواب:...... مجھے معلوم ہے اس طرح کی تشویش موجود ہے لیکن اگر یہ اتحاد قائم ہوتا ہے

تو اس سے علاقائی توازن اور استحکام پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔ خیال و عمل کی ہم آہنگی رکھنے والے ممالک کے ساتھ اور خصوصاً سپر پاور کے ساتھ معاملات کرنا آسان ہو جائے گا۔ کیا روسیوں کو اندازہ نہیں کہ اس طرح کے اتحاد کے قیام سے ان کی سرحدوں پر زیادہ امن ہوگا۔ جہاں تک امریکی مفادات کا تعلق ہے' آج علاقے میں ان کے پاس محدود امکانات ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ وہ افغان صورت حال کا کنٹرول کھو رہے ہیں اور اگر ایسا اتحاد معرض وجود میں آ جائے تو امریکہ کے لئے بہتر ہے کیونکہ ایک ہی تصورات و خیالات کے حامل گروپ سے بات کرنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔

طاقت کے عالمی توازن میں اس گروپ کا ایک اہم مقام ہوگا اور درحقیقت خطے پر بھارتی بالادستی کے اثرات کا توڑ بھی ثابت ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس اتحاد کی بنیاد نظریاتی ہوگی' یہ اسلامی اتحاد ہوگا تو شاید امریکہ اور روس کے لئے تشویش کا باعث ہو اور عین ممکن ہے کہ امریکہ اور روس اس اتحاد کے خلاف متحد ہو جائیں جیسا کہ امریکہ کے سابق صدر رچرڈ نکسن نے اپنی کتاب سیز دی مومنٹ (Sieze the Moment) میں اس طرف اشارہ بھی کیا ہے لیکن اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کے نام پر اگر ہم متحد ہوتے ہیں تو انشاء اللہ ہمیں اللہ کی نصرت و تائید حاصل ہوگی۔

سوال:...... آپ نے پہلے کہا کہ صرف چند ایک افسر ہی مارشل لاء میں ملوث رہے لیکن فوج چونکہ بطور ادارہ ملوث رہی ہے اس لئے آپ کے نزدیک اس سے فوج پیشہ ورانہ طور پر کس حد تک متاثر ہوئی؟

جواب:...... مارشل لاء کے طویل عرصے نے پیشہ ورانہ سطح پر بہت کم فرق ڈالا ہے سوائے اس کے کہ چیف آف آرمی سٹاف اور کوئی سو سے ڈیڑھ سو اونچی سطح کے افسران مارشل لاء میں ملوث ہوتے ہیں اور ان کے پاس پروفیشنل کاموں پر توجہ مرکوز کرنے کے لئے اتنا وقت نہیں تھا جتنا میرے پاس ہے۔ اس کا نچلی سطح پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ مگر یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ فوج اس ملک کا جزو لاینفک ہے۔ ہمارے دل آپ ہی کی طرح دھڑکتے ہیں' ہم آپ

ہی کی طرح محسوس کرتے ہیں اس لئے اگر طویل مارشل لاء کے اثرات لوگوں کے ذہنوں پر مرتب ہوں تو مسلح افواج بھی ضرور متاثر ہوتی ہیں اور ان میں سیاست در آتی ہے۔

میں آپ کے ساتھ متفق ہوں کہ فوج کو یہ جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ اسے وقتاً فوقتاً امور مملکت چلانے کی ضرورت کیوں رہی ہے۔ مارشل لاء کیوں لگتا رہا؟ ہم بے صبرے کیوں ہو گئے اور ہم نے جمہوری عمل کو استحکام پکڑنے کا موقع کیوں نہ دیا؟ ایسا اسی صورت میں ہوتا ہے جب فوج اور قوم کے درمیان ابلاغ کا بڑا خلاء واقع ہو۔ ہم نے اپنے آپ کو ایک عرصے تک الگ تھلگ رکھا ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ فوجی مداخلت کا سبب صرف فوجی قیادت نہیں ہے بلکہ جب یہ پانچ عناصر اکٹھے ہوں تو حکومت کی تبدیلی رونما ہوتی ہے:

امریکہ' آرمی' عدلیہ' سول انتظامیہ اور موقع پرست سیاسی جماعتیں مفادات کا یہ ایسا گٹھ جوڑ ہے جس کے درست ہونے میں وقت لگے گا۔

سوال:...... بھارتیوں نے اپنی چھاؤنیاں سرحد کے قریب قائم کر دی ہیں جس کی وجہ سے انہیں حرکت میں آنے کے لئے کم وقت درکار ہوگا۔ ہماری فوج کی تعیناتی اور حرکت پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ میرا دوسرا سوال پاک فضائیہ کے بارے میں ہے جو جسامت میں بہت مختصر ہے۔ کیا آپ کے خیال میں وہ ضروری قریبی معاونت فراہم کرنے کی اہل ہے؟

جواب:...... پہلا سوال' اس سے قطع نظر کہ وہ اپنی چھاؤنیاں سرحد کے قریب لے آئے ہیں' حقیقت یہ ہے کہ بھارتیوں کو فوج حرکت میں لانے کے لئے 14 دن درکار ہیں۔ ہمارا وقت بارہ دن تھا' ہم نے اسے کم کرنے کی کوشش کی ہے اور اب ہم آٹھ دن کے اندر فوج کو موبلائز کر سکتے ہیں اور اس مدت کو کم کرنے کی مسلسل کوشش جاری ہے۔ ہمیں یہ فائدہ میسر ہے اور اسی کی طرف سے میں نے حملے میں پہل قدمی کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اشارہ کیا تھا۔ خطرے کو ٹالنے کے لئے پہل کاری وہ اقدام ہے جو جنگ کے آغاز سے بھی پہلے اٹھایا جاتا ہے۔

جہاں تک پاک فضائیہ کا تعلق ہے' اگر زمینی فوج کی حکمت عملی فضائیہ کے ساتھ مربوط

ہو تو انہیں زمینی افواج کی مدد کے لئے آنے میں کچھ وقت لگے گا' اس لئے کہ انہیں خود پہلے جوابی فضائی حملے اور بقاء کی جنگ کے مرحلے سے گزرنا ہوتا ہے۔ تین ایک کی نسبت میں ہونے کی وجہ سے انہیں لاتعداد مشکلات کا سامنا ہوگا' شاید جنگ کے پہلے چار پانچ دن پاک فضائیہ ہمیں وہ بھرپور مدد فراہم نہ کر سکے جس کی ہمیں ضرورت ہوگی۔ ان مشکلات کے باوجود پاک فضائیہ میں اتنی اہلیت ہے کہ کسی خاص محاذ پر جہاں اہم ترین زمینی جنگ لڑی جا رہی ہو فضائی برتری قائم رکھ سکے۔ فضائیہ کی یہ صلاحیت ہمارے جنگی منصوبہ بندی کا اہم حصہ ہے۔

سوال:...... جنگی طیاروں کی کارکردگی کا اندازہ کیسے لگایا جاتا ہے جبکہ زمینی فوج کے ساتھ مشق کے دوران نہ وہ کوئی راکٹ فائر کرتے ہیں نہ کوئی بم گراتے ہیں؟

جواب:...... فائرنگ یا بم گرانا آخری مرحلہ ہوتا ہے۔ اصل میں ڈرل کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی جہاز کی کارکردگی کی جانچ اس طرح کی جاتی ہے کہ جب فضائی مدد کی درخواست کی جائے تو اس کے بعد ایک جہاز کتنی دیر میں مطلوبہ مقام پر پہنچتا ہے۔ یہ ایک طویل عمل ہے۔ جب ایک انفنٹری بٹالین کمانڈر کو سخت مزاحمت کا سامنا ہو اور وہ میسر ذرائع سے اس مزاحمت پر قابو نہ سکے تو وہ فضائی مدد کی درخواست اپنے بریگیڈ ہیڈکوارٹر کو بھیجتا ہے۔ ڈویژن ہیڈکوارٹر سے ہوتی ہوئی یہ درخواست کور ہیڈکوارٹر پہنچتی ہے جو مختلف سمتوں سے ایسی ہی درخواستیں آئی ہوتی ہیں۔ مجموعی صورت حال کو سامنے رکھتے ہوئے ترجیحات کا تعین کیا جاتا ہے اور فضائی مدد کی درخواست پاک فضائیہ کے نمائندے کی معرفت پاک فضائیہ کے قریبی مستقر کو بھیجی جاتی ہے۔

فضائی مستقر پر جہاز کے پائلٹ کو مشن دیتے ہوئے اس علاقے کے بارے میں بریفنگ دی جاتی ہے جہاں اس نے پہنچنا ہوتا ہے۔ پھر یہ گراؤنڈ لیزان آفیسر (GLO) یا فارورڈ ائر کنٹرول ٹیم (Forward Air Control Team) کا کام ہوتا ہے کہ وہ زمینی نشانات کی مدد سے پائلٹ کو ٹھیک اس مقام تک پہنچائے جہاں اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ مشق کے دوران اسی چیز کا امتحان ہوتا ہے کہ جہاز کتنے کم سے کم وقت میں مطلوبہ مقام

پر پہنچتا ہے اور بتائے گئے ٹارگٹ پر غوطہ لگاتا ہے۔

سوال:...... آپ نے جونیئر کمیشنڈ افسر کے عہدے کو باقی رکھا ہے جو برطانوی روایت ہے۔ کیا آپ کے خیال میں یہ عہدہ مفید ہے اور آپ کے کسی کام آرہا ہے؟

جواب:...... آپ کا سوال درست ہے۔ فوج میں جونیئر کمیشنڈ افسر کا عہدہ برطانوی نظام کی روایت ہے اور ہم اسی نظام کے مطابق چلتے رہے ہیں۔ اگر آپ اپنے ان جوانوں اور افسروں کی تعداد گنیں جو سیاچن 1965ء کی جنگ یا 1971ء کی جنگ میں شہید ہوئے اور پھر جے سی اوز کی کارکردگی کا جائزہ لیں تو صورت حال وہ نہیں ہے جس کی ہم خواہش کرتے ہیں۔ اس نظام کی اب اصلاح کی جارہی ہے۔ پچھلے سال ہم نے ایبٹ آباد کے نزدیک ایک جونیئر لیڈر اکیڈمی قائم کی ہے۔ یہ اکیڈمی جونیئر کمیشنڈ افسروں کی تربیت کرے گی اور مجھے یقین ہے کہ چند برسوں میں پاک فوج میں موجود یہ خامی رفع ہو جائے گی۔

سوال:...... فوج میں اعلیٰ تعلیم کا کیا نظام ہے۔ کیا کوئی ایسا انتظام ہے جس کے تحت افسروں میں جہاد اور شہادت کی روح پھونکی جاتی ہو۔ کیا آپ ایسے نظام کو مزید بہتر بنانے کے لئے کوئی اقدام کر رہے ہیں تاکہ اندرونی و بیرونی خطرات کے مقابلے میں ضرب مومن اور زیادہ موثر ثابت ہو سکے؟

جواب:...... ہمارے تعلیمی نظام کے بہت سے پہلو ہیں۔ سب سے اہم پیشہ ورانہ تعلیم ہے۔ اس کے بعد وہ مضامین ہیں جن کے اثرات فوجی مہارت پر ہوتے ہیں۔ چند سال پہلے ہمارے پاس صرف ایک افسر پی ایچ ڈی تھا' وہ بھی واپڈا کی ملازمت کے بعد ریٹائر ہو گئے اور اب اللہ کے فضل سے ہمارے پاس دس پی ایچ ڈی ہیں' پندرہ دوسرے افراد مختلف مضامین میں ملک کے اندر اور بیرونی ممالک میں پی ایچ ڈی کر رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آئندہ سال کے آخر تک ہمارے پاس کم از کم بیس پی ایچ ڈی ہوں گے۔ پچھلے تین سالوں میں ہم نے ڈیڑھ سو افسروں کو ٹیکنیکل مضامین میں ایم ایس سی کروایا ہے' پچھتر (75) مزید افراد زیر تربیت ہیں۔ یہ تمام افراد اپنے اپنے مضامین میں تربیت کی تکمیل پر فوج کے مختلف منصوبوں

پر کام کریں گے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم اعلیٰ تعلیم کو کتنی اہمیت دے رہے ہیں اور اپنی تعلیم کے معیار کو بڑھانے کے لئے کیا کیا کوششیں کر رہے ہیں۔

آپ کے سوال کا دوسرا حصہ مذہبی تعلیم سے متعلق ہے۔ اس کا اہتمام ہم فوج کے افسروں اور جوانوں کی تربیت کے مختلف مراحل میں نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ کرتے ہیں۔ کسوٹی یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی کریں دیانتداری سے اور خلوص سے کریں۔ ہم اپنے جوانوں اور افسروں کی تربیت اس طرح کرتے ہیں کہ وہ سمجھ سکیں کہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کیا ہیں۔ ہماری نمازیں' روزے' ہم سے کیا تقاضا کرتے ہیں۔ یہ کہ ہم سچے' باشعور مسلمان بنیں۔ اس کی ہر جگہ تاکید کی جاتی ہے۔ ہماری ملٹری اکیڈمی میں' تربیتی مراکز میں' ہماری یونٹوں میں' فارمیشنوں میں اور دوسری فوجی چھاؤنیوں میں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک دینی نصاب تعلیم مرتب کیا جا چکا ہے جو بہت جلد نافذ العمل ہوگا۔

سوال:...... عام طور پر یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ سندھ کے لوگ فوج میں شمولیت اختیار کیوں نہیں کرتے' یا انہیں فوج میں جگہ کیوں نہیں دی جاتی۔ آپ اس پر کیا کہیں گے؟

جواب:...... یہ قومی یک جہتی سے متعلق بڑا اہم مسئلہ ہے۔ ہم ہمیشہ کوشش کرتے رہے ہیں کہ پورے ملک سے لوگ افواج میں شامل ہوں۔ حیدرآباد میں سندھ رجمنٹل سنٹر قائم کرنے کا ہمارا مقصد ہی یہی تھا کہ لوگ فوج میں شامل ہونے پر آمادہ ہوں۔ لوگ صرف افسروں کی حیثیت سے فوج میں آنا چاہتے ہیں لیکن ہمیں صرف افسر ہی تو نہیں چاہئیں' ہمیں جوانوں' نان کمیشنڈ افسروں اور جونیئر کمیشنڈ افسروں کی بھی تو ضرورت ہے۔ ابھی پچھلے دنوں میں جائزہ لے رہا تھا کہ سندھ کے کتنے لوگ سندھ یا دوسری رجمنٹوں میں شامل ہوئے۔ ہم نے مختلف جگہوں پر بھرتی کے مراکز قائم کئے۔ پندرہ سو افراد سندھ رجمنٹ اور دوسری یونٹوں میں شامل ہو چکے ہیں۔ بلوچستان میں بھی یہی صورت حال ہے۔ حیدرآباد میں سندھ رجمنٹل سنٹر کا قیام بڑی کامیابی کی دلیل ہے۔

سوال:...... آپ اکثر و بیشتر سیاستدانوں سے ملتے ہیں اور بیان جاری کرتے ہیں جو

سیاسی ہوتے ہیں یا خارجہ امور سے متعلق ہوتے ہیں۔ آپ کو اس کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟

جواب:..... اپنے آپ کو ملکی معاملات سے آگاہ رکھنا ہماری اولین ذمہ داری ہے۔ الگ تھلگ رہنا غفلت ہوگی۔ ہمیں اقتدار کی ہوس نہیں ہے۔ فوج کا مشن یہ ہے کہ ملک کا اندرونی و بیرونی خطرے سے دفاع کرے۔ یہ اسی مشن کی تکمیل کا حصہ ہے کہ ہم ریاست کے امور میں مداخلت کرتے نظر آتے ہیں۔ ہمارا مقصد صورت حال کو بگڑنے سے بچانا ہے۔ یہ مداخلت اس امر کو یقینی بنانے کے لئے ہے کہ حالات کنٹرول سے باہر نہ ہوں۔

یہاں موجود تمام افسروں اور اپنی جانب سے میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہماری درخواست پر یہاں آنے کی زحمت گوارا کی اور آج کی گفت و شنید میں شرکت فرمائی۔ میں نے کھلے دل سے واضح طور پر آپ کے سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا مقصد ہے آپ یہ سمجھیں کہ ہمارے ارادے درست ہیں اور ہمارے دل آپ کے ساتھ دھڑکتے ہیں اور انشاء اللہ ہم ملک' قوم اور اس نظام کو صحیح راہ پر رکھیں گے۔ آپ کی اور ہماری منزلیں ایک ہیں۔ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو۔ اللہ حافظ

قومی پریس کا ردعمل

قومی پریس میں اس بریفنگ پر بھرپور ردعمل دیکھنے میں آیا' ادارے اور کئی کالم لکھے گئے۔ ممتاز قلم کاروں کی طرف سے بریفنگ پر بہت سے مضامین لکھے گئے۔ ان کی تفصیلات آئی ایس پی آر کے جریدے "ڈیفنس اینڈ میڈیا ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئیں جو راقم الحروف کی زیرادارت شائع ہوا۔

مختلف اداریوں نے اس بریفنگ کو "تازہ ہوا کا جھونکا" "تروتازہ کرنے والی کشادگی یقینی" "اہم وسیع النظر فی" "ہرطرح کے سوالات کے شافی جوابات" قرار دیا۔ ایک صحافی نے لکھا "جس طرح بریفنگ کا اہتمام کیا گیا ہے' سوالوں کے وضاحت سے جواب دیے گئے اور تلخ سوالوں پر کسی منفی ردعمل کے بغیر مثبت جواب دیے گئے' اس سے سیکھا جا سکتا ہے کہ

صحافیوں کے ساتھ ملاقات کا اہتمام کس انداز میں ہونا چاہیے۔ ۱۵۵ منٹ کے سیشن میں جنرل بیگ نے متعلقہ موضوعات سے یک سرمو انحراف نہیں کیا۔ (روزنامہ نیشن' ۷ استمبر ۱۹۸۹ء)

ایم ایچ ریاض نے پاکستان اینڈ گلف اکانومسٹ کے میگزین میں یہ موقف اختیار کیا "جنرل بیگ نے جمہوریت کے بارے میں جو کچھ کہا' کچھ لوگوں کو شاید ایسا نہ لگے کہ وہ جمہوریت کا درس دے رہے تھے۔ اگر وہ ایسا کریں تو یہ خاموشی سے بہتر ہے یا ایسی پہیلی ہے جو خفیہ رازوں کے پردوں میں چھپی رہے۔ (۲۳ ستمبر ۱۹۸۹ء)

اکبر نقوی نے لکھا "اعلیٰ منصب پر فائز اس سپاہی کو یقین ہے کہ ملک کی تذویراتی گہرائی لوگوں کے دلوں میں ہے۔ جب لوگوں کو اس کی ضرورت تھی کہ انہیں یقین دلایا جائے کہ مسلح افواج جمہوریت کی بارے میں پرعزم ہیں' انہوں نے (اس یقین دہانی کے لئے) مناسب ترین الفاظ کو استعمال کیا۔ (روزنامہ مسلم' ۲۴ ستمبر ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر شاہ خان نے بڑے فصیح و بلیغ انداز میں لکھا "جنرل اسلم بیگ نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک ہی جھٹکے میں ان تمام جالوں اور خس و خاشاک کا صفایا کردیا جس نے فوج کے کردار کو چھپا رکھا تھا۔ انہوں نے بہت سے ایسے نظریات کو بھی باطل قرار دیا جس پر اب تک لوگ یقین کرتے آئے ہیں۔ انہوں نے بڑی کشادگی سے جو وردی والوں کے ہاں کم ہی ملتی ہے' بہت سی ایسی پیشہ ورانہ اور سیاسی غلطیوں کا اعتراف کیا جو ماضی میں ہوتی رہی ہیں۔ ڈاکٹر شاہ خان نے کہا "اس یقین دہانی کے لئے کہ ان کی کوشش ثمرآور ثابت ہو انہیں ایک قدم اور اٹھانا چاہیے اور سیاست سے قطعی کنارہ کشی اختیار کرنی چاہیے۔"

(روزنامہ مسلم' ۱۵ استمبر ۱۹۸۹ء)

نومبر ۱۹۸۹ء میں یہ مشق شروع ہوئی۔ لیفٹیننٹ جنرل حمید گل چیف کنٹرولر تھے جو میرے منظور شدہ منصوبے کے تحت مشقوں کے انعقاد کے ذمہ دار تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل ذوالفقار اختر ناز بلیو لینڈ کے فورس کمانڈر تھے' لیفٹیننٹ جنرل رحم دل بھٹی بلیو لینڈ کی ایک کور کے کمانڈر تھے۔ لیفٹیننٹ جنرل عالم جان محسود فاکس لینڈ فورسز کے کمانڈر تھے۔ اس میں

بٹالین کی سطح کی 227 یونٹوں نے حصہ لیا۔ علاوہ ازیں 57 بریگیڈ ہیڈکوارٹرز' 11 ڈویژن ہیڈکوارٹرز اور 4 کور ہیڈکوارٹرز قائم کیے گئے تھے۔ ان مشقوں میں تین لاکھ فوجیوں نے شرکت کی۔ ٹینکوں کی تعداد 755' بکتر بند گاڑیوں کی تعداد 487 اور 754 توپیں تھیں۔ 188 جنگی جہاز بھی مشقوں میں شریک تھے۔ 23 ممالک کے عسکری وفود نے بطور مبصرین مشقوں کا معائنہ کیا۔

ضرب مومن مشقوں کے اغراض و مقاصد کو عوام تک پہنچانے کے لیے اپنے سوشل میڈیا کا کردار بڑا اہم تھا جسے ہمارے ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر میجر جنرل ریاض اللہ نے کمال فن سے اس طرح اجاگر کیا کہ ایسا جنگی ماحول بن گیا کہ پوری پاکستانی قوم کی نظریں ان مشقوں کی جانب مرکوز ہوئیں اور عوام کے ذہنوں میں ہماری فوج کا بہت ہی مثبت تاثر جاگزیں ہوا۔ ان مشقوں کے بعد میجر جنرل ریاض اللہ نے متعدد سیمینار منعقد کیے اور یونیورسٹی اور کالج کے طلباء کو سول اور ملٹری معاملات سے آگاہی فراہم کی۔

تین ہفتوں کی ان مشقوں نے پورے ملک میں جنگ کا ماحول پیدا کر دیا جس میں پاک فضائیہ کی بھرپور شمولیت سے تمام کاروائیاں حقیقت سے زیادہ قریب نظر آئیں۔ ہر افسر اور جوان نے دل و جان سے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں' ایسی بہترین کارکردگی دکھائی کہ امریکہ کی تاس ٹیم (TAAS Team) کو اپنی سفارشات میں فوج کی کارکردگی کا اعتراف کرنا پڑا۔ ہم سب پر اللہ تعالی کا بڑا کرم تھا کہ تین ہفتوں کی اتنی بڑی مشقوں میں کوئی ایک بھی حادثہ پیش نہیں آیا۔ ماشاءاللہ۔

جنرل اسلم بیگ نے مشق کے دوران سرگودھا میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا:

"ہمیں یہ انفرادی حیثیت بھی حاصل ہوئی کہ کسی اور ملک میں اتنی بڑی مشقیں' اتنے واضح اہداف کے ساتھ' اتنے کھلے انداز میں اب تک منعقد نہیں ہوئی ہیں۔ حالیہ دنوں میں روس اور چین کی مشترکہ مشقیں Vostok 2018 کے نام سے شروع ہو رہی ہیں جو دنیا کی سب سے بڑی War Games ہیں۔ اس میں

تین لاکھ سپاہی' چھتیس ہزار جنگی گاڑیاں' ایک ہزار جنگی ہوائی جہاز' اسی جنگی بحری جہاز اور سینکڑوں ایٹمی بردار میزائل حصہ لے رہے ہیں۔ دراصل یہ وار گیم اور اس سے پہلے Zapad 2017 اور Vostok 2014 کا انعقاد صدر پیوٹن کے Logic of Conflict کا مظہر ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ ان مشقوں کا بنیادی مقصد روس کی سلامتی کو یقینی بنانا ہے۔ ان کا قول ہے کہ عالمی سیاست میں امن کو کبھی استحکام نہیں رہا ہے اور امن کو ایک غلطی کا نام دے دیا گیا ہے جس کا دوام انتہائی مشکل ہے۔ لہذا صرف جنگ کے لئے تیار رہنے سے ہی امن کا قیام ممکن ہے۔ صدر پیوٹن کی جنگی منطق کے معنی یہی ہیں اور اسی طرح ایک سپر پاور کی حیثیت سے عالمی افق پر اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کرنا ہے جس کا بنیادی مقصد یورپ کو دہشت گردی اور بربریت سے محفوظ رکھنے کے لیے چوتھی مرتبہ تحفظ مہیا کرنا ہے۔ پیوٹن کا دعوی ہے کہ:

☆ یورپ کو ہم نے پہلی مرتبہ منگولوں سے
☆ دوسری مرتبہ نپولین سے
☆ تیسری مرتبہ ہٹلر سے نجات دلائی ہے
☆ اور اب داعش سے نجات دلانے کے لیے میدان عمل میں ہیں۔"

ان مشقوں کے دوران صحافیوں کو دلچسپ واقعات پیش آئے:

☆ ہفت روزہ "زندگی" کے مختار حسن جیپ میں سفر کرتے ہوئے بری طرح تھک گئے۔ وہ چائے کے بہت رسیا تھے اور کئی گھنٹوں سے انہیں چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ ان سے اس کتاب کے مرتب میجر اشفاق حسین کی ایک پل کے کنارے ملاقات ہوئی۔ کھل اٹھے اور شکایت کرنے لگے کہ پل کے پرلے کنارے پر چائے کا ایک کھوکھا ہے لیکن پل پر موجود ایک فوجی سنتری انہیں پل کے پار جانے نہیں دیتا' کہتا ہے کہ اس پل کو برباد قرار دے دیا گیا ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ سنتری کے منہ کیوں لگ رہے تھے کسی جے سی او سے کہنا تھا'

وہ آپ کو پل پار کروا دیتا۔

بولے:

"ایک سردار صاحب ملے تو میں نے ان سے بات کی تو بولے کہ مجھے تو گذشتہ کل سے شہید قرار دے دیا گیا ہے جب تک ایمپائر مجھے زندہ قرار نہ دیں میں کسی سرگرمی میں حصہ نہیں لے سکتا۔

☆ایک فوجی ایک ٹرک کو لے کر جا رہا تھا' وہ ریت میں پھنس گیا۔ اس نے دائیں بائیں کے دیہاتیوں سے مدد کی درخواست کی۔ کچھ افراد جمع ہو گئے لیکن جب وہ قریب آئے تو دیکھا کہ ٹرک کے اندر اچھے خاصے مشٹنڈے فوجی بیٹھے ہیں۔ دیہاتیوں نے پوچھا کہ ان فوجیوں کو کیوں نہیں کہتے کہ وہ اتر کر دھکا لگائیں۔" یہ سب شہید ہو گئے ہیں اور میں انہیں فلاں ہسپتال کے مردہ خانے کی طرف لے جا رہا ہوں۔" ڈرائیور نے جواب دیا۔ ٹرک میں سوار فوجی دانت نکال رہے تھے اور دیہاتی تعجب سے انہیں تک رہے تھے۔

☆ایک دفعہ سنٹرل میڈیا ٹیم کے کچھ صحافی اپنے آفیسر انچارج کے ساتھ رنگ پور کینال کے ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ آفیسر انچارج کو کہیں سے بھنک پڑی تھی کہ بلیو لینڈ فورس فلاں جگہ سے نہر کو عبور کرے گی۔ افسر صحافیوں کو یہ منظر دکھانے اس سمت چل پڑے۔ بلیو لینڈ فورس کا تو کوئی سراغ نہ ملا البتہ ایک جگہ کچھ فوجیوں نے ٹرک روک لیا۔ ایک فوجی سٹین گن لئے ٹرک میں سوار ہوا اور پوچھا:

"کون ہو؟"

"بلیو لینڈ کے فوجی" جواب ملا اس نے ایک نعرہ لگایا اور اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ بلیو لینڈ کے بہت سے فوجی ہیں۔ آؤ انہیں گرفتار کرو۔ افسر سمیت تمام صحافیوں کو جنگی قیدی بنا لیا گیا۔ بڑی دیر کے بعد ان کے افسر سے ملاقات ہوئی اور انہیں پوری صورت حال بتائی گئی تو جان خلاصی ہوئی۔

چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی، ایڈمرل افتخار احمد سروہی، پاک فضائیہ اور پاک بحریہ کے سربراہوں کے ساتھ ایک بریفنگ میں

پاکستان کے سابق جنرل ضرب مومن مشقوں پر ایک بریفنگ کے دوران
(بائیں سے دائیں) جنرل سوار خان، جنرل خالد محمود عارف، جنرل محمد اقبال خان، جنرل محمد شریف

صحافی لیزر رینج فائنڈر پر بریفنگ سنتے ہوئے

ضرب مومن میں شمال یونیفارم میں ملبوس سنٹرل میڈیا ٹیم کے صحافی غیر ملکی فوجی مبصرین سے
انٹرویو کرتے ہوئے

جنرل اسلم بیگ جونیئر کمیشنڈ افسروں سے ملاقات کرتے ہوئے

وزیراعظم بے نظیر بھٹو فوکس لینڈ کے ایک بریگیڈ کے جوابی حملے کا مشاہدہ کرتے ہوئے

پاکستان کے اہم سیاسی رہنما مسلح افواج کی اعلیٰ قیادت کے ساتھ ایک بریفنگ میں

الحمدللہ کے کورڈ ورڈ کے ساتھ پاک فوج کی سب سے بڑی مشق کا اختتام ہوا۔ اس موقع پر بھکر میں ایک دربار سے خطاب کرتے ہوئے جنرل اسلم بیگ نے کہا، "پاکستان کی تاریخ میں فوجیوں کا اتنا بڑا، باوقار اجتماع اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔"

باب ہفتم

سیاسی رہنماؤں کے ساتھ معاملات

بے نظیر بھٹو کے پہلے دور حکومت میں مجھے محترمہ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا' یہ ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ میرا محترمہ کے ساتھ بھی وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کی طرح احترام و عزت کا رشتہ تھا' جنہوں نے تدبر و ذہانت سے ایک تھوڑے سے عرصے میں 1971ء کی شکست کے بعد پاکستان کی عزت کو بحال کیا اور او آئی سی (OIC) جیسی تنظیم کو نئی جہت دی۔ شاہ فیصل کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی مرکزی قیادت کے قیام کا تصور پیش کیا۔ یہی وہ صفات تھیں جو امریکہ کو پسند نہ تھیں اور ان دونوں شخصیات کو یکے بعد دیگرے منظر سے ہٹا دیا گیا۔

میں نے جنرل ضیاء کو سپریم کورٹ کے فیصلے پر عمل کرنے سے منع کیا تھا لیکن ان کی ترجیحات کچھ اور تھیں۔ انہوں نے بھٹو کو پھانسی دے دی۔ ان کے انتقال کے بعد ہم نے جب 1988ء کے الیکشن کا فیصلہ کیا تو ہم پر لعن طعن ہوتی رہی کہ ملک جہادیوں سے بھرا ہوا ہے' بڑا فساد پیدا ہوگا لیکن الحمدللہ انتخابات منعقد ہوئے۔ ان میں پیپلز پارٹی نے اکثریت حاصل کی اور محترمہ بے نظیر بھٹو وزیراعظم منتخب ہوئیں۔ یہ میرا مینڈیٹ (Mandate) نہیں تھا لیکن پھر بھی بے نظیر بھٹو کو گھر پر دعوت دی اور مستقبل کی وزیراعظم کی حیثیت سے ان کو اہم ملکی معاملات سے متعلق ضروری باتیں بتائیں اور صرف تین باتوں کی درخواست کی:

☆ فوج سے کوئی شکایت ہو تو مجھے بتایئے گا' میں دیکھ لوں گا' یہ میری ذمہ داری ہے۔

☆ جنرل ضیاء کے لئے آپ کا دل سخت ہے' ان کے اہل خانہ کے لیے نرمی کی گنجائش رکھیے گا۔

☆ جب صدر بنانے کا وقت آئے تو غلام اسحٰق خان کا نام بھی سامنے رکھیے گا' وہ 1975ء سے لے کر اب تک ایٹمی پروگرام سے منسلک رہے ہیں۔

محترمہ نے ان تینوں باتوں کا احترام کیا۔

محترمہ کو اقتدار سنبھالے ابھی چند ہفتے ہوئے تھے کہ انہوں نے اپنے ملٹری سیکرٹری میجر جنرل امتیاز کو میرے پاس یہ پیغام دے کر بھیجا کہ موجودہ سینئر آفیسرز میں جنرل ضیاء کے قریبی اور بااعتماد آفیسرز کون ہیں تاکہ انہیں مناسب جگہوں پر ایڈجسٹ کر لیا جائے۔ میں حیران رہ گیا کہ جنرل امتیاز یہ پیغام لے کر آئے ہیں۔ میں نے کہا:

"جنرل صاحب' آپ کو تو معلوم ہے کہ فوج میں سیاسی جماعتوں والا طریقہ نہیں ہوتا کہ برسراقتدار جماعت اپنی پسند کے لوگوں کو لاتی ہے اور پچھلی جماعت کے لوگوں کو ادھر ادھر لگا دیا جاتا ہے۔ فوج میں ایسا نہیں ہوتا۔"

ہمارا ہر آفیسر خواہ سینئر ہو یا جونیئر ہو وہ اپنی اہلیت اور عہدے کی مناسبت سے متعین کیا جاتا ہے۔ اس کی وفاداری کسی شخص کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ اس کی پہچان اپنے کام سے ہوتی ہے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس وقت میرے ساتھ وہی آفیسرز ہیں جو جنرل ضیاء کے ساتھ تھے۔ میں نے کسی ایک کو بھی تبدیل نہیں کیا ہے اور یہی سبب ہے کہ ہمارے پیشہ وروں (Professionals) کی ایک مضبوط ٹیم ہر وقت موجود ہوتی ہے جو ہر ذمہ داری سنبھالنے کی اہل ہوتی ہے' مثلاً یہی ٹیم تھی جس نے آرمی ماڈرنائزیشن پروگرام ترتیب دیا' اسے عملی جامہ پہنایا اور ضرب مومن جیسی مشقیں منعقد کر کے 1971ء کی ندامت کا داغ دھویا اور دشمن کے دلوں پر ہیبت طاری کی۔ اگر محترمہ کو نام چاہیے تو میں ایک نام دے سکتا ہوں جو جنرل ضیا کے بہت ہی قریبی اور بااعتماد سمجھے جاتے تھے۔ وہ جنرل اسلم بیگ ہے۔"

میرا یہ جواب سننے کے بعد شاید محترمہ نے مجھے تبدیل کرنے کا سوچا جیسا کہ مجھے معلوم ہوا کہ ہمارے ایک کور کمانڈر اس کوشش میں تھے کہ وہ میری جگہ لے لیں اور مجھے جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا جائے۔ ادھر محترمہ کے معتمدین اشخاص میں بھی کچھ ایسے لوگ موجود تھے جو مجھ سے بلاوجہ کی مخاصمت رکھتے تھے۔ وہ بھی اس سازش میں شریک ہو گئے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ ایسی کوئی کھچڑی پک رہی ہے تو میں نے فارمیشن کمانڈر کانفرنس

میں اس سازش کا ذکر کیا اور سختی سے کہا کہ فوج کی طرف سے جو کوئی بھی اس سازش میں شریک ہیں وہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں وگرنہ ان کے خلاف انضباطی کاروائی کی جا سکتی ہے۔ اس کانفرنس میں وہ صاحب بھی شریک تھے جو چیف بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ ظاہر ہے انہوں نے محترمہ کو بتایا۔ محترمہ تک یہ خبر پہنچی تو انہوں نے میرے نام ایک خط میں اعتراف کیا کہ وہ مجھے چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی بنا کر کسی اور کو چیف آف آرمی سٹاف بنانا چاہتی تھی لیکن ساتھیوں سے مشورے کے بعد انہوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ یہ ان کی بڑائی تھی۔

جب 1988ء کے الیکشن کا ہنگامہ زوروں پر تھا تو مجھے خبر ملی کہ عدالت جونیجو حکومت کو بحال کرنے جا رہی ہے اور ہمارا الیکشن کرانے کا وعدہ پورا نہ ہوگا تو میں نے عدالت تک اپنی تشویش پہنچانے کی کوشش کی لیکن ایسا کچھ نہ ہوا' الیکشن مکمل ہوئے اور پاکستان پیپلز پارٹی اکثریتی جماعت بن کے ابھری۔ اس واقعے کے چار سال بعد میرے خلاف مقدمہ دائر ہوا کہ میں توہین عدالت کا مرتکب ہوا ہوں۔ خصوصاً میڈیا نے اس معاملے کو بہت اچھالا لیکن عدالت نے میرے حق میں فیصلہ دیا۔ ایک دلچسپ واقعہ بیان کرنا چاہوں گا۔

1988ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی تو اس کے چند ماہ بعد مجھے پیغام ملا کہ ایم کیو ایم کے قائد میرے گھر پر مجھ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ شام کو وہ میرے گھر آئے اور رسمی بات چیت کے بعد ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گئے۔ اسما' میری بیگم بھی کھانے میں شامل ہو گئیں۔ کھانا کھاتے ہوئے الطاف حسین صاحب بولے:

"بیگم صاحبہ کونسی ڈشیں آپ نے بنائی ہیں؟ میں تو جہاں جاتا ہوں بیگمات اپنے ہاتھ سے طرح طرح کی ڈشیں تیار کرتی ہیں۔"

تڑاخ سے جواب آیا:

"میں تو جنرل صاحب کے لئے کوئی ڈش نہیں بناتی' تو آپ کو یہ کیسے گمان ہوا کہ آپ کے لئے میں بناؤں گی۔"

لقمہ منہ میں ڈالتے ہوئے ان کا ہاتھ رک گیا۔ پانی پیا اور جانے کی اجازت چاہی۔ اس کے بعد پھر کبھی ان سے ملاقات نہ ہوئی۔

ہمارے ایٹمی پروگرام سے متعلق محترمہ نے بڑی سنجیدہ پالیسی وضع کی۔ یہ ٹھہراؤ اور احتیاط کی پالیسی تھی' جو Minimum Credible Deterrence کے نظریے پر بنائی گئی تھی۔ اس پالیسی کے بنیادی مقاصد یہ تھے:

☆ ''ہماری ایٹمی مزاحمتی صلاحیت کا ہدف صرف بھارت ہے' اور کسی دوسرے ملک کے خلاف ہماری ایٹمی صلاحیت کا استعمال ہمارا مقصد نہیں ہے۔

☆ ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ کرنا ایک بے فائدہ مشق ہے۔

☆ ہماری محدود صلاحیت کافی ہے۔

☆ پہلے حملہ کرنے کا نظریہ ہماری ایٹمی پالیسی کا اہم عنصر ہے کیونکہ دشمن کی جانب سے کئے جانے والے حملے کو روکنا مقصود ہے اور پھر بھی اگر دشمن باز نہ آئے تو جوابی کاروائی لازم ہو جاتی ہے۔

☆ ایٹمی صلاحیت روایتی جنگی ہتھیاروں کا نعم البدل نہیں ہوتی۔ دونوں کی اپنی اپنی افادیت ہے' ایک جنگ لڑنے کے لئے اور دوسرا جنگ سے بچنے کے لئے۔ ایٹمی ہتھیار جنگ کے لئے نہیں ہوتے۔ ایٹمی ڈیٹرنس قائم رکھنے کے لئے بہترین Equalizer ہیں۔''

☆ چھوٹے اور بڑے ہتھیار جمع کرنا کبھی ہماری پالیسی نہیں رہی ہے بلکہ ایٹمی صلاحیت کو عوام کی بھلائی کی خاطر پرامن مقاصد کے لیے استعمال کرنا ہماری پالیسی کا طرہ امتیاز ہے۔

☆ ایف سولہ (F-16) طیاروں سے ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کا کامیاب تجربہ ہو چکا ہے اور Credible Nuclear Deterrrence قائم ہو چکا ہے۔''

میں اکثر سیاچین جایا کرتا تھا اور خصوصاً سردیوں کے موسم میں سب سے اونچی پوسٹ

جو 22000 فٹ کی بلندی پر ہے وہاں پہنچ کے میں ہیلی کاپٹر واپس بھیج دیتا تھا اور دیر تک جوانوں کے ساتھ رہتا۔ ہر طرف پھیلی ہوئی وادیوں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر سفیدی کا منظر دل و دماغ پر کچھ عجیب ہی اثر کرتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے میں اللہ کے زیادہ قریب ہوں۔ یہ کیفیت میں نے ایک دن محترمہ سے بیان کی تو انہوں نے بھی سیاچین جانے کی خواہش ظاہر کی لیکن میں نے انہیں 22000 فٹ بلند پوسٹ پر لے جانا مناسب نہ سمجھا اور اجازت لی کہ 17000 فٹ بلند سیالہ پاس انہیں لے جاؤں گا۔ مقررہ دن ہم سکردو پہنچے' آفیسرز میس میں انہوں نے برفانی لباس پہنا جو ہم نے باہر کے ملک سے منگوا کے انہیں پیش کیا تھا۔ Dress-up ہو کے جب وہ باہر نکلیں تو بہت باوقار لگ رہی تھیں۔

سکردو سے ہیلی کاپٹر سے سیالہ پاس کے لیے روانہ ہوئے۔ ایک Oxigen Can ان کو بھی دیا کہ سانس لینے میں دقت ہو تو استعمال کریں۔ سیالہ پاس پہنچے جہاں دو دو فٹ گہری برف پڑی تھی۔ گھٹنوں تک پیر دھنس جاتے تھے۔ جوانوں نے استقبال کیا۔ ہم نے چاہا کہ محترمہ ایک برفانی خیمے کے اندر چلیں تا کہ برفانی ہواؤں سے محفوظ رہ سکیں لیکن انہوں نے باہر اسٹول پر بیٹھنا پسند کیا تا کہ پورے منظر کا نظارہ کر سکیں۔ جوانوں نے نان' چپس اور چنے کی دال پیش کی جو انہیں بہت پسند آئیں۔ خصوصی تیار کردہ چائے کا اپنا ہی مزہ تھا۔ جوانوں سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتی رہیں۔ بیس منٹ قیام کے بعد واپس سکردو روانہ ہوئے۔ یہ پہلی وزیراعظم ہیں جو اتنی بلندی تک گئیں اور آکسیجن کین بھی استعمال نہیں کیا۔ غالباً ابھی تک ہمارا کوئی بھی وزیراعظم 14000 فٹ بلندی پر گیاری بیس کیمپ سے آگے نہیں گیا۔

محترمہ اپنے والد کی طرح ذہین تھیں' معاملات کو جلدی سمجھتی تھیں اور فیصلہ کرنے میں دیر نہ کرتیں۔ مضبوط اور دلیرانہ فیصلہ کرتیں اور اگر کوئی ان کی رائے سے اختلاف بھی کرتا اور دلیل وزنی ہوتی تو وہ مان جاتیں۔ ضرب مومن مشقوں کے درمیان ہم نے انہیں آرمی کمانڈ ہیڈ کوارٹر اور دوسری فارمیشنوں کا دورہ کرایا۔ وہ اس دورے سے بہت خوش ہوئیں اور ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ فوج کی تیاری اور تجدیدی عمل سے بہت مطمئن تھیں اور خواہش

ظاہر کی کہ کچھ دنوں بعد ایک تفصیلی میٹنگ کرنا چاہتی ہیں تا کہ جنگی منصوبے (War Directive) کو نئی شکل دی جا سکے اور اہداف کو نئی صلاحیتوں کے مطابق درست کر لیا جائے لیکن مصروفیات کے سبب یہ میٹنگ نہ ہو سکی۔

1990ء کے آغاز ہی میں صدر غلام اسحٰق خان اور محترمہ کے درمیان کچھ اختلافات سننے میں آئے جس کا انکشاف اس Non-paper سے ہوا جو صدر نے مجھے دیا' جس میں وزیراعظم پر متعدد الزامات لگائے گئے تھے' جن کا تعلق پالیسی معاملات سے تھا۔ میں نے اس معاملے کو کور کمانڈر کانفرنس میں رکھا اور متفقہ فیصلہ صدر تک پہنچا دیا۔ فیصلہ یہ تھا کہ: ''صدر کو اس معاملے میں احتیاط کی ضرورت ہے' موقع دیں کہ وزیراعظم خود درستگی کر لیں۔ جہاں ضرورت ہو انہیں مشورہ دیں اور ان کے فرائض کی ادائیگی میں معاونت فرمائیں۔''

لیکن ان دونوں شخصیات کے درمیان مشاورت نہ ہوئی اور اختلافات بڑھتے رہے اور صدر نے آئین کی شق 58-2(b) کے تحت اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے محترمہ کی حکومت کو فارغ کر دیا اور 90 دنوں میں نئے انتخابات کرانے کا اعلان کر دیا۔ 58-2(b) کا استعمال جنرل ضیاء بھی کر چکے تھے اور حسب معمول صدر غلام اسحٰق خاں نے بھی 1975ء کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو کے فیصلے کے تحت آئی ایس آئی (ISI) کو الیکشن میں لاجسٹک سپورٹ (Logistic Support) مہیا کرنے کی ذمہ داریاں دیں۔ ایوان صدر اور آئی ایس آئی میں قائم الیکشن سیل فعال ہوئے اور صدارتی احکامات پر عمل درآمد شروع ہوا۔

انتخابات ہوئے' پاکستان مسلم لیگ (ن) نے اکثریت حاصل کی اور نواز شریف وزیراعظم منتخب ہو گئے۔ صدر نے بے نظیر بھٹو حکومت کو ہٹایا تھا' تو ان کی حکومت کو دوبارہ اقتدار میں کیوں آنے دیتے۔ یہ سیاسی See-Saw کا کھیل ہے جو 58-2(b) کے تحت 1975ء کے نوٹیفکیشن کی مدد سے کھیلا جاتا رہا ہے۔

سوال:...... ایک جانب آپ بے نظیر کی تعریفیں کرتے ہیں جبکہ دوسری جانب آپ نے ان پر تنقید کی ہے کہ وہ آپ سے انتقام لینے پر اتر آئی تھیں۔ کیوں؟

جواب:...... میں نے وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کے ساتھ دو سال سات ماہ' آرمی چیف کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کیں۔ گیارہ سال کی آمریت کے بعد جمہوری دور کا آغاز ہوا تھا۔ روسی افغانستان سے پسپا ہو چکے تھے۔ ایران' عراق کے خلاف جنگ میں کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ پاکستان پوری دنیا کے جہادیوں سے بھرا ہوا تھا۔ یہ ایک پر آشوب دور تھا' جب محترمہ بے نظیر بھٹو نے اقتدار سنبھالا۔ ملک کی سیاسی فضا بڑی ناہموار تھی۔ حزب اختلاف جو گیارہ سال تک جنرل ضیاء کے ساتھ اقتدار میں شامل رہی تھی اس کا رویہ جمہوری نہیں تھا۔ ایسے ماحول میں کم تجربہ رکھتے ہوئے بھی بے نظیر بھٹو صاحبہ نے مضبوط فیصلے کیے جس سے ان کی فراست' ہمت اور معاملہ فہمی ظاہر ہوتی ہے جس کا اعتراف نہ کرنا کم ظرفی ہوگی۔ ان کے چند فیصلوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ان کے مزید اہم فیصلے درج ذیل ہیں:

☆ 1989ء میں' میں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ ان کے والد محترم کے وقتوں سے ہمارے قبائلی اور عوامی نیشنل پارٹی کے لوگ افغانستان میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں' انہیں عام معافی دے دیں اور واپس بلا لیں۔ انہوں نے ان سب کو بلا لیا۔ کیا آج ہمارے وزیراعظم میں یہ حوصلہ ہے کہ وہ ہمارے ہزاروں ناراض قبائلیوں کو جو افغانستان میں جلاوطن ہیں انہیں واپس بلانے کا فیصلہ کر سکیں۔

1990ء کے اوائل میں امریکہ' بھارت اور اسرائیل نے ہماری ایٹمی تنصیبات کو تباہ کرنے کا منصوبہ بنایا' جب اس بات کا یقین ہو گیا کہ کسی بھی وقت یہ حملہ ہو سکتا ہے تو محترمہ نے بڑا دلیرانہ فیصلہ کیا۔ انہوں نے وزیر خارجہ صاحبزادہ یعقوب علی خان کو دہلی روانہ کیا' اس پیغام کے ساتھ کہ:

☆ باز آ جاؤ ورنہ تمہاری تنصیبات کو تباہ کر کے رکھ دیں گے۔
☆ پاکستان کی بری فوج اور بحریہ کو ریڈ الرٹ کر دیا گیا۔
☆ پاکستان ائرفورس کو حکم دیا کہ اپنے جہازوں کو ایٹمی ہتھیاروں سے مسلح کر کے ماڑی پور

پہنچا دو اور اگلے حکم کا انتظار کرو۔ جب امریکی سیٹلائیٹ سے یہ نقل و حرکت نظر آئی تو ان کے ہوش اڑ گئے۔ فوراً امریکی سفار تکار رابرٹ گیٹس (Robert Gates) پاکستان پہنچے' صدر سے ملے جنہوں نے بغیر کسی جھجک کے انہیں حکومت کے ارادے سے آگاہ کیا۔ طوفان تھم گیا اور سازش ناکام ہوئی۔

☆ محترمہ نے ہمارے ایٹمی پروگرام سے متعلق ایک جامع اور مضبوط پالیسی وضع کی جسے نیوکلیئر ریسٹرینٹ پالیسی (Nuclear Restraint Policy) کہا جاتا ہے۔ (اس کی تفصیل میں پہلے صفحات میں بیان کر چکا ہوں۔ بلاشبہ یہ انتہائی دانشمندانہ پالیسی تھی جس پر آج تک عمل ہو رہا ہے۔

☆ 1990ء میں بھارت کی طرف سے لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی بہت بڑھ گئی تھی یہاں تک کہ بھاری ہتھیار استعمال کر کے ہمیں بہت نقصان پہنچا رہے تھے۔ میں نے وزیراعظم صاحبہ سے سٹریٹیجک اسٹرائیک کی اجازت مانگی (جس کی تفصیل میں پہلے بیان کر چکا ہوں)۔ انہوں نے اجازت دی اور ہمارے 12 ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل محمد صفدر' ستارہ جراءت نے ایک دن میں دشمن کے فتنے کو ٹھکانے لگا دیا۔

☆ جب بوسنیا میں خانہ جنگی ہو رہی تھی اور سرب (Serb) مسلمانوں کا قتل عام کر رہے تھے تو مسلمانوں کے رومنگ ایمبیڈر (Roaming Ambassador) اور میرے ہمنام' مرزا اسلم بیگ مدد مانگنے پاکستان آئے۔ وزیراعظم صاحبہ کی اجازت سے انہیں گرین ایرو (Green Arrow) نامی چند اینٹی ٹینک میزائل اور اس کے فائر کرنے کے لئے پوڈ (Pod) دیے گئے۔ حسب معمول سربوں نے مسلمانوں کی ایک آبادی کا گھیراؤ کر کے آٹھ ٹینکوں سے فائر شروع کیا لیکن پانچ منٹ کے اندر ہی ان کے چھ ٹینک تباہ کر دیے گئے۔ وہ بھاگ گئے اور وہیں سے جنگ کا رخ بدل گیا' جنگ ختم گئی اور

امریکہ اور یورپی اتحادیوں نے مسلمان آبادی پر مشتمل کوسوو (Kosovo) کے نام سے الگ ملک بنانے کی اجازت دی۔

میرا خیال ہے بس اتنا ہی کافی ہے۔ اللہ تعالیٰ محترمہ کو اپنی رحمتوں کے سائے میں رکھے۔ محترمہ کی اپنی زبانی صحیح صورت حال یہ تھی:

"میں صرف لوگوں کے آئینی' جمہوری اور انسانی حقوق دیئے جانے کے حق میں آواز بلند کر رہی ہوں۔ میرے خاندان اور میری پارٹی نے میرے کم سن بچوں نے' میری بیمار والدہ نے' میرے شوہر اور سسرال والوں نے تاریک سالوں' دنوں اور مہینوں میں جو مصائب برداشت کئے ہیں وہ سب ایک ترقی یافتہ اور خوشحال پاکستان کے قیام کے لئے تھے۔ ایسا پاکستان جہاں سیاسی مقاصد کی خاطر انصاف کے تقاضوں کو پامال نہ کیا جائے' جہاں ایک ایسا کثیر الخیال معاشرہ وجود میں لایا جا سکے جو اخوت' ہم آہنگی' قوت برداشت اور ہمدردی کے اصولوں پر مبنی ہو۔"

مجھ سے انہوں نے انتقام لیا اس لئے کہ انہوں نے مجھے اپنے والد کے قتل میں شریک جرم سمجھا تھا۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ میں واحد جنرل تھا جس نے بھٹو کی پھانسی کے فیصلے سے اختلاف کیا تھا اور اس اختلاف کے سبب مجھے کمانڈ سے ہٹا دیا گیا تھا۔ وہ سمجھتی تھیں کہ 1990ء میں ان کی حکومت کو گرانے میں صدر غلام اسحاق خان پر میری طرف سے دباؤ تھا جبکہ حقیقت وہی تھی جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔

محترمہ کی ناراضگی کا ایک سبب اور بھی تھا کہ ملک کے اندر ایک ایسی لابی تھی جو میری شخصیت کو متنازع بنانا چاہتی تھی۔ اس لئے کہ بحیثیت آرمی چیف اس وقت کے چند اہم معاملات اور واقعات پر میرا موقف ان کے مفادات کی راہ میں رکاوٹ بن گیا تھا۔ اس کی پاداش میں مجھے ایسا الجھایا گیا کہ آج تک مجھے سکون نہیں مل سکا ہے۔ عورت کا انتقام ضرب المثل ہے۔ بے نظیر بھٹو نے اگر انتقام لیا تو وہ تقاضائے فطرت تھا۔ مجھے اس بات پر کوئی دکھ

نہیں ہے۔ ہاں' اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ انصاف کیا ہے۔ پیپلز پارٹی کا بنایا ہوا سازشی مقدمہ جو 25 سالوں سے میرے خلاف چل رہا ہے' اس کے متعلق آج ہماری بڑی عدالت کو ہمارے ہی ادارے ایف آئی اے نے بڑے واضح الفاظ میں یہ کہہ دیا ہے کہ "اس مقدمے کو بند کر دیجئے' ہمیں ان کے خلاف کوئی شہادتیں نہیں ملیں۔" حق غالب ہے' باطل شرمسار ہے۔ الحمدللہ۔

حکومت کی طرف سے ہمیں افغان مجاہدین سے روابط اور نئی حکمت عملی مرتب کرنے کی ذمہ داری ملی۔ جب ہم ضرب مومن کی تیاریوں میں مصروف تھے تو وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے ہمیں ایک اہم ذمہ داری سونپی کہ ہم افغان مجاہدین سے تفصیلی مذاکرات کریں اور حکومت کو لائحہ عمل پیش کریں کہ افغانستان میں امن قائم کرنے کے لیے ہماری ترجیحات کیا ہونی چاہئیں۔ اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لئے وزارت خارجہ کے افغان سیل' آئی ایس آئی اور متعلقہ محکموں کو خصوصی ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ ہمارے ساتھ پورا تعاون کریں۔

ہم نے لائحہ عمل تیار کیا' مجاہدین لیڈروں کو میٹنگ کے لئے دعوت دی۔ پروفیسر مجددی' پروفیسر ربانی' استاد سیاف' انجینئر گلبدین حکمت یار' مولوی یونس خالص اور نبی محمدی سے تفصیلی بات چیت ہوئی' احمد شاہ مسعود کو دعوت دی اور وہ بھی تشریف لائے۔ ڈیڑھ ماہ تک کئی اجلاس ہوئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ جب ہم ضرب مومن مشقوں میں مصروف تھے۔ متعدد بار مجھے فیلڈ سے راولپنڈی آ کر ان ملاقاتوں میں شریک ہونا پڑا۔ اللہ کا کرم کہ ہم دو بڑی ذمہ داریاں ایک ساتھ نبھانے میں کامیاب ہوئے۔ جو ذمہ داری افغانستان کے حوالے سے وزیراعظم نے دی تھی وہ ہم نے پوری کی اور تمام سفارشات مکمل کر کے انہیں پیش کر دیں اور یقیناً وہ ان پر عمل کرتیں لیکن حالات کے جبر نے انہیں موقع نہ دیا اور ان کی حکومت جاتی رہی۔

جنرل اسلم بیگ، لیفٹیننٹ جنرل حمید گل کے ساتھ افغان رہنماؤں کے ساتھ مذاکرات کرتے ہوئے

سوال:۔۔۔۔ آپ نے نواز شریف کے دور حکومت میں بھی تقریباً ایک سال خدمات انجام دیں۔ ان کے بارے میں بھی کچھ بتائیں؟

جواب:۔۔۔۔ بدقسمتی سے یہ پہلی خلیج جنگ کا دور تھا کہ جس سے متعلق حکومت کی پالیسی سے میں نے اختلاف کیا۔ نواز شریف ناراض ہو گئے اور میری ریٹائرمنٹ تک ناراض رہے۔ اسی طرح امریکہ بھی ناراض ہوا اور سعودی عرب بھی۔

وزیراعظم نواز شریف کے دور حکومت میں خلیج کی پہلی جنگ اور افغانستان کے بدلتے ہوئے حالات اہم معاملات تھے۔ ایران عراق جنگ میں ایران کو برتری حاصل رہی لیکن حقیقت یہ ہے کہ امریکہ کی امیدوں کے برخلاف اس جنگ میں "ایران اور عراق ایک دوسرے کو تباہ نہ کر سکے" جیسا کہ ہنری کسنجر نے خواب دیکھا تھا۔ امریکہ نے ایران کے خلاف ہر قسم کی پابندیاں لگا رکھی تھیں لیکن انقلابی قیادت نے بڑے حوصلے کے ساتھ ان

مشکلات کا مقابلہ کیا تو فیصلہ ہوا کہ کسی طرح صدام کو ایک بے مقصد جنگ میں الجھا کے اس کی عسکری قوت کو تباہ کر دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے صدام کو سبق پڑھایا گیا کہ کویت عراقی سرزمین کا حصہ ہے' اسے فتح کر لینا مشکل نہیں ہوگا' امریکہ بھی مدد دے گا۔ سعودی عرب اس حکمت عملی کے خلاف تھا۔

اختلافات بڑھتے گئے تو امریکہ نے مداخلت کا فیصلہ کیا اور اپنی فوج سعودی عرب میں اتاردی تا کہ صدام' سعودی عرب کو نقصان نہ پہنچا سکے جبکہ اس فیصلے کے پیچھے مقاصد کچھ اور تھے۔ سعودی عرب پر عراق کے حملے کا ڈھونگ رچایا گیا اور پاکستان کو سعودی عرب کی حکومت کے تحفظ کے لئے سعودی عرب میں موجود تقریبا 15000 پاکستانی فوج کو سعودی کمانڈ میں دینے کی تجویز دی اور اس کے عوض پاکستان کو بھاری مالی امداد کا وعدہ کیا۔ ہماری حکومت اس کے لئے تیار نظر آئی جسے میں غلط اور ملکی مفاد کے خلاف سمجھتا تھا۔ میں نے وزیراعظم کو اپنی تشویش سے آگاہ کیا لیکن وہ مجھ سے متفق نہ ہوئے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میرا خاموش رہنا غلط ہوگا۔ میں نے اپنے خدشات میڈیا کو بتائے کہ:

''ہماری فوج کرائے کی فوج نہیں ہے۔ خطرہ سعودی عرب کو نہیں بلکہ صدام کو ہے۔ کویت کو فتح کرنے کا جھانسہ دے کر امریکہ صدام کی فوج کو کھلے میدانوں میں لا کر تباہ کرنا چاہتا ہے۔''

اس بات پر نواز شریف مجھ سے ناراض ہو گئے۔ میں نے ان سے اجازت لی اور سعودی عرب اپنی فوج سے ملنے گیا۔ ریاض پہنچا تو اسی رات سات میزائل فائر کر کے صدام نے مجھے سلامی دی۔ صرف تین میزائل امریکی پیٹریاٹ (Patriot) روک سکے جس سے سکڈ (Scud) جیسے Unguided میزائل کی افادیت میرے ذہن میں آئی جو حزب اللہ اور اسرائیل کی جنگ میں حزب اللہ کی کامیابی کا سبب بنی۔ اس کی تفصیل بعد میں بیان کروں گا۔ شاہی خاندان نے ہمیں بڑی عزت دی۔ وہاں سے میں تبوک گیا۔ اپنے افسروں اور جوانوں سے ملنے کے بعد میں ڈیزرٹ اسٹارم ہیڈکوارٹر میں جنرل Showartzkof سے

ملنے گیا جو زیرزمین ایک وسیع کامپلیکس تھا جسے ہمارے انجینئرز نے بنایا تھا۔ ان سے بڑی مفید بات چیت ہوئی۔ انہوں نے کچھ افسردہ الفاظ میں کہا:

''مجھے لگتا ہے کہ پینٹاگون نے ہمارے اہداف کو بدل دیا ہے (Have shifted the goal post)

میں نے وضاحت چاہی تو انہوں نے جواب دیا:

''آپ جلد ہی دیکھ لیں گے۔''

ان کا مطلب تھا صدام کی فوج کی تباہی ہوگی' جب وہ کویت فتح کر کے واپس آ رہی ہوگی۔ یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جسکی جنرل Showartzkof کو بھی آخری وقت تک خبر نہ تھی۔

وہاں سے ہم مدینہ منورہ گئے' زیارت کی' مکہ گئے' عمرہ ادا کیا اور واپس آ گئے۔ اس جنگ کے بعد وزیراعظم مجھ سے ناراض ہی رہے۔ ان کے رفقاء مجھ پر الزام لگاتے رہے کہ جو بھاری امداد ہمیں امریکہ سے مل سکتی تھی' میری وجہ سے وہ اس سے محروم ہو گئے۔ اور اس کے بعد سے امریکہ اور سعودی عرب دونوں نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے۔

نواز شریف کے بہی خواہوں نے یہ تاثر پیدا کر دیا تھا کہ میں کسی بھی وقت مارشل لاء لگا سکتا ہوں۔ اس کی وجہ سے حکومت پر ہر وقت خوف طاری رہتا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے میں نے ان کے سامنے 1973ء میں تیار کی جانے والی جنرل شریف کی رپورٹ کی سفارشات پیش کیں کہ ''تینوں افواج کو ایک کمانڈ کے نیچے کر دیا جائے تو سول ملٹری تعلقات بہتر ہوں گے اور بری فوج کا سربراہ شب خون نہ مار سکے گا۔'' انہوں نے اس تجویز پر غور نہ کیا۔ وہ یہ سمجھے کہ شاید میں خود چیف آف ڈیفنس سٹاف (Chief of Defence Staff) بننا چاہتا ہوں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے یہ عہدہ نہ بنا کے اپنے اوپر ظلم کیا' اسی طرح نواز شریف نے بھی یہ عہدہ نہ بنا کے خود پر ظلم کیا اور آج تک اس ظلم کا شکار ہیں۔ انہی حالات میں میری ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا اور 16 اگست 1991ء کو میں ریٹائر ہو گیا۔

سوال:...... جنرل صاحب آپ ریٹائر تو ہو گئے لیکن ملک کی کچھ مقتدر قوتوں کو ناراض

بھی کر گئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ آپ پر سنگین الزامات لگے' مقدمات چلے اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب:...... کیا کروں میری مجبوری ہے کہ جب دیکھتا ہوں کہ کوئی ایسا کام ہونے جارہا ہے جس سے ملک یا میرے ادارے کی ساکھ کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو خاموش نہیں رہ سکتا' بولتا ہوں' احتجاج کرتا ہوں' اس بات کی پرواہ کئے بغیر کہ اس سے میری ذات کو کتنا نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ امریکہ مجھ سے ناراض' سعودی عرب ناراض' نواز شریف ناراض' بے نظیر بھٹو ناراض۔

امریکہ کی ناراضگی اس لئے ہے کہ میں نے ان کے سامنے سرنگوں ہونے سے انکار کر دیا۔ سعودی عرب اور نواز شریف اس لئے ناراض ہیں کہ خلیج کی جنگ میں میں نے پاکستانی فوج بھیجنے سے انکار کر دیا تھا۔ بے نظیر بھٹو اس لئے ناراض کیونکہ انہیں باور کرایا گیا تھا کہ 1990ء میں میری ایماء پر ان کی حکومت گرائی گئی تھی۔ ائر مارشل اصغر خان کیوں ناراض؟ شاید اس لئے کہ جنرل ایوب خان نے انہیں پاکستان ائر فورس کی کمانڈ سے ہٹا دیا تھا' ان کا انتقام مجھ سے لیا۔ جنرل اسد درانی اس لئے ناراض کہ جنرل عبدالوحید نے انہیں قبل از وقت ریٹائر کر دیا تھا اور انہوں نے جنرل وحید کا انتقام مجھ سے لیا۔

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد
گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

اسی نوعیت کا ایک واقعہ بیان کرنا چاہوں گا جو 1989ء میں پیش آیا جب محترمہ بے نظیر بھٹو نے میجر جنرل نصیراللہ بابر کو میرے پاس بھیجا' جو مڈ نائٹ جیکال (Midnight Jackal) کے نام سے ایک انکوائری لے کر آئے تھے۔ اس میں آئی ایس آئی کے دو آفیسرز بریگیڈئر امتیاز اور میجر عامر پر الزام تھا کہ دونوں افسروں نے محترمہ کے خلاف تحریک عدم اعتماد چلانے میں حزب اختلاف کی جماعتوں کا ساتھ دیا ہے۔ ان کا فیلڈ جنرل کورٹ مارشل (FGCM) ہونا چاہیے۔ میں نے رپورٹ پڑھی جس میں فیلڈ جنرل کورٹ مارشل کے لئے

شہادتیں ناکافی تھیں اس لئے اپنے سمری اختیارات (Summary Powers) کے تحت ان کے ٹرائیل کا فیصلہ کیا اور دونوں افسروں کو قبل از وقت سروس سے ریٹائر کر دیا جس پر محترمہ ناراض ہوئیں اور 1993ء میں جب دوبارہ وزیراعظم بنیں تو دونوں افسروں کو قید کر لیا۔ بریگیڈئر امتیاز کو ہتھکڑی پہنائی اور ٹیلیویژن پر دکھایا۔ انتقام کی آگ ٹھنڈی ہوئی لیکن سزا نہ دے سکیں کیونکہ انہیں پہلے ہی سزا دی جا چکی تھی۔

سوال:...... ایک چوتھائی صدی سے زیادہ عرصہ ہو رہا ہے کہ آپ کے خلاف سپریم کورٹ میں مقدمہ چل رہا ہے اور اب تک کوئی حتمی فیصلہ نہیں آیا ہے؛ مسئلہ کیا ہے' آخر ایسا کیوں ہے؟

جواب:...... فیصلہ تو آ گیا ہے لیکن باضابطہ اعلان نہیں ہوا ہے۔ مجھ پر الزام ہے کہ میں نے آئی ایس آئی (ISI) کے ساتھ مل کر 1990ء کے قومی انتخابات میں بے نظیر بھٹو (BB) کی پارٹی کے خلاف کام کیا' ان کا مینڈیٹ چرایا' جس سے فوج کی بھی جگ ہنسائی ہوئی۔ ایسا ضرور ہے کہ انتخابات میں دھاندلی (Rigging) ہوئی' کیوں ہوئی' کیسے ہوئی اور اس کاروائی میں میرا کیا عمل دخل تھا یہ جاننا ضروری ہے۔

1975ء میں صدر ذوالفقار علی بھٹو نے ایک خصوصی نوٹیفکیشن (Notification-N-75) جاری کیا جس کے تحت آئی ایس آئی کو قومی انتخابات میں لاجسٹک سپورٹ (Logistic Support) فراہم کرنے کی ذمہ داری دی گئی۔ ایک سال بعد 1976ء میں جب قبل از وقت انتخابات کا فیصلہ ہوا تو آئی ایس آئی نے بھرپور کاروائی کی' احتجاج شروع ہوا کہ دھاندلی ہوئی ہے' پی این اے (PNA) کی تحریک چلی جو جنرل ضیاء الحق کی فوجی مداخلت کا سبب بنی۔ بھٹو کو پھانسی ہوئی اور اس کے بعد جو بھی صدر آیا اس کے ہاتھ میں 58-2(b) کا ہتھیار بھی تھا۔ اس طرح N-75 اور 58-2(b) جیسے دو مہلک ہتھیاروں کا 1977ء سے لے کر 2013ء تک بے دریغ استعمال کیا گیا اور اپنی مرضی کی حکومتیں بنائی گئیں۔ یہاں تک کہ 1988ء کے انتخابات میں اگر صدر غلام اسحٰق خان نہ چاہتے تو BB کی حکومت کبھی نہ بنتی اور

جو حکومت بھی اس طرح گرائی گئی اس کے دوبارہ انتخابات جیتنے کا امکان ہی نہ تھا جیسا کہ 1990ء کے انتخابات میں ہوا کہ BB کی دوبارہ حکومت ممکن نہ تھا۔

سوال:—— آپ پر 1990ء کے انتخابات پر اثر انداز ہونے کا الزام کیوں لگا؟

جواب:—— یہ ایک سازش تھی جو 1994ء میں میرے خلاف شروع ہوئی۔ BB کے مشیر خاص میجر جنرل نصیر اللہ بابر اپنے ایک پسندیدہ کور کمانڈر کو میری جگہ آرمی چیف بنانا چاہتے تھے۔ BB نے مجھے چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی بنا کر میری جگہ اس کور کمانڈر کو لانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے علم ہوا تو میں نے فارمیشن کمانڈر کانفرنس میں بغیر نام لئے اس سازش کا تذکرہ کیا اور واضح الفاظ میں تاکید کی کہ کوئی سرخ لائن سے آگے جانے کی کوشش نہ کرے ورنہ وہ شرمسار ہوگا۔ یہ خبر جب BB کو پہنچی تو انہوں نے مجھے خط لکھا جو میرے پاس ہے۔ اس خط میں انہوں نے اعتراف کیا کہ کمانڈ میں ایسی کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔

یہ ان کا ظرف تھا کہ اس بات کو تسلیم کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان کے کچھ وزیر باتدبیر ایسے بھی تھے جو میرے خلاف ان کے کان بھرتے رہتے تھے اور خصوصاً جب صدر غلام اسحٰق خان نے 1990ء میں ان کی حکومت گرائی تو ذمہ دار مجھے ٹھہرایا گیا جبکہ حقیقت اس الزام کے برعکس تھی۔ واقعات کچھ اس طرح تھے کہ BB کی حکومت گرانے سے چند ہفتے پہلے صدر غلام اسحاق خان نے مجھے ایک Non-Paper دیا جس میں BB کے خلاف متعدد الزامات تھے۔ میں نے وہ الزامات فارمیشن کمانڈرز کے سامنے رکھے، تفصیلی بحث ہوئی اور صدر کو یہ پیغام پہنچانے کا فیصلہ ہوا:

''صدر محترم! آپ صبر سے کام لیں، سمجھائیں تاکہ معاملات درست ہو جائیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ PM سیکھ جائیں گی۔'' میری باتیں صدر نے سنیں اور بولے ''سمجھاؤں گا، پہلے بھی سمجھاتا رہا ہوں، دیکھتا ہوں۔''

لیکن ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ انہوں نے BB کی حکومت برخواست کر دی جس پر مجھے حیرت ہوئی۔ سوچا کہ صدر کے فیصلہ کو بدل دوں، جس کے لئے اختیارات ہاتھ میں لینے

پڑتے لیکن یہ سوچ کر کہ جب ہمارے 17 اگست 1988 کے فیصلے کو کوئی اہمیت نہ دی گئی تو Take-over کا فیصلہ کیسے قبول ہوگا، خاموش ہو رہا۔ میری خاموشی کو BB کی حکومت گرانے کی سازش سے تعبیر کیا گیا اور اس کے بعد میرے خلاف سازش کا آغاز ہوا۔

پاکستان پیپلز پارٹی مجھ سے ناراض تو تھی ہی کہ میں نے اپنے چند فیصلوں سے اوروں کو بھی ناراض کرلیا، مثلاً 1991ء کی خلیج کی جنگ کے دوران میں نے 15,000 پاکستانی فوج کو جو سعودی عرب میں تھی اسے کرایے کی فوج نہ بننے دیا جس کے سبب سعودی عرب، امریکہ اور نواز شریف بھی مجھ سے ناراض ہو گئے۔ 1994ء میں جب BB کی دوبارہ حکومت بنی تو اسی دوران میرے خلاف سازشی کاروائی شروع ہوگئی۔ رحمٰن ملک جو ایف آئی اے (FIA) کے ڈائریکٹر تھے، ان کو ذمہ داری سونپی گئی۔ سب سے پہلے انہوں نے جنرل اسد درانی کا انتخاب کیا جنہوں نے 1990ء کے انتخابات میں صدر غلام اسحاق خان کے تحت N-75 کا استعمال کیا تھا۔ 1994ء میں جنرل درانی فارغ تھے کیونکہ جنرل عبدالوحید نے انہیں پیپلز پارٹی کی سیاست میں ملوث ہونے پر DGISI کے عہدے سے ہٹا دیا تھا اور سروس سے بھی فارغ کر دیا تھا۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے انہیں جرمنی میں سفیر بنا کر ان کی وفاداری خریدی۔ اس کے بعد رحمٰن ملک 6 جون 1994ء کو جرمنی گئے اور اپنا مقصد بیان کیا۔ مقصد تھا میرے خلاف مقدمہ بنانا۔ جنرل درانی کو رحمٰن ملک کی باتوں پر یقین نہیں آیا اس لئے انہوں نے BB سے گیم پلان (Game Plan) کی وضاحت مانگی اور اپنے ہاتھ سے BB کے نام یہ خط لکھا:

پاکستانی سفیر کا خط بنام وزیراعظم پاکستان

(For Eyes Only)

7 جون 1994ء

محترمہ وزیراعظم صاحبہ

چند نکات جو میں ڈائریکٹر ایف آئی اے کے حوالے کئے جانے والے اپنے اعترافی

بیان میں شامل نہ کر سکا۔ یہ حساس اور پریشان کن نوعیت کے ہیں:

اے۔رقم وصول کرنے والوں میں کھر 2 ملین' حفیظ پیرزادہ 3 ملین' سرور چیمہ 0.5 ملین اور معراج خالد 2.3 ملین۔ آخری دو حضرات مخالف سمت میں نہیں تھے۔ یہ کسی مہربان کی ''نظر کرم'' تھی کہ انہیں بھی بہرہ مند کیا جائے۔بی۔باقی 80 ملین آئی ایس آئی کے''کے فنڈ(K Fund)'' میں جمع کرائے گئے۔60 ملین ڈائریکٹر بیرونی انٹیلی جنس (External Intelligence) کو خصوصی آپریشنز کے لیے دیے گئے۔

(شاید اس رسوا کن مشق کا مقصد منہ چھپانا ہو لیکن درست اور حساس نوعیت کی ہے)۔

سی۔اس آپریشن کو نہ صرف صدر کی ''سرپرستی'' حاصل تھی بلکہ نگران وزیراعظم بھی دل و جان سے اس میں شامل تھے بلکہ فوج کی ہائی کمان کے بھی علم میں تھا۔آخر الذکر' جنرل بیگ ہم سب کا دفاع کرے گا' جنہوں نے اپنے ساتھیوں کو اعتماد میں لیا تھا لیکن یہ وہ نام ہے جس کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔

ایک نکتہ جس نے میرے ذہن میں ہلچل مچا رکھی ہے' یہ ہے کہ آخر اس مشق کا ہدف کیا ہے:

اے۔اگر اس کا مقصد حزب اختلاف کو ہدف بنانا ہے تو ''عطیات وصول کرنا ان کا جائز حق بھی ہوسکتا ہے' بالخصوص جب یہ عطیات 'مقدس ذرائع' سے آ رہے ہوں۔

بی۔اگر اس طرح جنرل بیگ کے خلاف گھیرا تنگ کرنا مقصود ہے تو وہ ایک گروہ کی جانب سے مہیا کی جانے والی عطیات کی رقم کو حکومت کی ''ہدایات'' اور ''رضامندی'' کے مطابق لاجسٹک سپورٹ مہیا کر رہے تھے۔میرے خیال میں وہ اس سلسلے میں اور بہت سے معاملات میں بھی ملوث ہیں۔

سی۔غلام اسحاق خان اس سلسلے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے کیونکہ وہ براہ راست اس میں ملوث نہیں تھے۔

ڈی۔یقیناً قانون کے تقاضے پورے کرنے ہوں گے۔اس صورت میں ہمیں حساس

نوعیت کے معاملات کا خیال رکھنا چاہیے' مثلاً خصوصی آپریشنز اور فوج کی طرف سے۔انہی وجوہات کی بنا پر میں رخصت ہونے سے قبل آپ سے ملنے کا شدت سے خواہش مند تھا۔میں آپ سے چیف آف آرمی سٹاف (جنرل عبدالوحید) کے ساتھ ہونے والی الوداعی ملاقات کے بارے میں بھی بات کرنا چاہتا تھا۔

اس دوران آپ بھی کئی مرتبہ مل چکی ہوں گی اور یہ حکمت عملی بنا چکی ہوں گی کہ کیا ملک کے بہتر مفاد میں ہے۔میں دعا گو ہوں کہ یہ تمام معاملات اور ہمارے اپنے ہاتھوں سے آنے والے مصائب ہمارے قومی عزم کو تقویت دینے کا باعث بنیں گے اور کسی طور بھی ہمارے اجتماعی گناہوں کے آئینہ دار نہیں ہوں گے۔

بصد احترام
آپ کا مخلص
(اسد)

اس کے چند ہفتے بعد رحمٰن ملک دوبارہ جرمنی گئے اور ساتھ ہی سیاستدانوں کی ایک لمبی فہرست بھی لے گئے جن پر الزام تھا کہ انہوں نے 1990ء کے انتخابات میں آئی ایس آئی سے بھاری رقم لی تھی جس سے انتخابات کے نتائج تبدیل ہوئے۔جنرل درانی اس فہرست کو ماننے پر تیار نہ تھے اس لئے کہ اپنے خط میں انہوں نے تو چند نام لکھے تھے لیکن رحمٰن ملک نے ان سے ایک لمبی فہرست پر دستخط کرنے پر اصرار کیا' دباؤ ڈالا اور وعدہ کیا کہ:

> *"It had the approval of the Chief Executive and that the matter would be handled confidentially. I signed the prepared statement which was given to me by Mr. Rahman Malik."*

رحمٰن ملک واپس آئے' فہرست محترمہ کو دکھائی اور ان کی اجازت سے جنرل نصیراللہ بابر نے 11 جون 1996ء کو قومی اسمبلی میں اس فہرست کا اعلان کردیا۔اس وعدہ خلافی پر جنرل

درانی سخت مایوس ہوئے جس کا اظہار انہوں نے سپریم کورٹ میں جمع کرائے جانے والے 31 جولائی 1997ء کے بیان حلفی میں ان الفاظ میں کیا ہے:

"The statement was got signed by me by Mr. Rahman Malik under special circumstances and I was given the assurance that the matter would be dealt with confidentially. I do not know under what circumstances the then Interior Minister made the statement in the National Assembly. I was unaware about his intentions that are known to him." "The affidavit was got signed from me on the understanding that it would only be used for specific purpose."

اس طرح جنرل درانی بھی دھوکہ کھا گئے لیکن اس عمل کے بعد تقریباً دوسال تک خاموشی رہی' اس لئے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے اپنے بنائے ہوئے صدر فاروق احمد خان لغاری نے 1996ء میں 58-2(b) کے تحت BB کی حکومت کو فارغ کر دیا اور اسی' جادوئی چھڑی' یعنی N-75 کو استعمال کر کے نواز شریف کو کامیابی کا موقع دیا۔ اس کے بعد BB اور ان کے تمام مشیران باتدبیر فارغ تھے اور میرے خلاف سازش میں لگ گئے۔

جب سازش تیار ہوگئی تو اکتوبر کے سپریم کورٹ میں داخل کرائے جانے والے جنرل اسد درانی کے بیان حلفی کے مطابق جنرل نصیر اللہ بابر آرمی چیف جنرل عبدالوحید کے پاس لے گئے کہ وہ میرا ٹرائل کریں لیکن جنرل وحید نے انکار کر دیا۔ شاید وہ بھی یہی چاہتے تھے کہ سول عدالت میں میری خاطر مدارت کی جائے۔

اس کامیابی کے بعد انہوں نے ایک سخت دل اور وفادار بندے کی تلاش شروع کی تو انہیں ائر مارشل اصغر خان مل گئے جنہوں نے 1977ء میں مارشل لاء لگانے اور بھٹو کو پھانسی

دلانے میں کلیدی کردار ادا کیا تھا اور 16 جون 1996ء کو اصغر خان کی مدعیت میں میرے خلاف مقدمہ چیف جسٹس سجاد علی شاہ کی عدالت میں دائر کر دیا گیا۔ یہ وہی اصغر خان ہیں جنہیں 1965ء کی جنگ سے پہلے پاکستان ائرفورس کی کمان سے ہٹا دیا گیا تھا۔

میں نے اس بارے میں صدر ایوب خان کے صاحبزادے جناب گوہر ایوب سے پوچھا تو انہوں نے اس بات کی تصدیق کی اور یہ بھی کہا کہ صرف کمان سے ہٹایا' کوئی سزا نہ دی کیونکہ:

> ''میرے والد نے کہا کہ جنگ ہونے والی تھی اور ہماری نئی نئی ائرفورس کو ایک بڑے دشمن کا سامنا تھا۔ ان حالات میں اگر میں ان کے چیف پر مقدمہ کر کے غداری کا داغ ان کے چہروں پر مل دیتا تو دشمن کے ساتھ جنگ میں ان سے کیا توقع رکھ سکتا تھا۔''

جنرل ایوب خان کی یہ سوچ کسی مدبر سے کم نہ تھی۔

جناب کوثر نیازی کی کتاب ''اور لائن کٹ گئی'' میں ان کے کردار کا تفصیلی بیان پڑھ لیجئے اور ان کا وہ خط بھی میں آپ کو دکھاؤں گا جس میں انہوں نے جنرل ضیاء الحق کو اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لینے کی ترغیب دلائی تھی اور کامیاب ہوئے تھے لیکن آج کل کے دستور کے مطابق کسی نے بھی انہیں غدار یا مودی کا یار نہیں کہا اور وہ اب بھی ہمارے لئے محترم ہیں۔ چلئے چھوڑیے ان باتوں کو' اس مقدمے کی طرف آیئے۔ چیف جسٹس سجاد علی شاہ نے ایک ہی سماعت کی تھی کہ ان کے خلاف سازش شروع ہوگئی اور ان کی جگہ جناب جسٹس سعید الزمان صدیقی چیف جسٹس بنے۔ 1997ء میں ان کی عدالت میں مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ ریکارڈ کو درست کرنے کے لئے میں نے N-75 عدالت میں پیش کرنے کی درخواست کی' اٹارنی جنرل نے N-75 عدالت کے سامنے پیش کیا جو عدالتی ریکارڈ کا حصہ بنایا گیا۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک خاموشی رہی۔ ہمارے قابل احترام وکیل صفائی (Defence Counsel) اکرم شیخ نے متعدد بار کوشش بھی کی کہ سماعت شروع ہو اور

فیصلہ ہو جائے لیکن طویل عرصہ کے بعد 2012ء میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری کی عدالت میں سماعت کا آغاز ہوا جو کئی ماہ تک جاری رہا۔ چھ ماہ کے عرصے میں جسٹس افتخار محمد چودھری نے بے شمار گواہوں کی شہادتیں اکٹھی کر لیں۔ جنرل درانی جو سرکاری گواہ بن گئے تھے ان کے بیانات' آئی ایس آئی کے افسران جو اس کام میں ملوث رہے تھے' ان کے بیانات اور دوسرے متعلقہ و غیر متعلقہ افراد کے بیانات قلم بند ہوئے جو بے شمار صفحات پر مشتمل ہیں۔

مجھے اجازت نہ تھی کہ ان گواہوں سے ایک سوال بھی پوچھ سکتا لیکن میرے لئے آسانی یہ ہوئی کہ انہی شہادتوں سے مجھے اندرونی کہانی کا علم ہوا جو میں نے اوپر بیان کی ہے۔ ان شہادتوں میں اور بھی بہت سے جھوٹ اور بے بنیاد الزامات شامل ہیں جن سے سازشیوں کی کم ظرفی عیاں ہوتی ہے۔ میرے دو حلفیہ بیانوں کے علاوہ نہ کوئی میرا گواہ پیش ہوا' نہ استغاثہ کے کسی گواہ سے جرح کرنے کی اجازت ملی۔

سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جب مارچ 2012ء میں چیف جسٹس افتخار محمد چودھری نے سماعت شروع کی تو عدالتی ریکارڈ میں مقدمے سے متعلق کاغذات (Court Proceedings) سے 1975ء کا صدارتی نوٹیفکیشن (N-75) غائب تھا اور ہمارے اصرار کے باوجود پیش نہیں کیا گیا جس کے سبب آئی ایس آئی کی تمام کاروائی غیر آئینی (Unlawful) قرار دے دی گئی اور جرم ثابت ہو گیا۔

مجھے شریک جرم کر لیا گیا کیوں کہ وعدہ معاف گواہ جنرل اسد درانی نے عدالت کے سامنے بیان دیا کہ یہ انتخابی لاجسٹک سپورٹ کی تمام کاروائی چیف آف آرمی سٹاف جنرل اسلم بیگ کے احکامات کے مطابق عمل میں آئی تھی لیکن اس الزام کا کوئی بھی ثبوت پیش نہ کر سکے کیونکہ وہ میرے ماتحت نہ تھے اور میں انہیں حکم دینے کا مجاز بھی نہ تھا۔

مختصر یہ کہ عدالت نے میرے اور دوسرے متعلقہ افسروں کے خلاف ایک سو ستر (170) صفحات پر مشتمل حکم نامہ جاری کر دیا کہ ہمارے خلاف آئین سے غداری کا مقدمہ شروع کیا جائے:

۔ایف آئی اے کو حکم دیا گیا کہ مکمل تفتیش کر کے حقائق پیش کئے جائیں تا کہ فیصلہ ہو سکے۔

۔آرمی چیف سے کہا گیا کہ ان سب کا کورٹ مارشل کریں

عدالت نے میری نظر ثانی کی درخواست (Review Petition) بھی نامنظور کر دی۔

۔ڈائریکٹر ایف آئی اے نے 16 مئی 2018ء کو عدالت کے روبرو بیان دیا کہ:

''ہاتھ سے لکھی ہوئی اس تحریر کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔
اس لین دین کا کوئی گواہ' کوئی تحریر شدہ یا زبانی ثبوت نہیں ہے' لہٰذا یہ محض جھوٹ ہے۔''

GHQ نے بھی ایک کمیٹی بنائی جس کے ارکان مجھ سے پوچھ گچھ کے لیے میرے پاس آئے۔ میں نے انہیں بتایا:

۔آئی ایس آئی کے 1975ء کے صدارتی نوٹیفکیشن کے تحت کاروائی سے میرا کبھی کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔

۔صدارتی نوٹیفکیشن کے تحت کی جانے والی یہ ساری کاروائی آئینی (Lawful) تھی۔

۔میں نے آرمی چیف ہوتے ہوئے ایسا کوئی حکم جاری نہیں کیا۔ ویسے بھی آئی ایس آئی آرمی چیف کے ماتحت نہیں ہوتی کہ میں اس کے سربراہ کو کوئی حکم جاری کرتا۔

۔میں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جو فوج کے آئینی کردار سے متصادم ہو۔

۔ایسے کسی حکم سے مجھے کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہ ہوا۔

میں سوچتا ہوں کہ آخر میرا قصور کیا تھا کہ جس کے تحت اتنے طویل عرصے تک میرا احتساب کیا گیا ہے۔ شاید قصور یہ تھا کہ میں نے 1988ء میں جنرل ضیاء کے حادثے کے بعد اقتدار اپنے ہاتھوں میں نہیں لیا۔ سازشی عناصر یہ امید رکھتے تھے کہ میں بھی جنرل مشرف کی طرح اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ملکی سلامتی اور اقتدار کو دوسروں کے ہاتھوں بیچتا رہوں گا

اور غدار وطن ہاتھ باندھے میرے ہمنوا بن جائیں گے۔ اگر یہی قصور ہے تو خالق کائنات نے مجھے ایک بڑی لعنت سے بچا لیا اور ان تمام عناصر کو شکست دی ہے جو میرے خلاف سازشیں کرتے رہے ہیں اور ہر وہ فیصلہ جسے میں نے ملک اور قوم کے مفاد کے منافی سمجھا اس سے اختلاف کیا' آواز اٹھائی' خواہ وہ ہمارے حکمرانوں کو اور ان کے آقاؤں کو کتنا ہی ناگوار گزرا ہو' اور جن کا مفاد پرست ٹولہ میرے خلاف سازشوں میں لگ گیا۔

چرچل کا قول ہے کہ "اگر انسان کے اندر اخلاقی جرات نہ ہو تو اس کی تمام خوبیاں بے معنی ہوتی ہیں۔" اللہ نے مجھے اخلاقی جرات عطا کی کہ ہر اس مقام پر جہاں قومی مفادات کے خلاف کوئی سازش نظر آئی' میں نے اس کے خلاف بلاخوف احتجاج کیا' اقدامات کئے اور کوئی بھی طاقت مجھے نقصان نہیں پہنچا سکی ہے اور اللہ نے مجھے وہ مقام آگہی عطا کیا جو کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ بے شک تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہی ہیں۔

باب ہشتم

ریٹائرمنٹ

میسر آتی ہے فرصت' فقط غلاموں کو
نہیں ہے بندہ حر کے لئے جہاں میں فراغ

میں نے اپنی ریٹائرمنٹ سے چار ماہ پہلے صدر اور وزیراعظم دونوں کو پانچ سینئر کور کمانڈروں کے نام دے دیے تھے اور اصرار کیا تھا کہ نئے آرمی چیف کا اعلان پہلے ہو جانا چاہیے۔ جنرل آصف نواز کی سہولت کے لئے میں نے انہیں چھ ماہ قبل جی ایچ کیو میں چیف آف جنرل سٹاف تعینات کر دیا تھا تاکہ وہ اس مرکزی ہیڈکوارٹر سے فوج کے معاملات اور کام کے طریقوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کر لیں۔ لہٰذا میرے کہنے پر صدر اور وزیراعظم نے میری ریٹائرمنٹ سے دو ماہ قبل جنرل آصف نواز کو آرمی چیف نامزد کیا تھا۔

یہ ایک اچھا فیصلہ تھا لیکن سازشیوں کو موقع مل گیا کہ وہ طرح طرح کی باتیں کرنے لگے اور خصوصاً یہ کہ جنرل اسلم بیگ کے ارادے درست نہیں ہیں اور وہ کسی وقت بھی ملک کا اقتدار ہاتھوں میں لے سکتے ہیں۔ جنرل آصف نواز بھی ایسی باتوں سے متاثر ہوئے۔ میں نے انہیں بلایا' تسلی دی اور کہا کہ آرمی ہاؤس تیار ہے (جہاں موجودہ آرمی چیف جنرل باجوہ قیام پذیر ہیں) آپ وہاں چلے جائیں' اپنی گارڈ بھی لے لیں۔ دوسرے دن صبح ہی جنرل آصف نواز اپنی ایک کمپنی گارڈ کے ساتھ آرمی ہاؤس منتقل ہو گئے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد راولپنڈی میں مستقل سکونت کے لیے مکان بنایا۔ یہاں کی آب و ہوا اچھی ہے اور فوجی ماحول ہے۔ ہمارے اکثر ساتھی یہیں رہتے ہیں۔ یہاں جتنی بھی فوجی تقاریب ہوتی ہیں' تمام دوستوں اور ساتھیوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ ہر سال جی ایچ کیو کے

زیرِاہتمام منعقد ہونے والی تقاریب میں ایک دو دفعہ تینوں سروسز کے فور سٹار جنرلز (Four Star Generals) سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔

اپنی ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی میں نے سوچنا شروع کر دیا تھا کہ اس قدر مصروف زندگی گذارنے کے بعد میں زندگی کے شب و روز کس طرح گزاروں گا تو سب سے پہلے میں نے اپنے تحقیقی ادارے فرینڈز کے قیام کے لئے ضروری اقدامات کئے' اپنے ساتھیوں' دوستوں اور پڑھے لکھے لوگوں کا انتخاب کیا۔ تنظیم سازی کی اور حکومت سے منظوری لی لیکن اس سے پہلے کہ' فرینڈز کے متعلق تفصیلات بتاؤں' میں چاہتا ہوں کہ اپنے اسٹاف اور قریبی ساتھیوں کا تذکرہ کروں جنہوں نے میرے کام میں مدد دی اور محنت سے ذمہ داری نبھائی۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو گذشتہ تینتیس (33) سال سے میرے ساتھ ہیں جو ان کے خلوصِ نیت اور کام سے لگن کی اعلیٰ مثال ہے۔

میرے پرائیویٹ سیکرٹری بریگیڈئر اعجاز امجد۔ ان کا تعلق بلوچ رجمنٹ سے ہے۔ میجر جنرل کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوئے اور اب راولپنڈی میں میرے گھر کے قریب ہی رہائش پذیر ہیں۔ بہت نفیس اور مخلص انسان ہیں' ہر خوشی و غمی کے موقع پر یاد رکھتے ہیں۔ ہم انہیں اپنے خاندان کا فرد سمجھتے ہیں۔ اکثر اوقات ملنے تشریف لے آتے ہیں۔ ادب و احترام کا اتنا لحاظ ہے کہ کوئی تحفہ یا کوئی چیز دینا ہو تو خود آ کے دے جاتے ہیں۔ ایسے پر خلوص کم ہی لوگ ہوں گے۔

اے ڈی سی۔ کیپٹن عمر فاروق درانی کا تعلق آرمرڈ رجمنٹ سے ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے تک پہنچے اور پاکستان آرڈیننس فیکٹری کے چیئرمین بھی رہے۔ میرے گھر میں ایک تصویر لگی ہے "ترقی کی گیارہ منزلیں۔" یہ تصویریں کیپٹن عمر فاروق درانی نے مجھے پیش کیں۔ نہ جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈھ کے 1950ء کی پہلی وردی کی تصویر سے شروع کر کے آرمی چیف کی وردی تک کی گیارہ تصویریں لگائی ہیں۔ ان منزلوں کی نشاندہی کی جن سے میں گذرا ہوں۔

پرسنل اسسٹنٹ (PA)۔ حوالدار صادق حسین 33 سالوں سے میرے ساتھ ہیں۔ ان کا تعلق آرمی کور آف کلرکس (ACC) سے ہے۔ وہ ایک اچھے اردودان ہیں۔ 1989ء کی بات ہے کہ صدر غلام اسحٰق خان صاحب کو پاکستان ملٹری اکیڈمی کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کا معائنہ اور خطاب کرنے جانا تھا۔ صبح تقریب تھی اور رات کے پچھلے پہر انہوں نے فون کیا کہ انکی طبیعت خراب ہے لہٰذا میں ان کی جگہ پی ایم اے کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کا معائنہ کرنے چلا جاؤں۔ میں نے بریگیڈئر اعجاز امجد کو کہا کہ میری تقریر تیار کریں۔ انہوں نے حوالدار صادق کو بلا لیا اور ایک عمدہ تقریر تیار کر لی۔ صادق حسین کی اس صلاحیت سے میں متاثر ہوا اور فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد میں انہیں اپنے ساتھ لے آیا اور اپنے تحقیقی ادارہ فرینڈز میں ان کو ذمہ داری دی۔ آفس سیکرٹری کے علاوہ وہ میرے انگریزی مضامین کی ایسی عمدہ ترجمانی کرتے ہیں کہ اردو کا مضمون اصل معلوم ہوتا ہے۔

کرنل اشفاق نے میرا انٹرویو لینا شروع کیا جو پہلے تو آسان لگا لیکن مسودہ تیار کر کے درست شکل میں لانا مشکل کام تھا جو صادق حسین نے انجام دیا۔ اس کے بعد ایک ڈرافٹ پھر دوسرا ڈرافٹ اور تیسرا ڈرافٹ' انہوں نے جس خوش اسلوبی سے تیار کیا اس میں زبان کی شائستگی اور نفاست نمایاں رہی ہے۔ میرا کام انہوں نے آسان کر دیا ہے جو پر خلوص خدمت کی اعلیٰ مثال ہے۔ بڑے مخلص اور وضع دار انسان ہیں۔ 1987ء سے 1991ء تک چیف آف آرمی سٹاف سیکرٹریٹ میں میرے ساتھ رہے اور 1992ء سے لے کر آج تک وہ میرے ساتھ بحیثیت آفس سیکرٹری کام کر رہے ہیں۔ 2020 میں ہماری رفاقت کو 33 سال ہو گئے ہیں۔ بڑی عمر کے باوجود ان کی کارکردگی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ میں ان کا مشکور ہوں۔

نائب صوبیدار محمد صفدر کا تعلق ایس ایس جی سے ہے۔ 1988ء میں میرے ساتھ ذاتی سکیورٹی گارڈ کی حیثیت سے تعینات ہوئے۔ 1992ء میں فوج سے ریٹائر ہوئے اور اس وقت سے میرے ساتھ ہیں۔ ان کے ساتھ رفاقت کے 31 سال ہو چکے ہیں۔ تین سال پہلے

ان پر فالج کا حملہ ہوا لیکن میرا ساتھ نہیں چھوڑا اور نہ ہی کسی کام میں کمی آئی ہے۔ خاندان کے فرد کی طرح چھوٹے بڑے سب کا خیال رکھتے ہیں۔ کوئی بھی کام ہو اپنی ذمہ داری سمجھ کر پورا کرتے ہیں۔ خلوص اور وفاداری کی اعلیٰ مثال ہیں۔

صوبیدار محمد عارف میرے ہاؤس اے ڈی سی تھے اور میرے گھر 19 پشاور روڈ کی سکیورٹی گارڈ کی کمان بھی کرتے تھے۔ ان کا تعلق آرمی سروس کور (ASC) سے تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد آج کل دینہ (ضلع جہلم) کے قریب گاؤں میں رہائش پذیر ہیں۔

ڈرائیور عبدالشکور بڑے پرانے اور منجھے ہوئے ڈرائیور تھے جو پاکستان کے پہلے کمانڈر انچیف جنرل گریسی سے لے کر میرے چیف آف آرمی سٹاف بننے تک تمام آرمی چیفس کے سرکاری ڈرائیور رہے۔ ان کے ذمے جنرل ایوب خان کے زمانے کی ایک مرسڈیز 500 تھی جس پر میں کبھی نہیں بیٹھا۔ وزیر اعظم محمد خان جونیجو کے حکم کی تعمیل میں' میں نے ایک چھوٹی کرولا گاڑی ہی استعمال کی۔ بابا شکور میرے ساتھ ریٹائر ہو گئے۔ انہیں میں نے اپنے ساتھ فرینڈز میں لے لیا۔ 2001ء میں وفات پائی۔

میری تمام تر کمزوریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ نے مجھے بڑی عزت بخشی۔ 1949ء میں خالی ہاتھ پاکستان آیا تھا لیکن قوم نے انعام و اکرام سے میری جھولی بھر دی۔ الحمد للہ' حتی الوسع میری کوشش رہی ہے کہ حق کا راستہ اختیار کروں اور بلاخوف ان راستوں پر چلتا رہا ہوں اور جہاں مشکل پیش آئی ہے وہاں حق نے میری رہنمائی کی اور مجھے ایسے مخلص اور ملنسار لوگوں کی رفاقت بخشی۔

فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے اپنا تحقیقی ادارہ فرینڈز (Foundation for Research on International Environment, National Development and Security (FRIENDS) بنایا جس کو قائم کرنے کے لیے میں نے ریٹائرمنٹ سے پہلے ہی منصوبہ بندی کر لی تھی۔ اس ادارے کے قیام کے پیچھے یہ سوچ کارفرما تھی کہ ہمارے ملک میں کوئی اس قسم کا غیر سرکاری و غیر سیاسی ادارہ (Think

Tank) نہیں ہے جہاں بین الاقوامی' علاقائی اور ملکی معاملات پر غیر جانبدار اور آزادانہ ماحول میں بحث کر کے حکومت کو تجاویز پیش کی جا سکیں۔ اس ادارے کے بنیادی مقاصد یہ تھے:

☆ قومی و عوامی مسائل پر آزادی کے ساتھ بحث و مباحثہ کر کے آگہی پیدا کرنا اور تحقیقی مضامین کی شکل میں اپنی سفارشات پیش کرنا۔

☆ نیشنل سکیورٹی کونسل کی کمی کو اپنی تحقیقی کاروائیوں سے پورا کرنا تا کہ حکومت اور قومی اداروں کو منصوبہ بندی میں آسانی ہو۔

اپنی فکری آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے دوستوں کی مدد اور اپنے وسائل پر بھروسہ کیا۔

میں خوش قسمت تھا کہ ڈائریکٹر سائیکالوجیکل آپریشن' (Director Psychological Operation) ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن' ڈائریکٹر جنرل آئی ایس پی آر (ISPR) میجر جنرل ریاض اللہ اور کموڈور فصاحت حسین سید میرے معاون بنے جنہوں نے تمام ضروری کاروائی مکمل کر کے ستمبر 1991ء کو ادارے کے قیام کا اعلان کیا اور فرینڈز کے پہلے بورڈ آف گورنرز کا اجلاس منعقد ہوا جس میں بورڈ آف گورنرز کے ممبران اور فرینڈز کے عہدیداروں کا انتخاب کیا گیا جو تمام معتبر شخصیات تھیں:

لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) کمال متین الدین۔ سینئر وائس پریذیڈنٹ
کموڈور (ریٹائرڈ) فصاحت حسین سید۔ ایگزیکٹو وائس چیئرمین
ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن۔ سیکرٹری جنرل
کرنل (ریٹائرڈ) غلام سرور۔ سینئر ریسرچ فیلو
ائر مارشل (ریٹائرڈ) ایاز احمد خان۔ ممبر بورڈ آف گورنرز
ڈاکٹر ایس ایم قریشی۔ ایضاً
جناب مشاہد حسین سید۔ ایضاً
ڈاکٹر مقبول احمد بھٹی۔ ایضاً
ڈاکٹر ایم آر خان۔ ایضاً

ڈاکٹر پرویز اقبال چیمہ۔ ایضاً

بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) عبدالرحمٰن صدیقی۔ ایضاً

چند ہفتوں میں چاروں صوبوں میں فرینڈز کے صوبائی دفاتر (Chapters) قائم ہو گئے اور ان کے سربراہ مقرر ہوئے:

ڈاکٹر ایم آر خان۔ صدر کراچی آفس

کرنل اکرام اللہ۔ صدر لاہور آفس

پروفیسر ڈین احمد۔ صدر پشاور آفس

محمد احمد گوندل۔ صدر کوئٹہ آفس

اس ادارے کے قیام کے ساتھ ہی ملک میں سیمیناروں اور کانفرنسوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ہمیں بڑی کامیابی حاصل ہوئی اور ملک میں اہم قومی موضوعات پر اتفاق رائے کے لئے بحث و مباحثے کا سازگار ماحول (Climate of Opinion) بننا شروع ہوا۔ ہم نے ہر سال ایک بین الاقوامی سیمینار، تین علاقائی سیمینار اور دس بارہ قومی سطح کے سیمینار منعقد کرنے شروع کئے۔ اس کے علاوہ ہم نے بیرون ملک مثلاً چین اور ترکمانستان میں بھی بین الاقوامی سطح کے سیمینار کامیابی سے منعقد کرائے۔

<u>چین کے دورے۔ صحابہ کرامؓ کے مزارات پر حاضری:</u>

1993ء میں فرینڈز اور دوست ملک چین کے ادارے Chinese People's Association for Peace and Disarmament(CPAPD) کے درمیان معاہدہ ہوا جس کے تحت دونوں اداروں کے درمیان مشترکہ سیمینار ہوتے تھے اور دانشوروں کے وفود ہر دوسرے سال دونوں ملکوں کا تحقیقی دورہ کرتے' ثقافتی' سماجی اور معاشرتی محرکات کا جائزہ لے کر رپورٹ تیار کرتے اور مختلف سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کرتے۔ میں نے اس طرح کے پانچ دورے کئے جن میں سے دو دورے بہت ہی اہم تھے اور اس نوعیت کا دورہ شاید ہی کوئی اور پاکستانی وفد کر سکا ہو۔

پہلا دورہ 1994ء میں کیا۔ گلگت سے درہ خنجراب پہنچے جہاں چینی دوستوں نے ہمارا استقبال کیا۔ وہاں سے سڑک کے راستے کاشغر آئے۔ وہاں ایسا لگا جیسے پشاور جیسا کوئی شہر ہے' کھانا اور بود و باش ہمارے ہی جیسا تھا۔ وہاں سے ہم ارمچی (Urmqi) گئے جہاں دو دن قیام کے بعد ہوائی جہاز سے شیان (Xian) پہنچے۔ یہ شہر اپنی ثقافت' تہذیب اور نوادرات کے حوالے سے ساری دنیا میں مشہور ہے۔ شیان سے بیجنگ گئے جہاں سیمینار میں شرکت کی۔ چند دن قیام کے بعد شنگھائی اور وہاں سے کنٹون (Canton) پہنچے۔ یہاں آ کر معلوم ہوا کہ یہاں چند صحابہ کرامؓ کے مزار بھی ہیں جن میں سعد بن ابی وقاصؓ کا مزار بھی ہے۔

بڑی حیرت ہوئی کہ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے تو ایران فتح کیا تھا وہ ادھر کیسے آ ئے۔ پتہ چلا کہ تانگ خاندان کی حکمرانی کے دور میں شہنشاہ تائی زونگ نے ایک خواب دیکھا کہ ایک پگڑی والا شخص شیطان کا پیچھا کر رہا ہے۔ شیطان بھاگتے ہوئے اس کے محل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس نے دوسرے دن اپنے درباریوں سے اس کا تذکرہ کیا اور تعبیر پوچھی۔ کسی نے بتایا کہ سرزمین حجاز میں ایک رسول کی بعثت ہوئی ہے جو برائیوں کو مٹانے اور نیکیوں کے فروغ کا حکم دیتے ہیں۔ روایت ہے کہ اس نے اپنا ایک ایلچی اس درخواست کے ساتھ مدینہ بھیجا کہ نئے دین کی معلومات کے لئے کچھ آدمی چین بھیجے جائیں۔

اس وقت حضرت عثمانؓ خلیفہ تھے۔ انہوں نے حضرت ثابت بن قیسؓ (جو عشرہ مبشرہ میں شامل تھے)' حضرت سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت اویس قرنیؓ کو سمندری راستوں سے چین بھیجا۔ حضرت اویس قرنیؓ کا تو سفر کے دوران ہی یومان اور کانسو کی سرحد پر انتقال ہو گیا' ثابت بن قیسؓ شمین زیانگ کی وادی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کنٹون پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ شہنشاہ سے ملاقات ہوئی۔ ان سے بہت سے سوالات کئے جن میں ایک یہ بھی تھا کہ تمہارا نیا دین ہمارے کنفیوشزم اور بدھ مت سے کیونکر بہتر ہے؟ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا جواب سن کر وہ خوش ہوا اور انہیں ایک مسجد تعمیر کر کے دی اور اس کے ارد گرد چند رہائشی کمرے بھی بنوا دیے اور انہیں اپنے دین کی باتیں لوگوں کو سکھانے

کی اجازت دی۔ ان کے انتقال پر انہیں وہیں دفن کیا گیا۔

چین کی حکومت نے مسجد میں توسیع کروائی ہے۔ اب یہ اتنی وسیع ہے کہ اس میں دو ہزار نمازی بیک وقت نماز ادا کر سکتے ہیں۔ ہم نے سعد بن ابی وقاصؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ کے مزاروں پر فاتحہ پڑھی اور وہاں سے شین زن (Shen Zen) گئے جہاں ایک نیا صنعتی شہر تعمیر کیا جا رہا تھا۔ ہمارا یہ سفر چین کے شمال مغرب سے شروع ہو کر مشرق میں ہانگ کانگ آ کر ختم ہوا۔ چین کی زمینی وسعتوں کا اندازہ ہوا۔ ان کی ثقافت اور تہذیب کی وسعتیں بھی زمینی وسعتوں کے مشابہ تھیں۔

دوسرا دورہ 2006ء میں کیا جو تبت کے شہر لہاسا (Lhasa) سے شروع ہوا۔ یہ شہر سطح سمندر سے 12000 فٹ کی بلندی پر واقع ہے جسے بدھ مت کے حوالے سے مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ وہاں کی ثقافت، پرانی عمارتیں، محلات اور فضا بڑی سحر انگیز ہے۔ پہاڑوں کی پگھلتی ہوئی برف، کئی کئی دریاؤں کا پانی یہاں آ کے ملتا ہے اور یہ وہ سنگم ہے جہاں سے دریائے برہم پترا نکلتا ہے۔ 12000 فٹ بلندی کے سبب یہاں کے ہوٹلوں میں آکسیجن سے بھرے ہوئے تکیے (Pillow) ملتے ہیں کہ جسے ضرورت پڑے وہ اسے منہ سے لگا لے۔ لہاسا (Lhasa) جانے کا سب سے بڑا شوق اس ٹرین پر سفر کرنا تھا جو چینیوں نے لہاسا سے زیرنگ تک تعمیر کی ہے۔ جس کا سفر لہاسا کی 12000 فٹ سے شروع ہو کر 16300 فٹ کی بلندی تک جاتا ہے اور تقریباً 14 گھنٹوں کے سفر کے بعد زیرنگ شہر پہنچتا ہے جس کی بلندی 7000 فٹ ہے۔

ٹرین کی ہر سیٹ کے ساتھ آکسیجن کی لائن ہوتی ہے جسے ضرورت پڑنے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ریلوے لائن دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے جسے ہمارے چینی دوست ہی تعمیر کرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہمارے وفد کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس کے افتتاح کے بعد ہمارا پہلا وفد تھا جس نے اس ریل پر سفر کیا۔ جب ہم زیرنگ پہنچے تو صبح ہو چکی تھی۔ وہاں اس بلندی پر ایک وسیع تازہ پانی کی جھیل ہے جہاں طلوع ہوتے سورج کا منظر دیکھنے کے لئے ہم ریلوے

اسٹیشن سے سیدھے جھیل کے کنارے پہنچے جہاں ہوٹل والوں نے السلام علیکم سے ہمارا استقبال کیا۔ اس جھیل کی مچھلی ہماری ٹراؤٹ مچھلی جیسی مزیدار ہے۔ بڑی سحر انگیز جگہ ہے۔ مزید تفصیل آگے بیان کی گئی ہے۔

لہاسا تبت کا دارالحکومت ہے جہاں ہم نے تین دن قیام کیا اور متعدد مقامات کی سیر کی جن میں قدیم جوکھانگ ٹمپل، پوتالا پیلس اور نوربلنکا قابل ذکر ہیں۔ جوکھانگ ٹمپل کو تبت کے روحانی مرکز کی حیثیت حاصل ہے جسے 647 عیسوی میں ہان، تبتی اور نیپالی ماہرین تعمیرات نے تعمیر کیا۔ پوتالا پیلس لہاسا شہر کے قلب میں واقع ہے جو 1959ء تک چودھویں دلائی لامہ کی بھارت منتقلی تک ان کی رہائش گاہ تھی۔ آج کل یہ پیلس ملکی میوزم میں بدل چکا ہے جو معروف سیاحتی مقام ہے اور یونیسکو نے اسے عالمی ورثے کی حیثیت دی ہے۔ نوربلنکا ایک دلنشین کمپلیکس ہے جو چاروں اطراف سے پارکوں میں گھرے ایک پیلس پر مشتمل ہے اور 1780ء سے 1959ء تک آنے والے دلائی لاموں کی رہائش گاہ رہا ہے۔

چوتھے دن ہمارا ریل گاڑی کا یادگار سفر شروع ہوا۔ ہم صبح تقریباً 9 بجے روانہ ہوئے۔ ریل گاڑی مکمل طور پر ائرکنڈیشنڈ اور ٹیلیویژن، آکسیجن کٹ اور ڈائننگ کار کی سہولتوں سے آراستہ تھی جیسی 1950ء کی دہائی میں راولپنڈی سے کراچی جانے والی ہماری تیزگام ایکسپریس ہوا کرتی تھی۔ ریلوے لائن تعمیرات کی دنیا کا ایک معجزہ ہے جو بلند و بالا پہاڑوں پر زگ زیگ کی شکل اور خطرناک موڑوں پر مشتمل ہے۔ کبھی کبھی یہ ریلوے لائن وادی میں سے گذرتی ہے جہاں اس کے ساتھ ساتھ سڑک اور چمکتے ہوئے پانی کا دریا خوبصورت منظر پیش کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر یہ وادی تنگ ہو جاتی ہے لیکن عمومی طور پر کشادہ اور وسیع ہے جسے بلند پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔

پہلے دس گھنٹے تک گاڑی مسلسل اوپر چڑھتی رہتی ہے اور شام تک سولہ ہزار فٹ کی بلندی تک پہنچ جاتی ہے جہاں ریل گاڑی کچھ وقت ٹھہرتی ہے۔ یہاں مسافروں کو بلندی کا احساس اور یخ بستہ ہوا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جونہی رات ہوتی ہے گاڑی نیچے کی طرف چلنا شروع کر

دیتی ہے اور صبح جب مسافر ناشتے کے لئے اٹھتے ہیں تو گاڑی ابھی تک بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہوتی ہے اور اس وقت تک مسافر سترہ سو کلومیٹر کا سفر طے کر چکے ہوتے ہیں۔ ابتدائی کا سفر مسافر کے زیرنگ شہر پہنچنے تک جاری رہتا ہے جو صوبہ شنگھائی کا دارالحکومت ہے اور سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس شہر کی آبادی اسی لاکھ افراد پر مشتمل ہے جن میں نصف مسلمان ہیں۔ ستائیس گھنٹوں تک ہم نے دو ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ لہاسا جانے والی ریلوے لائن تین مراحل میں مکمل ہوئی ہے۔ لہاسا کی جانب آخری ایک ہزار کلومیٹر انجینئرنگ کا معجزہ ہے جسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ ریلوے لائن چین کو نیپال کی سرحد کھٹمنڈو اور کلکتہ تک ریلوے لائن تعمیر کرنے کی رغبت دلاتی ہے۔

میں نے اپنے سکول کے دنوں میں تبت کی سطح مرتفع کے بارے میں پڑھا تھا جسے دنیا کی چھت (Roof of the World) سے تشبیہ دی گئی تھی اور آج میں ستائیس گھنٹوں سے ایک پرآسائش ریل گاڑی میں اس پر سفر کرنے کا لطف اٹھا رہا تھا۔ جب ریل گاڑی سرنگوں سے گذرتی ہے تو وادیاں تنگ ہو جاتی ہیں اور جب سرنگوں سے باہر نکلتی ہے تو ایک نئی دنیا ہماری منتظر ہوتی ہے۔ علاقے میں آبادی بہت کم ہے جہاں زندگی اپنے عروج کی منتظر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس علاقے کا مستقبل بہت روشن ہے جسے چین کے ماہرین کی ہمت اور عزم مصمم نے دنیا پر آشکار کیا ہے۔ زیرنگ سے دوسرے دن روانہ ہوئے اور کئی شہروں میں قیام کرتے ہوئے بیجنگ پہنچے جہاں سیمینار میں شرکت کی۔ پورا سفر بڑا ہی سحر انگیز تھا۔ پاک چین دوستی اس عظیم تعمیری عجوبے کی طرح بلند اور ہمت و حوصلے کی اعلیٰ مثال ہے۔

مجھے دکھ اس بات کا ہے کہ جنرل مشرف کی زیادتیوں کے سبب فرینڈز کی کارکردگی محدود ہوگئی' وسائل کم ہو گئے اور ہم چینی ادارے کے ساتھ تعاون کو قائم نہ رکھ سکے۔ ہمارے چینی بھائیوں کو ہماری مجبوریوں کا اندازہ نہیں ہوگا کہ ہمیں کن مشکلات سے گذرنا پڑا ہے اور ہم ان روابط کو ختم کرنے پر کس قدر مجبور ہو گئے۔ ہمیں شرمندگی ہے۔ زندگی رہی تو انشاء اللہ ایک بار پھر ان رشتوں کو قائم کروں گا اور ایک بار پھر اس سحر انگیز سفر پر جانے کا ارادہ ہے۔ بے نظیر

بھٹو صاحبہ کے دوسرے دور حکومت میں پیپلز پارٹی والوں نے سی بی آر (CBR) کو میرے پیچھے لگا دیا' اور جب کچھ نہ ملا تو میرے ادارے "فرینڈز" پر ہاتھ ڈالا۔ ایک ایک ڈونر سے پوچھ گچھ ہوئی کہ فرینڈز کو عطیات کیوں دیے؟ کوئی خلاف قانون بات نہ ملی' لیکن میرے ڈونرز خوفزدہ ہو گئے اور وسائل کی کمی کے باعث مجھے چاروں صوبوں میں قائم اپنے دفاتر بند کرنے پڑے۔ صرف مرکزی دفتر قائم رکھا جہاں سے ادارے کا کام ماشاء اللہ جاری رہا لیکن اب ادارہ تعطل Suspended Animation میں ہے۔

اسلام آباد میں واقع جرمنی کے معروف تحقیقی ادارے ہانس سائیڈل فاؤنڈیشن (Hans Seidel Foundation) نے ہمارے ادارے کے ساتھ بہت تعاون کیا اور سیمینار اور کانفرنسیں منعقد کرانے' بیرون ممالک دوروں اور بیرون ممالک سے آنے والے دانشوروں کے اخراجات برداشت کئے۔ یہاں میں اس ادارے کے سابق ریذیڈنٹ نمائندے (Resident Representative) ڈاکٹر ہائن جی کیسلنگ (Hein G. Kiessling) کا خصوصی طور پر ذکر کرنا چاہوں گا جنہوں نے ہمارے ادارے کے ساتھ خصوصی تعاون کیا جو لائق تحسین ہے۔ انہوں نے کبھی بھی ہم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ڈالا اور ہماری فکری آزادی کبھی متاثر نہ ہوئی۔ ان کے جانے کے بعد حالات بدل گئے اور ہم نے اس ادارے کے ساتھ معاملات ختم کر لئے۔

ستمبر 1991ء میں قائم ہونے والے اس ادارے کی تحقیقی سرگرمیوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ان سرگرمیوں کا مختصر سا جائزہ پیش خدمت ہے تاکہ قارئین کو ادارے کی افادیت سے آگاہی ہو سکے۔

فرینڈز کے تحت عالمی' علاقائی اور ملکی امن و سلامتی کے موضوع پر قومی' علاقائی و بین الاقوامی سیمینار اور کانفرنسیں منعقد کرائی گئیں جن میں پاکستان کی سلامتی' جنوبی ایشیا کی صورت حال' پاکستان کے ارد گرد کی صورت حال اور وسطی ایشیاء کی مسلمان ریاستوں کے مستقبل' مسئلہ کشمیر' نئے عالمی نظام میں چین کی اہمیت جیسے اہم موضوعات پر تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔

☆چیئرمین فرینڈز کی حیثیت سے جون اور جولائی 1993ء میں ایران' متحدہ عرب امارات' اردن' ناروے'امریکہ اور برطانیہ کے دورے میں کئی معروف اداروں سے خطاب کیا۔

☆ایران کی وزارت خارجہ کے زیراہتمام' ادارہ برائے سیاسی و بین الاقوامی مطالعات - (The Institute for Political and International Studies IPIS) سے" علاقائی تعاون" کے موضوع پر خطاب کیا۔

☆اردن میں عرب تھاٹ فورم(Arab Thought Forum) سے وسطی ایشیا کی علاقائی سلامتی کے موضوع پر خطاب کیا۔

☆ناروے کے شہر اوسلو میں تحقیقی ادارہ برائے امن (Peace Research Institute) سے پاکستان کے ایٹمی پروگرام: قومی سلامتی کے ضامن" کے موضوع پر خطاب کیا۔

☆امریکہ کے (Carnegie Endowment for International Peace) اور شکاگو اور برکلئی میں واقع متعدد اداروں میں مختلف موضوعات پر خطاب کیا۔

☆ پانچ رکنی وفد کے ہمراہ 19 تا 24 دسمبر 1993 چین کا دورہ کیا اور متعدد تحقیقی اداروں سے مختلف عالمی و علاقائی موضوعات پر خطاب کیا۔

☆ سوڈان کے ادارے پاپولر عرب اینڈ اسلامک کانفرنس کی دعوت پر 2 تا 4 دسمبر 1993ء خرطوم میں منعقد ہونے والی عالمی کانفرنس سے "عالمی تصادم اور امہ کی ذمہ داریوں" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔

☆17 تا 19 جنوری 1994ء ایران کے شہر تہران میں منعقد ہونے والے" وسطی ایشیا میں ترقی کے امکانات" کے موضوع پر منعقد ہونے والے سیمینار میں فرینڈز کے نمائندے نے مقالہ پڑھا۔

☆5 تا 8 فروری 1994ء عراق کے شہر بغداد میں "اقتصادی پابندیوں کی وجہ سے

عراق کو درپیش مسائل" کے عنوان پر منعقد ہونے والے عالمی سیمپوزیم سے خطاب کیا۔

☆12 تا 15 ستمبر 1994ء فرینڈز کے نمائندے نے اقوام متحدہ کی کمیٹی برائے 1995ء این پی ٹی کانفرنس (NPT Conference) میں شرکت کی۔

☆6 تا 12 مارچ 1995ء اقوام متحدہ کے زیر اہتمام کوپن ہیگن میں منعقد ہونے والی اقوام متحدہ کی کانفرنس میں شرکت کی اور "معاشرتی ترقی: بنیادی اقتصادی حقوق" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔

☆17 اپریل سے 12 مئی 1995ء نیو یارک میں" این پی ٹی: جائزہ اور توسیع" کے عنوان سے منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی۔

☆ واشنگٹن کے ادارے ہنری ایل سٹمسن سنٹر (Henry L. Stimson Centre) کی دعوت پر 11 جولائی 1995 کو خطاب کیا۔ اس کانفرنس میں متعدد نامور عالمی شخصیات نے شرکت کی۔

☆27 تا 28 اگست 1995ء کو ایران کے شہر تہران میں منعقد ہونے والے سیمینار میں فرینڈز کے نمائندے نے "بوسنیا ہرزیگووینا کے مستقبل" کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔

☆27 ستمبر سے 14 اکتوبر 1995ء تک ایران کے ڈپٹی وزیر خارجہ جناب عباس مالکی کی دعوت پر فرینڈز کے وفد کے ہمراہ ایران کا دورہ کیا اور سیمینار سے خطاب کیا۔ اس کے علاوہ امام حسین یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلباء سے خطاب کیا۔

☆ایک پانچ رکنی وفد نے 5 سے 13 مئی 1996ء تک چین کا دورہ کیا۔ اس دورے میں متعدد اداروں کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے سیمینار اور کانفرنسوں سے خطاب کیا۔

☆ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن نے 20 سے 23 مئی 1999ء کو" جنوبی ایشیاء میں بڑھتی ہوئی ایٹمی سرگرمیاں' مسائل اور ان کا حل" کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کی جس کا اہتمام اقوام متحدہ کے وینس میں قائم دفاتر' لینڈ و نیٹ ورک سنٹر وولٹا اور اطالوی وزارت خارجہ نے کیا تھا۔

☆ وائس چیئرمین فصاحت حسین سید نے 25 تا 27 مئی 1999ء کو" جنوبی ایشیاء کی

عالمی حیثیت اور سکیورٹی" کے موضوع پر ایک علاقائی ورکشاپ میں شرکت کی جس کا اہتمام بنگلہ دیش انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل اینڈ اسٹریٹیجیکل اسٹڈیز' فریڈرک نومن سٹیفٹنگ نیو دہلی اور فورڈ فاؤنڈیشن نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔

☆ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن نے 22 تا 23 جون 1999ء کو آئی پی آئی ایس تہران کے زیر اہتمام وسطی ایشیا' کاکیشیش (کوہ کاف) اور بحر کیپین ۔امکانات اور رکاوٹیں" کے موضوع پر ساتویں سالانہ سیمینار میں شرکت کی۔

☆24 تا 25 فروری 1997ء کو فرینڈز کے وائس چیئرمین فصاحت حسین سید اور سیکرٹری جنرل ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن نے ایران میں "او آئی سی کے مستقبل" کے موضوع پر منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی۔

☆6 تا 14 ستمبر 1998ء کو ایک پانچ رکنی وفد کے ساتھ چین کا دورہ کیا اور سیمینار میں شرکت کی۔

☆5 تا 14 اکتوبر 1999ء کو ایک تین رکنی وفد کے ساتھ جرمنی کا دورہ کیا اور سیمینار سے خطاب کے علاوہ برلن میں رہنے والے پاکستانیوں سے بھی اہم قومی امور پر خطاب کیا۔

☆22 تا 28 جنوری 2000ء کو ایران کے ادارے آئی پی آئی ایس کی دعوت پر ایران کا دورہ کیا اور "اکیسویں صدی میں خلیج فارس کی اہمیت" کے عنوان سے منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی۔

☆11 تا 20 اکتوبر 2000ء کو ایک پانچ رکنی وفد کے ہمراہ چین کے معروف تحقیقی ادارے Chinese Peoples, Association for Peace and Disarmament -CPAPD) کی دعوت پر چین کا دورہ کیا اور سیمینار سے خطاب کیا۔

☆21 سے 22 دسمبر 2002ء کو ایران میں "افغانستان کے حوالے سے دوسری عالمی کانفرنس" منعقد ہوئی جس میں "افغانستان کی تباہی اور پاکستان و ایران پر اس کے اثرات" کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔

مندرجہ بالا سرگرمیوں کے علاوہ "فرینڈز" نے قومی' علاقائی اور عالمی مسائل پر 90 سے زائد سیمینار' کانفرنسیں اور مذاکرات کا اہتمام کیا جو راولپنڈی' اسلام آباد' لاہور' پشاور' بہاولپور' کوئٹہ اور کراچی میں منعقد ہوئے۔ قومی اور عالمی موضوعات پر 40 سے زائد کتابیں شائع کیں۔ "نیشنل ڈیویلپمنٹ اینڈ سکیورٹی" کے نام سے ایک ماہنامہ شائع ہوتا تھا جس میں ملکی اور غیر ملکی ممتاز قلم کاروں اور دانشوروں کے پرمغز مقالے شائع ہوتے تھے۔

اس سب کچھ سے ثابت ہوتا ہے کہ "فرینڈز" ایک "بین الاقوامی تھنک ٹینک" کی حیثیت اختیار کر چکی تھی جسے اقوام متحدہ سمیت بین الاقوامی تنظیمیں تسلیم کرتی تھیں۔ پوری دنیا کی حکومتی اور غیر حکومتی تنظیمیں مشاورت اور رہنمائی کے لئے اس سے رابطہ کرتی تھیں اور ملکی' غیر ملکی مسائل پر گفت وشنید کے لئے اس کے ارکان کو بار بار بلاتی تھیں۔ مختصراً یہ کہ "فرینڈز" پوری دنیا میں ایک غیر حکومتی سفیر کی حیثیت سے کام کر رہی تھی اور پاکستان کا مثبت تاثر ابھار رہی تھی۔

2001ء میں جب جنرل مشرف نے افغانستان کی جنگ میں امریکہ کا ساتھ دینے کا بدترین فیصلہ کیا تو میں نے بھری محفل میں انہیں چیلنج کیا جس کی وجہ سے انہوں نے بھی میرے خلاف اقدامات کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور میرے ریسرچ ایسوسی ایٹس (Research Associates)' کو ڈرا دھمکا کر اور زیادہ تنخواہوں کا لالچ دے کر فرینڈز چھوڑنے پر مجبور کیا۔ یہ مختلف یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہونے والے نوجوان طلبہ تھے جنہیں ہم نے ریسرچ کے مختلف منصوبوں پر لگایا ہوا تھا۔ وہ سب بڑی بڑی تنخواہوں کے لالچ میں آ کے میرے ادارے کو چھوڑ گئے۔ فرینڈز کا سہ ماہی تحقیقی جریدہ "National Development and Security" نکلتا تھا اور اس کی کاپیاں پاکستان بھر کے تحقیقی اداروں کے علاوہ امریکی لائبریریوں کو بھی بھیجی جاتی تھیں' وہ بھی بند ہو گیا۔ چند بین الاقوامی این جی اوز بھی ہمیں مالی امداد دینے کو تیار تھیں لیکن میں اس کے عوض آزادی تحریر و تقریر پر سودے بازی نہیں کر سکتا تھا۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم چڑھتے سورج کی پرستش کرتے ہیں اور ہمارے حکمران اس روش سے ہٹ کر کوئی بات سننا گوارا نہیں کرتے۔ میرے ادارے کے پلیٹ فارم سے حکومتوں کی اچھائیوں اور برائیوں پر کھل کر تبصرہ ہوتا تھا اور بہتری کے لئے تجاویز پیش کی جاتی تھیں لیکن ان تجاویز کو ہمارے حکمران دشمنی سمجھتے رہے۔ اسی لئے سبھی نے مجھ پر پابندیاں لگادیں۔ اخباروں کو ہدایت تھی کہ میرے مضامین کی اشاعت سے پہلے منظوری لی جائے۔ قومی اداروں سے مجھے خطاب کرنے کی دعوت آتی تھی لیکن اس پر بھی پابندی لگادی گئی اور 2001ء میں جنرل مشرف سے اختلافات کے بعد مجھ سے کھلی دشمنی شروع ہوگئی۔ مجبورا ادارے کو معطل (Suspended Animation) رکھنا پڑا ہے۔ بس اکیلا قومی معاملات پر تبصرے کرتا رہتا ہوں جو باوجود پابندی کے میرے مضامین قومی اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔

سیاسی میدان میں، میں نے جو تلخ تجربات حاصل کئے، مختصرا بیان کرنا چاہوں گا۔ 1996ء میں، میں نے سیاست میں آنے کا فیصلہ کیا اور عوامی قیادت پارٹی کے نام سے اپنی الگ جماعت بنائی، چاروں صوبوں میں دفاتر قائم کئے۔ عوام کی جانب سے بہت اچھی پذیرائی ملی۔ سب سے پہلے میں نے پاکستان مسلم لیگ (جونیجو) سے رابطہ کیا۔ انہوں نے بڑے تپاک سے خوش آمدید کہا۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ایک اتحاد وجود میں آیا۔ پھر میں نے چاروں صوبوں کا دورہ کیا اور پرانے لیگیوں سے ملاقاتیں کیں، سب نے میرے سیاست میں آنے کے فیصلے کو بہت سراہا۔ واپسی پر میں نے مسلم لیگ (جونیجو) کے سیکرٹری جنرل سے کہا کہ ایک میٹنگ بلائیں جس میں، میں بریفنگ دوں گا کہ کس طرح پرانے لیگیوں کو جماعت میں واپس لایا جاسکتا ہے لیکن دن اور ہفتے گذرتے گئے یہ میٹنگ نہ بلائی جاسکی۔

میں نے جب زور دیا تو اسلام آباد میں میٹنگ بلائی گئی لیکن اس میٹنگ کا یک نکاتی ایجنڈا تھا کہ صوبہ سرحد کے سابقہ وزیر اعلی جنہوں نے جماعت میں ہوتے ہوئے حزب اختلاف سے روابط قائم کر لئے تھے انہیں کیسے منایا جائے۔ میں نے کہا کہ جماعت کے آئین کے تحت پہلے انہیں شوکاز نوٹس جاری کیا جائے اور اگر اس کا جواب نہیں آتا تو انہیں

پارٹی سے نکال دیا جائے لیکن وہ اس سے متفق نہ ہوئے اور کہا کہ ہم انہیں منالیں گے۔ اس کے بعد جب میں نے کہا کہ میں اپنے دورے سے متعلق بریفنگ دینا چاہتا ہوں تو انہوں نے جواب دیا کہ اس کی ضرورت نہیں کیونکہ ہم نے آپ کو ایسی کوئی ذمہ داری نہیں دی تھی۔ اس کے بعد میں واپس آ گیا اور اس اتحاد سے علیحدگی اختیار کرلی۔ یہ سیاست کے میدان میں میرا پہلا تجربہ تھا۔

دوسرا تجربہ: میں نے صوبہ سندھ میں اپنی سیاسی جدوجہد کو آگے بڑھایا، لوگوں سے رابطہ کیا تو وہاں سے بھی بڑی پذیرائی ملی۔ ایم کیو ایم کے رہنما عظیم طارق سے ملاقات ہوئی، انہوں نے میری جماعت کے ساتھ کام کرنے کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ ایک الگ سیاسی گروپ بنارہے ہیں اور جب یہ کام ہوجائے گا تو پھر رابطہ کریں گے۔ تین ماہ بعد دوبارہ وہ میرے پاس آئے اور کہا کہ الگ سیاسی گروپ تشکیل دیا جاچکا ہے اور اگلے ہفتے اس کا اجلاس ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ ایسا مت کریں کیونکہ اس طرح آپ کی جان کو خطرہ ہوگا۔ آپ خاموشی سے کام کرتے رہیں لیکن وہ بضد رہے۔

تیسرا تجربہ: 1996ء میں جب صدر فاروق احمد خان لغاری نے بے نظیر بھٹو کی حکومت برخواست کردی تو میں بے نظیر بھٹو کے پاس گیا اور ان کی جماعت کے ساتھ مل کر کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ انتخابات سے پہلے محترمہ سے میری ملاقات میں ہماری جماعتوں کے درمیان سیٹ ایڈجسٹمنٹ کا معاملہ طے پا گیا۔ اس وقت میری جماعت کے قومی اسمبلی کے سات (7) امیدوار اور صوبائی اسمبلیوں کے انیس (19) امیدوار تھے لیکن سیٹ ایڈجسٹمنٹ کے بعد میرے پاس قومی اسمبلی کی چار سیٹیں رہ گئیں اور صوبائی اسمبلیوں کی نو (9) سیٹیں۔

جب انتخابات کی مہم شروع ہوئی تو ہماری جماعت کے قومی وصوبائی اسمبلیوں کے امیدواروں نے شکایت کی کہ ان کے مقابلے میں پیپلز پارٹی کے امیدوار کھڑے ہیں اور ہمارے حق میں دستبردار نہیں ہورہے۔ میں نے محترمہ سے اس امر کی شکایت کی تو ان کا بڑا مختصر سا جواب تھا کہ "جنرل صاحب، میرے لوگ دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہیں۔" اس طرح

سے میری جماعت کو پارلیمانی جماعت بننے کا موقع نہ مل سکا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے خلاف سازش تیار ہو چکی تھی اور ائر مارشل اصغر خان میرے خلاف سپریم کورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کرنے والے تھے۔

اس واقعے کے بعد پیپلز پارٹی نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے سیاست میں شامل ہو کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے جبکہ مجھے فوج سے ریٹائر ہوئے چار سال ہو چکے تھے۔ حکومت نے میری مراعات واپس لے لیں۔ میرے پاس وزارت دفاع کا وہ خط موجود ہے جس کے تحت میری مراعات واپس لی گئیں۔ یہ خط بڑا مضحکہ خیز ہے جس میں وجہ بتائی گئی ہے کہ میرے سیاست میں آنے سے میرے باورچی' بیٹ مین اور ڈرائیور کا ڈسپلن خراب ہونے کا خدشہ تھا اس لئے یہ مراعات واپس لے لی گئی ہیں۔

1996ء تک مجھے اپنے خلاف تیار کی جانے والی سازش کا علم نہیں تھا۔ جب میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر پاکستان عوامی اتحاد (PAI) بنایا اور آٹھ نکاتی ایجنڈے کے ساتھ تحریک چلائی جس کا سب سے بڑا جلسہ 14 اگست 1998ء کو نشتر پارک کراچی میں منعقد ہوا۔ دوسرے دن جب ہمارا اجلاس ہوا تو تمام باتوں کو بھول کر نوابزادہ نصراللہ خان اور محترمہ نے کہنا شروع کیا:

''اگر PML(N) کی یہ حکومت باقی رہی تو ملک تباہ ہو جائے گا۔ اب ہمارا ایک نکاتی ایجنڈا ہے: ''نواز شریف حکومت ہٹاؤ۔''

باوجود تمام کوشش کے میں انہیں اس موقف سے دستبردار کرانے میں ناکام رہا اور میں اس اتحاد سے الگ ہو گیا۔ یہ میرا چوتھا تجربہ تھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی نے گرینڈ ڈیموکریٹک الائنس (GDA) بنایا جس میں عوامی نیشنل پارٹی' ایم کیو ایم' عمران خان کی جماعت پاکستان تحریک انصاف اور نوابزادہ نصراللہ صاحب کی پاکستان جمہوری پارٹی (پی ڈی پی) اور دیگر جماعتیں شامل تھیں۔ اس اتحاد کے قیام کا اعلان کرنے سے پہلے جناب اجمل خٹک کی سربراہی میں جی ڈی اے میں شامل جماعتوں

کے نمائندے مجھ سے ملاقات کرنے میرے گھر آئے اور اپنا موقف کچھ یوں بیان کیا:

''ہم نے یہ اتحاد بنایا ہے اور چند دنوں بعد اس کا اعلان کریں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بھی اس اتحاد میں شامل ہو جائیں اور حکومت کے خلاف پرزور تحریک چلائیں۔''

میں نے سوال کیا: ''اس تحریک کے نتیجے میں آپ کو کیا حاصل ہوگا۔''

انہوں نے جواب دیا: ''ہمیں اوپر سے حکم آیا ہے' تحریک چلاؤ' فوج مداخلت کرے گی' انتخابات کرائے گی اور ہم ہی انتخابات جیتیں گے اور حکومت ہماری ہوگی۔''

میں نے کہا:

''اوپر سے پیغام آنا تو چودہ سو سال پہلے بند ہو چکا ہے' تو یہ پیغام کہاں سے آیا ہے؟''

اجمل خٹک صاحب نے وضاحت کر دی۔

میں نے کہا:

''دیکھئے آپ لوگ غلط بندے کے پاس آئے ہیں۔ اقتدار تو اللہ نے 1988ء میں میرے ہاتھوں میں دے دیا تھا جسے میں نے اس کے حوالے کر دیا جس کی وہ امانت تھی۔ آج آپ مجھ سے امید رکھتے ہیں کہ میں اصغر خان کی طرح آرمی چیف کو ترغیب دوں کہ وہ اقتدار سنبھال لیں۔ اور اگر جنرل مشرف اقتدار سنبھال بھی لیں تو وہ کبھی بھی انتخابات نہیں کرائیں گے جیسے کہ جنرل ضیاء نے کیا تھا' اور آپ انتظار کرتے رہ جائیں گے۔''

جی ڈی اے گروپ ناامید ہو کر واپس چلا گیا۔ ایک سازش کے تحت 12 اکتوبر 1999ء کو جنرل پرویز مشرف نے نواز شریف حکومت کو فارغ کر کے اقتدار سنبھال لیا اور جی ڈی اے والوں نے ان کا بھرپور ساتھ دیا لیکن پھر 90 دنوں میں انتخابات نہ کرائے گئے۔ مشرف نے اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط کر لی اور وہ امریکہ کی نظروں میں پسندیدہ حکمران بن گئے۔ پیپلز پارٹی کو کچھ ملا اور نہ ہی عمران خان کو وہ کچھ ملا' جس کا وعدہ کیا گیا تھا۔

2001ء میں 9/11 کا واقعہ ہوا۔ اس واقعے کو ابھی چند گھنٹے بھی نہیں گذرے تھے کہ

امریکی صدر نے اس کا الزام افغانستان کے سر تھوپ دیا اور فرمایا کہ اس کی سازش اسامہ بن لادن نے تیار کی تھی۔ جدید تاریخ کا یہ بدترین سانحہ ہے کہ جمہوریت اور انصاف کے علمبردار ملک نے بغیر تحقیقات کے ایک کمزور ملک پر الزام لگایا اور پھر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دی۔ اسلامی ممالک اس بربریت پر صرف بغلیں جھانکتے رہ گئے۔ کوئی یہ مطالبہ نہ کر سکا کہ اس الزام کا کوئی ثبوت تو مہیا کریں۔ امریکیوں نے طالبان سے مطالبہ کیا کہ وہ اسامہ بن لادن کو امریکہ کے حوالے کر دیں لیکن طالبان نے یہ کہہ کر انکار کر دیا:

''ان کی روایت ہے کہ وہ اپنے مہمان کے ساتھ دھوکہ نہیں کرتے۔ بے شک وہ انہیں سعودی عرب کے حوالے کر دیں گے۔''

امریکہ بضد تھا کہ نہیں امریکہ کے حوالے کیا جائے جو ممکن نہ ہو سکا۔ جب طالبان بہت مجبور ہو گئے تو انہوں نے ایک جرگہ منعقد کیا جس میں یہ فیصلہ کیا کہ اسامہ بن لادن کا شکریہ ادا کیا جائے کہ ''روسی سامراج کے خلاف جدوجہد میں انہوں نے ہمارا ساتھ دیا لیکن اب ان کے لئے اسامہ بن لادن کی حفاظت ممکن نہیں اس لئے اب وہ اپنی مرضی سے جہاں چاہیں چلے جائیں۔'' کچھ دنوں بعد اسامہ سوڈان چلے گئے۔ ادھر امریکہ نے افغانستان پر حملے کا فیصلہ کر لیا جو پاکستان کی مدد کے بغیر بہت مشکل تھا۔

امریکہ نے مشرف کے سامنے امریکہ کی حمایت کرنے کے لئے سات شرائط رکھیں اور ذرا دھمکا کے ساتوں شرائط منوا لیں۔ مشرف نے افغانستان کے خلاف جنگ میں بھرپور ساتھ دینے کا وعدہ کر لیا جبکہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کے لئے سوچنا اور غور کرنا ضروری تھا لیکن وہ مغلوب ہو گئے اور گھٹنے ٹیک دیئے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد مشرف نے ملک کے سیاستدانوں' ٹیکنوکریٹس' بیوروکریٹس اور میڈیا والوں کو 50-40 کے گروپ میں بلانا شروع کیا اور انہیں اپنی دانشمندی کے اسباب بتائے کہ ایسا فیصلہ کیوں کیا ہے۔ اسی طرح تیسرے گروپ میں مجھے بھی بلایا۔ 23 ستمبر کا دن تھا اور تقریباً تین گھنٹوں تک مشرف اپنی منطق بیان کرتے رہے۔

میں تنگ آ گیا تو عرض کی:

''جناب صدر' مجھے بھی کچھ بولنے کا موقع دیں تو آپ کا مشکور ہوں گا۔''

وہ بولے: ''جی ہاں فرمایئے''

میں نے عرض کی:

''آپ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بدترین فیصلہ ہے جس کی کوئی منطق ہے نہ جواز اور نہ کسی قانون کے تحت اسے درست کہا جا سکتا ہے۔ اس فیصلے کے نتائج پاکستان کی سلامتی کے لیے بہت مہلک ثابت ہوں گے۔ ایک برادر اسلامی ملک کے خلاف غیروں کے ساتھ مل کر جنگ میں شامل ہو جانا بے غیرتی ہے۔''

''آپ نے فیصلہ کر لیا ہے تو ضروری ہے کہ متعلقہ لوگوں سے مشورہ کر کے ایک ریڈ لائن (Red-Line) مقرر کریں کہ اس سے آگے ہم امریکہ کی حمایت میں نہیں جا سکتے۔''

''مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہاں موجود آپ تمام حضرات کی یہ سوچ ہے کہ طالبان ہار جائیں گے' یہ غلط ہے۔ طالبان جیتیں گے' امریکہ اور اس کے اتحادی ہاریں گے' جس طرح سوویت یونین ہارا تھا' لوگ ہنس پڑے۔''

''یہ ایک طویل جنگ ہوگی۔ امریکہ' افغانستان پر قبضہ کرنے کے بعد ہماری طرف پلٹے گا اور ان علاقوں کو ہدف بنائے گا جو طالبان کا سپورٹ بیس (Support Base) رہے ہیں۔ اس طرح یہ جنگ ہم پر پلٹ دی جائے گی۔ ہمیں ابھی سے اس مشکل کام کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاری کر لینی چاہیے۔''

''آپ کا یہ فیصلہ دراصل ان ہزاروں شہیدوں کے خون پر سمجھوتہ ہے جنہوں نے افغانستان کی آزادی کے لئے جانیں دی ہیں۔ جو شخص شہیدوں کے خون پر سمجھوتہ کرتا ہے' اللہ اسے معاف نہیں کرتا۔''

جنرل مشرف نے کچھ بولنا چاہا مگر ان کی زبان ان کا ساتھ نہ دے سکی۔ کانفرنس ختم ہو گئی اور اس کے بعد ان کا عتاب مجھ پر نازل ہوا لیکن بہت کچھ کرنے کے باوجود بھی میرا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ میں حق پر تھا اور حق نے مجھے محفوظ رکھا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ ملک

کے جید سیاستدانوں' علماء' دانشوروں' سفارتکاروں اور بیوروکریٹس میں سے کسی نے بھی اس فیصلے کے خلاف آواز نہیں اٹھائی' ایک لفظ بھی نہ بولے' وہ چڑھتے سورج کی پرستش کرتے رہے۔ یہی ہمارا قومی المیہ ہے۔

جنرل مشرف نے امریکہ کی ساتوں شرائط مان لی تھیں۔ عالمی میڈیا کے مطابق 2001ء میں رونما ہونے والے سانحہ نائن الیون کے بعد جب امریکہ نے افغانستان پر لشکر کشی کا فیصلہ کیا تو پاکستان کے صدر جنرل پرویز مشرف نے بش انتظامیہ کو طالبان کے ساتھ بات چیت پر آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکامی کے بعد انہوں نے امریکہ کی ساتوں شرائط "غیر مشروط" طور پر تسلیم کرلیں۔ وہ ساتوں شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

۱: القائدہ کو پاکستانی سرحدوں پر روکا جائے گا۔
۲: امریکہ کو افغانستان میں آپریشن کرنے کے لیے پاکستان میں کسی بھی جگہ آمدورفت کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔
۳: امریکہ کو پاکستان کی زمینی اور سمندری حدود تک رسائی دی جائے گی۔
۴: معلومات کی فراہمی یقینی بنائی جائے گی
۵: دہشت گرد حملوں کی کھلے عام مذمت کرنا ہوگی
۶: طالبان کو افرادی قوت اور رسد کی فراہمی بند کی جائے گی
۷: طالبان کے ساتھ سفارتی تعلقات منقطع کئے جائیں گے اور اسامہ بن لادن کو تباہ کرنے کے لئے امریکہ کی مدد کی جائے گی۔

افغانستان کے خلاف امریکہ کی جنگ میں شمولیت ہمارے لئے ایک قومی سانحہ تھا۔ جنگ شروع ہوئی اور امریکہ نے ظلم و بربریت (Shock and Awe) کی بدترین مثال پیش کر کے مہذب دنیا کا اصل چہرہ دکھا دیا۔ طالبان پیچھے ہٹ گئے اور کوہ و دمن کی پناہ گاہوں میں چھپ گئے' ہار نہیں مانی' بدلہ لینے کی تیاریاں شروع کر دیں' دو سال گذر گئے۔ اسی دوران 2003ء میں جلال الدین حقانی پاکستان تشریف لائے۔ جنرل حمید گل کے گھر

عشائیے پر ان سے میری ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا:

"دشمن تو پورے ملک پر قابض ہے' اب آپ کا لائحہ عمل کیا ہے؟

انہوں نے جواب دیا:

"ہم نے مجاہدین کے ساتھ اپنے روابط مضبوط کر لئے ہیں اور بہت جلد دونوں مل کر جنگ کا آغاز کریں گے۔"

میں نے کہا: "جو تباہی افغانستان نے دیکھی ہے' پہلے سوویت یونین کے خلاف جہاد' اس کے بعد خانہ جنگی اور پھر امریکہ کی دہشت گردی۔ آپ کی ایک نسل تباہ ہو چکی ہے۔ ایک اور جنگ کا آپ نے فیصلہ کیا ہے۔ جنگ کے علاوہ بھی ایک راستہ ہے جس پر چل کر آپ آزادی حاصل کر سکتے ہیں' وہ اس طرح کہ امریکہ اپنے منصوبے کے تحت افغانستان میں جمہوری نظام قائم کرنا چاہتا ہے اور اگر آپ اس نظام کا حصہ بن جائیں تو اکثریت میں ہوتے ہوئے حکومت آپ کی ہوگی' فیصلے آپ کے ہوں گے اور آپ خود اپنی آزادی کے فیصلے کر سکیں گے۔"

وہ خاموش رہے اور میں انہیں دلائل دیتا رہا' لیکن انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اتنا بڑا فیصلہ کرنے کا انہیں اختیار نہیں ہے۔ میں نے کہا جب آپ واپس جائیں تو ملا عمر کو میرا اسلام دیں اور میرا یہ پیغام بھی۔ وہ جو کہیں گے مجھے بتایئے گا۔

دو ماہ بعد ملا عمر کا جواب آیا جسے سمجھنے سے "ملا عمر کی تصادم کی منطق" (Logic of Conflict) کی وضاحت ہوتی ہے اور ایک حوصلہ مند قوم کا قومی اقدار کے تحفظ کے لیے قربانی کا جذبہ بھی نمایاں ہوتا ہے۔ ان کا جواب تھا:

☆ "ہماری قومی روایات قابض طاقتوں کے ایجنڈے پر عمل کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔
☆ "ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک کی مکمل آزادی تک جنگ جاری رکھیں گے اور انشاء اللہ فتح یاب ہوں گے۔ ہم پر عزم ہیں کیونکہ اللہ تعالی کا وعدہ ہے کہ "اگر تم ثابت قدم رہے

تو تمہارے دشمن پیٹھ پھیر پھیر کر بھاگ جائیں گے۔"

- "اب ہم امریکہ یا پاکستان کے دھوکے میں نہیں آئیں گے' جیسا کہ انہوں نے 1989ء میں روس کی پسپائی کے بعد ہمیں دھوکہ دیا تھا۔"
- "افغانستان میں قیام امن یقینی بنانے کے لئے ہم شمالی اتحاد سے پرامن تعلقات قائم کریں گے جو ہمارے تمام پڑوسیوں اور دیگر ممالک کے لئے قابل قبول ہوگا۔"
- "اس جنگ میں پاکستان ہمارے دشمنوں کا اتحادی اور شراکت دار ہے لیکن اس کے باوجود ہم پاکستان کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے کیونکہ ہماری قومی سلامتی کے تقاضے اور منزل مشترک ہیں۔"

ملا عمر کے یہ الفاظ 'افغانستان کے تصادم کی منطق' اور افغان عوام کی اپنے ملک کی آزادی اور قومی اقتدار کی پاسبانی کی خاطر دی جانے والی لازوال قربانیوں کی واضح تشریح ہیں۔ افغانیوں کی لازوال قربانیوں اور کامیاب جدوجہد آزادی نے خطے کے تذویراتی نظام کو بدل کے رکھ دیا ہے اور اب بیرونی جارحیت کے خلاف روس' چین' پاکستان' ایران اور افغانستان کے درمیان ابھرتا ہوا اتحاد حقیقت کا روپ دھار رہا ہے۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ افغانستان اور پورے خطے میں قیام امن کے عظیم مقصد کے لیے ماضی کی ناکام پالیسیاں ترک کر کے نئی حقیقت کی جانب اپنے سفر کا آغاز کرے جو ایک بڑی کامیابی اور روشن مستقبل کی ضمانت بن سکتا ہے۔

"افغانستان اور پاکستان کی سلامتی کے تقاضے اور منزل مشترک ہیں" ملا عمر کے ان الفاظ کی وضاحت ضروری ہے۔ افغانستان کی مثال تاریخی نوعیت کی ہے جس نے موجودہ دور کی عالمی طاقتوں کا ہمت و جوانمردی سے مقابلہ کیا ہے۔ اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ وہاں پختون اکثریت کے ساتھ ساتھ دوسری اقلیتیں بھی باوقار زندگی گذار رہی ہیں۔ اس کے باوجود کہ امریکہ نے سازش کر کے ان کے درمیان خانہ جنگی کرائی' وہاں اس وقت چھتیس (36) صوبے ہیں لیکن اکثریت اور اقلیت کی اپنی اپنی پہچان میں کوئی فرق نہیں آیا

ہے تو کیا وجہ ہے کہ پاکستان جو چار صوبوں کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے وہاں بھی انتظامی اور سیاسی ضرورت کے تحت چوبیس (24) صوبے بنا دیے جائیں تاکہ ہماری سیاسی بساط جو ناہموار ہے' ہموار ہو جائے اور سیاسی نظام مستحکم ہو سکے۔ ایک موقع تھا کہ ہم فاٹا کو الگ صوبہ بنا دیتے لیکن یہ موقع بھی ضائع کر دیا گیا ہے جس کے منفی نتائج سامنے آئیں گے۔

پچھلی چار دہائیوں میں افغان قوم نے قومی مدافعت' ایثار اور ہمت کی بے مثال روایت قائم کی ہے۔ اس عرصے میں انہوں نے دنیا کی دو سپر پاور اور یورپی یونین کو شکست دی ہے اور آج دنیا کی اکلوتی سپر پاور اس کے سامنے مجبوری اور بے بسی کی تصویر بنے امن کی بھیک مانگ رہی ہے جب کہ طالبان کا مطالبہ ہے کہ" جب تک افغانستان کی سرزمین سے امریکہ کے ناپاک قدم نکل نہیں جاتے بات آگے نہیں بڑھے گی۔" حق کی بات یہی ہے اور جب تک ان کا یہ مطالبہ پورا نہیں ہوگا' امریکہ اس ہاری ہوئی جنگ کا کفارہ ادا کرتا رہے گا۔

باب نہم:

ہماری تاریخ کے اہم باب

جامعہ حفصہ میں خون کی ہولی:

لال مسجد پر حملہ ہماری تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ اسلام آباد میں لال مسجد کے ساتھ جامعہ حفصہ میں بچیوں کی دینی درسگاہ تھی۔ اسی طرح اور بھی درسگاہیں تھیں جنہیں غیر آئینی کہہ کر سی ڈی اے انتظامیہ نے مسمار کر دیا تھا۔ جامعہ حفصہ کی بچیوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں متبادل جگہ دی جائے جہاں وہ اپنی مسجد اور درسگاہ دوبارہ تعمیر کر سکیں۔ اس بات پر مذاکرات ہوئے لیکن سازش کے تحت ناکام رہے اور خبر پھیلا دی گئی کہ مسجد کے اندر ڈنڈا بردار لڑکیوں کے ساتھ ہتھیار بند دہشت گرد بھی موجود ہیں جنہیں کنٹرول کرنے کے لئے فوجی کارروائی کی ضرورت ہے۔ اگر ان کا دانہ پانی بند کر دیا جاتا تو چند دنوں میں یہ لڑکیاں خود ہی اپنے ڈنڈے حکومت کے حوالے کر دیتیں لیکن مشرف نے ان کے خلاف بھرپور فوجی کارروائی کا حکم دیا۔ بھرپور طاقت کا استعمال کیا گیا' متعدد بچیاں ہلاک ہوئیں اور لال مسجد ''فتح'' کر لی گئی۔

☆ اس واقعے کے بعد فوج کو وزیرستان، باجوڑ اور سوات میں مزاحمتی قوتوں کے خلاف صف آرا کر دیا گیا۔ اس بات کا عین امکان ہے کہ اس آپریشن کو بلوچستان تک پھیلا دیا جائے۔ امریکہ کی طرف سے پاکستان پر دباؤ ہے کہ وہ اس آپریشن کو کسی بھی صورت ملتوی نہ کرے۔

☆ پاکستان میں کام کرنے والے چینی کارکنوں پر بھی حملے کیے گئے۔ کچھ مارے بھی گئے جس کے نتیجے میں وہ پاکستان چھوڑ کر جا رہے تھے۔ (یہ صورت حال اب بہتر ہوئی ہے)

☆ دنیا کو مسجد میں موجود طلبہ کے خون آلود چہروں کی تصویریں دکھائی گئیں اور انہیں دہشت گرد ظاہر کیا گیا۔ ان کے ساتھ ہتھیاروں اور گولیوں کی تصاویر دکھائی گئیں اور کہا

گیا کہ یہ ان سے برآمد ہوئے تھے۔ امریکہ اور برطانیہ نے پاک فوج کی ''کارکردگی'' کی تعریف کی۔ ہماری کچھ سیاسی جماعتوں مثلاً پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم نے بھی جامعہ حفصہ کو ''فتح'' کرنے کی تعریف کی۔

☆ انسانی حقوق کی حمایت کرنے کی نام نہاد دعویدار تنظیمیں خون کی اس ہولی پر خاموش تماشائی بنی رہیں۔ معصوم طالبات کے خون بہانے پر ان کی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں سنا گیا لیکن آنٹی شمیم کی گرفتاری پر انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا جس سے ان کا اصل چہرہ صاف دکھائی دیتا ہے۔

☆ حکومت نے اپنی دانست میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے اور وہ عوام سے متقاضی ہے کہ وہ انتہا پسندوں کے خلاف فوجی اقدامات کی حمایت کریں جب کہ پاکستانی عوام کے ذہنوں میں ایسا کوئی تضاد نہیں ہے۔

جامعہ حفصہ اور لال مسجد یتیم اور محروم بچوں کی جائے پناہ تھی۔ وہ معاشرے کے پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان اداروں نے انہیں پناہ دی اور امید کی کرن دکھائی ان میں کوئی بچی بھی مالدار طبقے سے متعلق نہیں تھی۔ وہ سب غریب لوگ تھے جن کا خون ارزاں سمجھ کر بے دردی سے بہایا گیا۔ ان میں سے ایک طالبہ نے جو 4 جولائی (امریکہ کا یوم آزادی) کو مسجد سے باہر آئی۔ باقی طالبات کے بارے میں بتایا:

> ''زیادہ تر طالبات وہ تھیں جن کے والدین اور قریبی رشتہ دار زلزلوں میں شہید ہو گئے تھے۔ کوئی ان کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں تھا۔ جامعہ حفصہ جیسے اداروں نے ان کا مستقبل سنوارا۔ افسوس، اس قتل عام میں زیادہ تر وہی بچیاں شہید ہو گئیں۔ ہم 4 جولائی کو باہر آئیں تو پندرہ سو بچیاں اندر تھیں جو باہر نہیں نکل سکیں۔ کسی کو پتہ نہیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا اور اگر وہ شہید کر دی گئیں تو ان کی میتیں کہاں ہیں۔''

میں اسی کرب میں مبتلا تھا کہ امیر حمزہ صاحب کا مضمون میری نظر سے گزرا۔ وہ لکھتے ہیں:

"میں آپ لوگوں کو اللہ کے رسول ﷺ کے ایک کمانڈر کا کردار بتاؤں:
حضور نبی کریم ﷺ نے احد کے میدان میں جنگ شروع ہونے سے قبل تلوار لہرائی اور فرمایا:

"کون ہے جو اس کا حق ادا کرے گا۔" بالآخر یہ تلوار حضرت ابودجانہؓ کو مل گئی۔
حضرت زبیر کہتے ہیں' میں نے جنگ کے اختتام پر حضرت ابودجانہ سے پوچھا تم مشرکوں کی صفیں چیرتے ہوئے جارہے تھے تو ایک جوان پر تم نے تلوار اٹھائی اور پھر کیا ہوا کہ وار روک کر تلوار کو اوپر اٹھا لیا' سبب کیا تھا؟ اسلام کے کمانڈر نے بتایا' وہ جوان جس نے چہرے پر کپڑا لپیٹ رکھا تھا اور لوگوں کو جنگ کے لیے ابھار رہا تھا جب میں نے اس پر وار کیا تو اس کی چیخ نکلی' یہ چیخ عورت کی تھی' میں نے تلوار کا وار روک لیا' یہ سوچ کر کہ اگر عورت کا خون ہو گیا تو حضرت محمد ﷺ کی تلوار کو بٹہ لگ جائے گا۔"

ہم نے اپنی تلوار کو اپنی ہی معصوم بچیوں کے خون سے رنگ لیا ہے۔ خون' جو ٹپکتا رہے گا خون جگر بن کر' ندامت کے آنسو بن کر۔

اس واقعے کے حوالے سے ایک اور تاریخی حقیقت بیان کرنا چاہوں گا کہ ہمارے نبی کریم ﷺ جب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو ان کے اثاثوں میں ایک چٹائی' جائے نماز' چادر' چمڑے کا جوتا اور سات تلواریں تھیں۔ ان تلواروں کو آپ نے کبھی خود استعمال نہیں کیا۔ اس طرح ہمارے تین خلفائے راشدین حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ نے بھی اپنی تلواروں کو خود استعمال نہیں کیا۔ ان کی تلواروں کا مقصد ڈیٹرنس تھا جس طرح آج ہمارے ایٹمی ہتھیار' ہماری ملٹری اسٹریٹیجی (Military Strategy) کا اہم جزو ہیں اور موثر ڈیٹرنس (Deterrence) بھی ہیں لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی تلواریں ضرب حقیقی تھیں کہ جن کی بدولت دنیائے اسلام کی پھیلتی ہوئی سرحدوں کی وسعتیں متعین ہوئیں۔

فاٹا کو صوبہ پختون خواہ میں شامل کر کے پاکستانی آئین کے تابع کر دیا گیا ہے۔ اس فیصلے کی مولانا فضل الرحمٰن اور محمود اچکزئی مخالفت کرتے رہے لیکن وہ کامیاب نہیں ہوئے اور فاٹا کو پختون خواہ میں ضم کر دیا گیا۔ مجھے ڈر ہے کہ بروقت انصاف کی عدم فراہمی کے سبب سوات اور دیر کی طرح فاٹا کے عوام بھی اس فیصلے کو مسترد نہ کر دیں۔ ان کی "علاقہ غیر" کی ثقافت' پاکستانی ثقافت سے کافی مختلف ہے۔ انہیں اپنی ثقافت کو پروان چڑھانے کے لئے الگ صوبے کی صورت میں آزاد ماحول چاہیے اور پاکستان کو چاہیے کہ اس سلسلے میں انہیں تمام سہولتیں فراہم کرے کیونکہ مستحکم جمہوری نظام کی خاطر پاکستان کو سیاسی توازن قائم رکھنے کے لئے ملک میں نئے صوبے قائم کرنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہی وہ المیہ ہے جس کے سبب ہمارے جمہوری نظام کو استحکام حاصل نہیں ہو سکا۔

قبائلی علاقوں میں لشکر کشی:

جنرل مشرف نے 2002ء کے عام انتخابات کرائے تو جی ڈی اے (GDA) والوں نے ان کی بھرپور مدد کی اور ایک بار پھر عمران خان کا وزیر اعظم بننے کا خواب ادھورا رہ گیا' اس لئے کہ 'ق' لیگ اور ایم کیو ایم نے مخالفت کی جن کے خلاف عمران خان نے سیاسی وار گیم شروع کر دی تھی۔ مشرف نے دس سال حکومت چلائی اور یہی ان کی حمایت کرتے رہے۔ 'ق' لیگ والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ "مشرف اگر دس مرتبہ وردی پہن کر آئیں تو ہم ان کا ساتھ دیں گے۔" مشرف زیادہ پر اعتماد ہو گئے تھے۔ انہوں نے دیر' سوات اور باجوڑ کے علاقوں میں لشکر کشی شروع کر دی جہاں کے لوگوں نے احتجاج کیا تھا کہ انہیں پاکستانی قانون کے تحت انصاف نہیں ملتا اس لئے انہیں ریاستی قانون چاہیے۔

ان مطالبات کی معاملہ فہمی بے نظیر بھٹو میں تھی کہ جنہوں نے مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے 1994ء میں ان علاقوں میں شرعی عدالتوں کے قیام کا فیصلہ دے دیا تھا۔ عدالتیں بھی قائم ہونا شروع ہو گئی تھیں لیکن صدر فاروق لغاری نے ان کی حکومت ختم کر دی اور ان کے بعد نواز شریف نے حکومت بنائی تو اس کاروائی کو روک دیا۔ ان مطالبات کو بغاوت کہہ کے

ان کے خلاف لشکر کشی شروع ہوئی جس کے نتیجے میں مولوی صوفی محمد اوران کے داماد فضل اللہ زیر عتاب آئے اور ہزاروں قبائلی سرحد پار افغانستان ہجرت کر گئے۔

پاکستان کی تاریخ میں پہلی بار قبائلیوں کی پاکستان مخالفت:

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ دسمبر 2004ء میں مشرف پر راولپنڈی میں دو قاتلانہ حملے ہوئے مگر وہ بچ گئے۔ امریکیوں نے انہیں یہ سبق پڑھایا کہ اس سازش کا ماسٹر مائنڈ بیت اللہ محسود وزیرستان میں بیٹھا ہے۔ بغیر تحقیق کئے مشرف نے وزیرستان پر لشکر کشی کر دی جس سے تباہی آئی' ہزاروں وزیری افغانستان ہجرت کر گئے' وزیریوں نے پاکستانی فوج پر جوابی حملے شروع کئے اور وہ آگ جو سوات' دیر اور باجوڑ میں لگی ہوئی تھی' اس نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس طرح وہ حفاظتی دیوار جو قائداعظم نے 1947ء میں قبائیلیوں کو سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری دے کر بنائی تھی وہ ٹوٹ گئی اور قبائیلیوں کی بندوقوں کا رخ ہماری طرف ہو گیا۔

1947ء میں قائداعظم نے پاک افغان سرحدوں کے تحفظ کی ذمہ داری قبائیلیوں کو دی تھی اور جو فوج وہاں متعین تھی اسے واپس بلا لیا تھا۔ 2005ء میں ان قبائیلیوں نے پہلی دفعہ پاکستان کے خلاف ہتھیار اٹھائے۔ حالانکہ اس سے پہلے پچاس سال تک وہ ہمارے دست و بازو بنے رہے۔ پاکستان کی دفاعی پالیسی میں ان کا کردار اتنا اہم ہے کہ اس پورے عرصے میں پاک فوج کو کبھی افغانستان کی سرحد پر اپنے فوجی دستے متعین کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ طالبان کے ساتھ حکومت نے سمجھوتہ بھی کیا لیکن ہر بار امریکی ڈرون حملوں نے ان کے قائدین کو شہید کر کے سمجھوتے کو سبوتاژ کر دیا۔ مولوی نیک محمد' بیت اللہ محسود اور حکیم اللہ محسود اسی طرح قتل ہوئے۔ اشتعال بڑھتا رہا اور تحریک طالبان پاکستان کی بنیاد پڑ گئی جس کے جوابی حملے شروع ہوئے اور دہشت گردی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا ہے جو ختم ہونے کو نہیں آ رہا۔

ایٹمی پاکستان کی سلامتی کے تقاضے:

ہمارے ایٹمی پروگرام سے متعلق طرح طرح کی باتیں ہوتی رہی ہیں' الزامات بھی ہیں جن کو تسلیم کرتے ہوئے محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب پر پابندیاں لگا دی گئیں۔ ان الزامات کے جواب میں' میں بہت کچھ لکھتا رہا ہوں۔ دراصل ہماری ایٹمی صلاحیت ہمارے دشمنوں کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے' انہیں تکلیف ہوتی ہے تو بے ہودہ باتیں ان کی زبانوں پر آتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 1971ء میں مشرقی پاکستان کو فتح کرنے کے بعد بھارت کو اپنی بالادستی کا اعلان کرنا مقصود تھا جس طرح سے امریکہ نے شکست خوردہ جاپان پر ایٹم بم گرا کے کیا تھا۔

کوئی اور ہوتا تو شاید خاموش ہو جاتا لیکن وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے بانگ دہل اعلان کیا کہ پاکستان ایٹمی توازن کو درست کرنے کے لئے ایٹمی صلاحیت حاصل کرے گا خواہ اسے کتنی ہی بڑی قربانی کیوں نہ دینا پڑے۔ ایک مضبوط حکمت عملی کے تحت ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو ٹاسک (Task) دیا گیا جنہوں نے کمال جرائت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وزیراعظم کے حکم کی تعمیل پر کام شروع کیا۔ حکم بڑا واضح تھا:

"ڈاکٹر صاحب' جہاں سے بھی اور جس طرح بھی آپ کو ایٹمی ٹیکنالوجی ملے حاصل کریں۔ جو وسائل آپ کو چاہئیں وہ ہم دیں گے۔ متعلقہ ادارے آپ کی مدد کو تیار ہیں۔ براہ راست مجھ سے رابطہ رکھیئے' اللہ آپ کو کامیاب کرے۔"

اسی لمحے ڈاکٹر صاحب حصول مقصد کے لئے تن من دھن سے لگ گئے۔ کوئی بھی ملک ایٹمی ہتھیار بنانے کی ٹیکنالوجی نہیں دیتا لیکن نیوکلیئر انڈر ورلڈ (Nuclear Underworld) ایک گمنام ادارہ ہے جہاں یہ ٹیکنالوجی ملتی بھی ہے اور بکتی بھی ہے اور یہاں سے ہی دنیا کے اور بہت سے خریدار اپنی اپنی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس ٹیکنالوجی کو اکٹھا کر کے ایٹمی ہتھیار بنا لینے کا فن ہر ایک کے پاس نہیں ہوتا۔ صرف ڈاکٹر خان صاحب جیسے برگزیدہ لوگوں کو اللہ تعالی نے یہ استطاعت عطا کی ہے ورنہ لیبیا جیسے

کچھ ملکوں نے بھی یہ ٹیکنالوجی خرید لی تھی لیکن ایٹمی ہتھیار نہ بنا سکے۔ ڈاکٹر خان صاحب کا دعویٰ ہے کہ 1976ء میں کام شروع کر کے انہوں نے 1986ء میں ایٹم بم بنا لیا تھا اور کولڈ ٹیسٹ بھی کر لیا تھا۔ اس بات کی گواہی میں دے سکتا ہوں۔

1987ء میں میں وائس چیف آف آرمی سٹاف بنا اور ساتھ ہی مجھے نیوکلیئر کمانڈ اتھارٹی (NCA) کا ممبر بننے کا شرف حاصل ہوا۔ اسی سال جولائی کے مہینے میں مجھے ڈاکٹر اے کیو خان ریسرچ لیبارٹریز کے دورے کی اجازت ملی۔ ڈاکٹر صاحب نے بذات خود اپنی تمام سہولتوں کا دورہ کرایا۔

سوال:..... آپ کو یاد ہوگا کہ 1986ء میں ڈاکٹر اے کیو خان اور مشاہد حسین سید نے ایک غیر ملکی رپورٹر کو انٹرویو میں پہلی بار انکشاف کیا تھا کہ پاکستان نے ایٹمی ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے جس پر بڑی لے دے ہوئی اور کسی کو یقین نہیں آیا تو آپ کو کیسے یقین آیا کہ ڈاکٹر صاحب واقعی ایٹم بم دکھانے جا رہے ہیں؟

جواب:..... مجھے ڈاکٹر صاحب کی بے پناہ صلاحیتوں پر یقین تھا کہ جس طرح انہوں نے ہمارے لئے فوج کے ترویجی پروگرام کے سلسلے میں کیسے کیسے ہائی ٹیک (Hi-Tech) ہتھیاروں کے بنانے میں ہماری مدد کی تھی تو ایٹم بم بنانا ان کے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا اور وہاں جو کچھ میں نے دیکھا ویسا ہی تھا جیسا کہ میں نے "How to Make an Atom Bomb" نامی کتاب میں پڑھا تھا۔ دل سے دعا نکلی کہ "اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے خلاف الزامات:

جنرل مشرف نے امریکی دباؤ میں آ کر ڈاکٹر عبدالقدیر خان پر الزامات لگائے۔ افغانستان کو فتح کرنے کے بعد 2004ء میں امریکہ نے ہمارے ایٹمی پروگرام کو نشانہ بنایا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر خان صاحب پر الزام لگایا کہ انہوں نے ایران، لیبیا اور دوسرے ملکوں کو ایٹمی ٹیکنالوجی دی ہے اور ثبوت میں وہ تصویریں اور شہادتیں دکھائیں جو ڈاکٹر صاحب اور ان

کی ٹیم کے ممبران 1976ء کے بعد نیوکلیئر انڈر ورلڈ سے ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی کوشش میں دوسرے ملکوں کے لوگوں سے تعلقات اور رابطے پر مبنی تھیں لیکن مشرف نے 2001ء کی بزدلی کے بعد دوبارہ گھٹنے ٹیک دیے اور سارا الزام ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کے سر تھوپ دیا۔ ٹی وی کے سامنے بلا کر ان کی توہین کی، اختیارات واپس لے لئے اور انہیں اپنے گھر تک محدود کر دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک ڈاکٹر صاحب اپنی تمام تر صلاحیتوں کے باوجود اپنے گھر میں پابند ہیں اور حیرت اس بات پر ہے کہ بے نظیر اور نواز شریف دونوں نے ان کے لئے کچھ بھی نہ کیا اور نہ ہی اب عمران خان ڈاکٹر صاحب کی صلاحیتوں کو کسی تخلیقی عمل پر لگا سکے ہیں۔ وہ بھی احسان فراموشوں کی صف میں شامل ہو چکے ہیں۔

عام تاثر یہ ہے کہ ہمارے ایٹمی پروگرام پر اربوں ڈالر خرچ ہوئے ہیں جبکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اگست 1987ء تک ایٹمی ہتھیار اور ڈیلیوری سسٹم کا تجربہ مکمل ہو چکا تھا تو جنرل ضیاالحق نے ڈاکٹر صاحب کو پچھلے دس سالوں میں پروگرام پر جو اخراجات آئے تھے' ان کی تفصیل NCA کے سامنے پیش کرنے کو کہا جو اسی ماہ پیش کر دی گئی۔

حیرت کی بات تھی کہ وہ اخراجات جو ڈالروں میں تھے اور جو اخراجات پاکستان میں ہوئے تمام ملا کر بھی 300 ملین ڈالر سے کم تھے۔ یہ لاگت ہماری ایک سب میرین (Submarine) جو فرانس سے خریدی گئی ہے اس سے بھی کم ہے۔ یہ استعداد حاصل کر کے پاکستان نے قابل اعتماد ڈیٹرنس (Deterrence) قائم کر لیا جس کا اعتراف بھارت کے وزیر دفاع نے 1998ء میں ان الفاظ میں کیا جب پاکستانی دھماکہ بھارت کے دھماکے سے زیادہ زور آور ثابت ہوا:

"Now perfect nuclear deterrece has been established between India and Pakistan."

ہمارا ایٹمی پروگرام اس لحاظ سے منفرد نوعیت کا ہے کہ وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے 1975ء میں دنیا پر واضح کر دیا تھا کہ جنوبی ایشیاء میں طاقت کا توازن بحال کرنے کے

لئے پاکستان ہر حالت میں ایٹمی ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کرے گا اور محض دس سال کی قلیل مدت میں پاکستان نے یہ صلاحیت حاصل کر لی اور وہ بھی صرف 300 ملین امریکی ڈالر سے کم کی لاگت سے۔ لیکن دوسری جانب ہمارے قائدین کو اس کی بہت بھاری قیمت ادا کرنا پڑی جسے سونے اور پلاٹینم کے ساتھ بھی تولا نہیں جا سکتا۔ پاکستان کو ایٹمی قوت بنانے والی پانچ اہم شخصیات کو یا تو زندگی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے یا اقتدار سے جبری علیحدہ ہونا پڑا اور غلیظ پروپیگنڈے کے ذریعے ان کی کردار کشی کی گئی ہے:

☆ ذوالفقار علی بھٹو' جنہوں نے پالیسی دی' اہداف مقرر کئے اور تمام سہولتیں فراہم کیں' انہیں عدالتی قتل کے ذریعے ختم کر دیا گیا۔ وزیر اعظم کو جس کرب سے گزرنا پڑا اس کا اظہار انہوں نے اپنی زندگی کی آخری رات 3 اپریل 1979ء کو ایٹمی پروگرام کے حوالے سے بات کرتے ہوئے' ان الفاظ میں کیا ہے:

''جب میری حکومت ختم کی گئی اور مجھے کال کوٹھڑی میں ڈالا گیا اس وقت ہم ایٹمی صلاحیت حاصل کرنے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ اسرائیل اور جنوبی افریقہ مکمل طور پر ایٹمی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں۔ کیمونسٹ طاقتیں 'عیسائی' یہودی اور ہندو تہذیبیں بھی یہ صلاحیت حاصل کر چکی تھیں صرف اسلامی تہذیب اس صلاحیت سے محروم تھی مگر اب عنقریب یہ صورت حال تبدیل ہونے کو ہے اور میری دعا ہے کہ میرے جانے کے بعد ایسا ممکن ہو جائے تا کہ میرے ملک کے اسی ملین عوام کو تحفظ اور سلامتی حاصل ہو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کامیابی میری شخصیت کو یادگار بنا دے گی جس پر میں دنیا بھر کی مخالفت کے باوجود کئی سالوں سے پختہ اور محکم ارادے سے کام کرتا رہا ہوں۔''

☆ جنرل ضیاء الحق' جنہوں نے 1977ء سے 1988ء تک ایٹمی پروگرام کو غیر متزلزل امداد فراہم کی تھی' ایک سازش کے تحت قتل کر دیے گئے۔

☆ محترمہ بے نظیر بھٹو جنہوں نے ہماری ایٹمی قوت میں منطق اور ٹھہراؤ کا عنصر شامل

کیا۔ 1990ء میں امریکہ' بھارت اور اسرائیل کی مشترکہ سازش کا جواب مضبوط اقدامات کر کے دیا کہ ہمارے پاس صلاحیت بھی ہے اور اسے استعمال کرنے کا حوصلہ بھی ہے۔ انہیں دہشت گردی کا شکار ہونا پڑا۔

☆ ڈاکٹر عبدالقدیر خان' جیسے عظیم سائنسدان' جن کی لازوال محنت اور شبانہ روز کی کاوشوں سے صرف قلیل عرصے میں یہ منزل حاصل ہوئی' ان کی شخصی آزادی تک چھین لی گئی اور بدترین تضحیک کا نشانہ بنایا گیا۔

☆ میاں نواز شریف' سابق وزیر اعظم پاکستان' جنہوں نے ایٹمی دھماکے کر کے بھارت کو موثر جواب دیا' انہیں آٹھ سال تک جلاوطنی کی سزا کاٹنا پڑی اور اس اذیت کے بعد قوم نے انہیں وزیر اعظم منتخب کیا لیکن پھر سازش کے تحت انہیں کرسی اقتدار سے الگ کر دیا گیا ہے۔

عظیم سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان اور ان کے رفقاء کی شبانہ روز کی انتھک محنت کے سبب 1986ء تک ہم نے ایٹمی ہتھیار بنانے کی صلاحیت حاصل کر لی تھی اور اس کے اگلے سال ہی ایٹمی ہتھیاروں کو ایف سولہ طیاروں کے ذریعے استعمال کرنے کے نظام کے تجربات کئے۔ ہم نے 1996ء تک درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے میزائل استعمال کرنے کا نظام بھی وضع کر لیا تھا لیکن اسکے باوجود ایٹمی دھماکے نہ کرنے کی وجہ سے ہماری ایٹمی صلاحیت کے بارے میں ابہام موجود تھا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ 1998ء میں بھارت نے پانچ ایٹمی دھماکے کئے جس کا جواب پاکستان نے چھ زوردار ایٹمی دھماکوں کی صورت میں دیا جس سے ہماری ایٹمی صلاحیت دنیا پر واضح ہو گئی۔ اس کے بعد پاکستان نے اپنی ایٹمی صلاحیت کے نظام کو یقینی بنانے کے لیے متعدد اہم اقدامات اٹھائے جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کے نظام کو مضبوط اور قابل اعتماد بنانے کے لیے مسلح افواج کے تینوں شعبوں میں ترقی و تحقیق کا ایک جامع پروگرام شروع کیا گیا:

☆ کم اور زیادہ طاقت کے حامل ایٹمی ہتھیار تیار کرنے کی صلاحیت میں اضافہ کیا گیا۔

☆ ہتھیاروں کی یقینی صلاحیت اور استعمال کے نظام کو بہتر اور موثر بنایا گیا اور وقفے وقفے سے تجربات کیے گئے تاکہ اس بات کا یقین کیا جا سکے کہ تمام شعبے کسی ہنگامی صورت حال سے نمٹنے کے لئے مکمل طور پر تیار ہیں۔

☆ 2006ء تک کمانڈ اور کنٹرول کا ایک جامع نظام تشکیل پا چکا تھا جس سے ایٹمی مواد میں اضافے، ہتھیاروں کے نظام میں بہتری اور حاصل شدہ صلاحیت کے مطابق مسلح افواج کے شعبوں میں قوائد وضوابط کو ضابطہ تحریر میں لا کر نظام کو مربوط بنایا گیا تاکہ تمام متعلقہ اداروں کے نظام اور ''مخصوص ایٹمی ذمہ داریوں'' میں ہم آہنگی پیدا کی جا سکے۔

☆ انتہائی حساس نوعیت کی حامل ''ایٹمی بٹن دبانے'' کی پالیسی مرتب کی گئی تاکہ اس بات کا تعین کیا جا سکے کہ حتمی فیصلہ کرنے کا اختیار کس کے پاس ہوگا اور یہ بٹن کس کے ہاتھوں میں ہوگا۔

2007ء میں پورے ایٹمی کمانڈ اور کنٹرول سسٹم کے تحفظ وسلامتی کا نظام وضع کیا گیا جو ایک بہترین نظام ہے' جسے تمام ایٹمی صلاحیت کے حامل ممالک نے سراہا ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں اور مواد کی سختی سے حد بندی کر کے ایٹمی تنصیبات کی سکیورٹی کے لئے عالمی معیار کے مطابق اصول وضوابط اختیار کیے گئے ہیں تاکہ سہولتوں کی باحفاظت منتقلی کو یقینی بنایا جا سکے۔ ایٹمی ٹیکنالوجی کو پرامن مقاصد کے لیے استعمال کرنے کے کئی طریقے ہیں' جن میں ایٹمی پاور پلانٹس کے لیے درکار ایندھن کی تیاری' صحت' زراعت اور دیگر مختلف شعبوں کی تحقیقی ضرورتیں پوری کرنا شامل ہیں۔

ان مقاصد کے لئے ایٹمی ٹیکنالوجی دوسرے ممالک کو بھی دی جا سکتی ہے اور لی بھی جا سکتی ہے اور جب پاکستان ایٹمی سپلائی گروپ کا ممبر بن جائے گا تو اس طرح کے تعاون میں مزید اضافہ ہوگا۔ ایٹمی پالیسی کے عوامل انتہائی احتیاط کے ساتھ مرتب کیے گئے ہیں اور خصوصا اس بات کی احتیاط اور وضاحت کی گئی ہے کہ ایٹمی صلاحیت کو زمانہ امن میں کیسے استعمال کرنا ہوگا اور خصوصا جب دشمن ایٹمی بلیک میل کر رہا ہو۔ ایٹمی پالیسی کے فیصلوں کے معاملے میں

اختیار کیے جانے والے چند اہم نکات مندرجہ ذیل ہیں۔

☆ ایٹمی مزاحمت کی صلاحیت میں اضافے کے لیے موزوں وقت پر ''مضبوط سیاسی عزم (Political Will)'' کا ہونا لازم ہے۔ ہماری سیاسی قیادت اور ماہر سائنسدانوں نے باہمی اشتراک سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جہاں صحیح اور بروقت اہم فیصلے کیے گئے۔ ان قائدین کو وطن کی خاطر عظیم خدمات سرانجام دینے کے جرم میں کڑی سزائیں تو دی گئیں لیکن انہوں نے وطن سے محبت کا حق ادا کر دیا۔ بقول شاعر:

سیپی کی طرح سینچ کے رکھا تیرا وجود
خود ڈھل گئے مگر تجھے گوہر بنا دیا

مندرجہ بالا تفصیل ہماری مربوط اور قابل اعتماد ایٹمی صلاحیت کے اہم عوامل کی تشریح ہے لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ایٹمی قوت ہونے کی حیثیت سے ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہماری روایتی فوج ہی ہمارے مستقبل وسلامتی کی جنگ لڑے گی اور انشاءاللہ ہر جنگ جیتے گی۔ ایٹمی ہتھیار طاقت کا توازن (Balance of Terror) قائم کرنے کے لیے ہوتے ہیں جو 28 مئی 1998ء کو قائم ہوا۔ سوویٹ یونین اور امریکہ ہزاروں ایٹمی ہتھیار رکھنے کے باوجود افغانستان اور عراق میں شکست سے نہ بچ سکے۔ اسرائیل کے پاس دو سو ایٹمی ہتھیار تھے لیکن 2006ء کی جنگ میں ان کے ایٹمی ہتھیار اسے حزب اللہ کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست سے نہ بچا سکے اور اب داعش کے خلاف دنیا کی چار ایٹمی طاقتیں امریکہ' روس' فرانس اور برطانیہ ہزاروں ایٹمی ہتھیار رکھنے کے باوجود ایک ایٹم بم بھی استعمال نہیں کر سکتیں۔

اسی طرح اگر 1945ء میں امریکہ کو جاپان کی طرف سے امریکی سرزمین پر ایک بھی ایٹم بم گرانے کا خطرہ ہوتا تو وہ کبھی بھی جاپان پر ایٹم بم گرانے کی ہمت نہ کرتا۔ ایٹمی طاقت ہونے کی یہی مجبوری ہے اور وسیع پیمانے پر تباہی پھیلانے والے یہ ہتھیار دوست اور دشمن کا امتیاز کے بغیر تباہی کا موجب بنتے ہیں لیکن اس کے باوجود اگر قوم میں لاشعوری طور پر ایٹمی

ہتھیار استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیں تو ان کی لاشوں پر بین کرنے والا بھی کوئی نہیں بچے گا۔

ہمارے نظریات پر حملہ ایک خطرناک سازش ہے جو 2008ء میں شروع کی گئی جب جان کیری نے اعلان کیا کہ امریکہ نے 1.4 بلین ڈالر کی رقم پاکستانی قوم کے ذہن ونظریات کو بدلنے کے لئے مختص کی ہے۔ اس کا تذکرہ میں پہلے بھی کر چکا ہوں۔ کچھ ایسی ہی صورت حال 1965ء میں انڈونیشیا میں سوشلزم، کمیونزم اور اسلامی نظریات کے درمیان ٹکراؤ کی صورت میں پیدا ہوئی تھی جس کے سبب خانہ جنگی ہوئی اور لاکھوں لوگ مارے گئے۔ ایسے حالات پاکستان میں بھی پیدا کرنے کی سازش ہو رہی ہے۔

صدر بش کی پاکستان آمد:

2008ء میں صدر بش پاکستان آئے جبکہ الیکشن کی تیاریاں جاری تھیں۔ انہوں نے مشرف کو شاباش دی کہ "مشرف کی حکمت عملی کے تحت پاکستان میں پہلی دفعہ جمہوری طریقے سے انتقال اقتدار کا مرحلہ پورا ہوگا۔" مشرف نے 2002ء کے انتخابات جیسی تیاریاں کر رکھی تھیں اور پر اعتماد تھے کہ وہی کامیاب ہوں گے لیکن جنرل کیانی نے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ "فوج الیکشن کے معاملات سے لاتعلق رہے گی۔" جس کے نتیجے میں عوام نے کسی دباؤ کے بغیر اپنی مرضی سے ووٹ دیے۔

جب الیکشن کے نتائج سامنے آئے تو کھلبلی مچ گئی۔ امریکہ سے ٹیلیفون آنے شروع ہوئے کہ یہ کیا ہو گیا ہے؟ میں نے کہا کہ "آزادانہ اور غیر جانبدارانہ الیکشن ہوئے ہیں اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔" اسی دن واشنگٹن پوسٹ کا ایڈیٹر لکھتا ہے:

> *"The American policy makers about Pakistan must rue the day, they decided for regime change in Pakistan, through the democratic process. Democracy is what has now emerged - an unholy alliance of long-term American haters - Aslam Beg and Hamid Gul. The behind-the-scenes*

> *god-fathers of this broad-based, anti-US coalition is Nawaz Sharif."*

> "امریکہ کے پالیسی ساز لوگوں کو اس دن پر ماتم کرنا چاہیے جب انہوں نے جمہوری عمل کے ذریعے پاکستان میں عہد حکومت کی تبدیلی کا فیصلہ کیا۔ جمہوریت کے ذریعے جو لوگ ابھر کر سامنے آئے ہیں وہ امریکہ سے طویل عرصے سے نفرت کرنے والوں کا غیر مقدس اتحاد ہے جس کے سربراہ نواز شریف ہیں لیکن پس منظر میں امریکہ کے مخالفت کرنے والے اسلم بیگ اور حمید گل جیسے سرپرست لوگ ہیں۔"

وہ مقصد جو 2008ء کے الیکشن میں حاصل نہ ہو سکا تھا ہائی برڈ اسٹریٹیجی (Hybrid Strategy) کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔

بھارتی سرجیکل سٹرائیک:

سوال:...... 27 فروری کی بھارتی سرجیکل اسٹرائیک کے بارے میں آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

جواب: بھارت نے 27 فروری 2019ء کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان کے خلاف بالاکوٹ کے مقام پر "فرضی جہادی کیمپ" پر حملہ کیا جسے سرجیکل اسٹرائیک کا نام دیا جو فوجی اصطلاح میں انتقامی کاروائی تھی۔ پاکستان کو یہ بتانا مقصود تھا کہ اگر اس نے دوبارہ ایسی حرکت کی تو اسے اس سے بھی زیادہ سخت ردعمل کا سامنا کرنا ہوگا۔ اس سرجیکل اسٹرائیک کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔ بھارتی سیکرٹری دفاع نے پریس بریفنگ میں وضاحت کی کہ:

> "غیر فوجی سرجیکل اسٹرائیک (Non-Military Pre-emptive Surgical Strike) کا مطلب یہ ہے کہ کسی فوجی ٹھکانے کو ہدف نہیں بنایا گیا کیونکہ فوجی ٹھکانوں کو ہدف بنانا جنگی کاروائی تصور کی جاتی ہے۔"

اس طرح ہمارے عسکری ترجمان نے وضاحت کی کہ:

''ہمارے فضائی دفاع کے نظام نے بھارتی طیاروں کو لائن آف کنٹرول کے اندر آتے ہوئے دیکھ لیا تھا لیکن انہیں اس لئے نشانہ نہیں بنایا گیا کیونکہ انہوں نے کسی فوجی ٹھکانے کو ہدف نہیں بنایا۔''

دونوں اطراف کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں ممالک تصادم کی ابھرتی ہوئی کیفیت کو محدود رکھنا چاہتے ہیں کہ کہیں حالات ایک بھرپور جنگ کی صورت نہ اختیار کر جائیں۔اس کے باوجود سیالکوٹ کے محاذ پر جو کچھ ہوا وہ حیران کن ہے۔ بھارت کی جارحیت کے جواب میں بری فوج نے نصف درجن بھارتی چوکیوں کو نشانہ بنایا جس میں دشمن کے متعدد فوجی مارے گئے۔ دوسری صبح دو بھارتی طیاروں نے بھارتی زمینی دستوں کی مدد کی خاطر پاکستانی فضائی حدود کی خلاف ورزی کی۔ ہمارے لڑاکا طیاروں نے انہیں برق رفتاری سے مار گرایا اور ان میں سے ایک پائلٹ کو زندہ گرفتار کر لیا ہے۔

AFGHANISTAN
PAKISTAN
INDIA

27 فروری 2020ء کو بھارتی طیاروں کا مالم ہیبر پر حملے کا روٹ

ہمارے طیاروں نے نور خان ائربیس سے پرواز کر کے دس ناٹیکل میل کا فاصلہ چند منٹوں میں طے کر کے بالاکوٹ کے مقام پر بھارتی طیاروں کو جالیا۔ بھارتی طیاروں کو سرحد

پار سے ایس یو-۳۰ (SU-30) طیاروں کے ذریعے دفاعی حصار مہیا کیا جا رہا تھا جو کہ اسرائیلی میزائلوں سے لیس تھے اور اسی کلومیٹر کے فاصلے تک مار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ چار میراج-۲۰۰۰ (Mirag-2000) بھارتی طیارے خوف کے سبب پاکستانی طیاروں کا سامنا نہ کر سکے، بم اور ایندھن کے ٹینک عطر شیشہ کے پہاڑوں میں گرا کر فرار ہو گئے۔ میں ان پہاڑوں میں 1950ء کی دہائی میں ایس ایس جی کی مشقوں کے دوران پھرتا رہا ہوں۔ میرا ڈرائیور غلام محمد جبہ سے تعلق رکھتا ہے جس نے اس نام نہاد بھارتی سرجیکل اسٹرائیک کے لمبے لمبے کی خبریں مجھے فراہم کیں۔ لائق تحسین ہیں پاکستان کی دفاعی افواج جنہوں نے بھارت کے جنگی جنون کو ناکوں چنے چبوا دیے ہیں۔

ہماری سرجیکل اسٹرائیک کی ایک مثال ہے جو ان دنوں میں پیش آئی جب میں چیف آف آرمی سٹاف تھا۔ 1990ء میں سوویت یونین کی افغانستان سے پسپائی کے بعد جہادی اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ اسی طرح کشمیر کے جہادی بھی واپس گئے اور ان میں سے کچھ کشمیریوں کی تحریک آزادی میں شامل ہوئے جس کے سبب تحریک میں شدت آئی اور خصوصاً ایل او سی (LOC) پر دونوں طرف سے چھوٹے بڑے ہتھیاروں کا استعمال روزانہ کا معمول تھا۔ اسی دوران بھارتی فوج سویڈن سے خریدی ہوئی بوفور گنیں (Bofor Guns) ایل او سی تک لے آئی اور گہرائی میں واقع اہداف (Deep Targets) کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ ہماری ایک بٹالین ہیڈکوارٹر کو نشانہ بنایا جس سے ہمارے تین آفیسرز شہید ہوئے۔ اس جارحیت کا جواب دینا ضروری تھا۔

اس واقعے کو ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک دن صبح 10 کور کمانڈر میرے دفتر آئے اور فوراً ملنا چاہا۔

میں نے بلا لیا۔ پوچھا:

خیریت ہے آپ کیسے آئے؟

''سر، میرا ڈویژن کمانڈر قابو سے باہر ہے۔ چھ جگہوں سے دشمن پر حملہ آور ہوا ہے، رکتا

نہیں ہے۔

یہ تو جنگ ہو جائے گی۔"

میں نے کہا "نہیں' جنگ نہیں ہو گی۔ یہ تو وہی حکمت عملی ہے جو آپ نے اور ہم نے بنائی تھی۔

ڈویژن کمانڈر نے حالات کو دیکھتے ہوئے ایک دو نہیں بلکہ چھ منصوبوں کو ایک ساتھ لانچ کیا ہے اور یقیناً اس کے گہرے نتائج برآمد ہوں گے۔"

لیکن سر" ایسا ایکشن لینے سے پہلے ہمیں بتانا تو چاہیے تھا۔"

"آپ کا کہنا درست ہے۔ آیئے ان سے بات تو کرتے ہیں۔"

میں نے کال ملائی۔ میجر جنرل محمد صفدر' ستارہ جرات نے فون اٹھایا۔

"صفدر' کیا ہو رہا ہے؟"

"سر' دشمن کو کھڑکا کے رکھ دیا ہے۔ متعدد پوسٹیں تباہ کر دی ہیں' دشمن اپنی لاشیں چھوڑ کر بھاگا ہے۔ اس کی دو گنیں بھی ہم نے تباہ کی ہیں۔ دبایا ہوا ہے۔"

"ماشاءاللہ' Keep it up ۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"اس سے پہلے کہ وہ ہم پر جوابی حملہ کریں ہم واپس آ جائیں گے۔ اللہ کا کرم ہے کہ ہمارے چند سپاہی معمولی زخمی ہوئے ہیں۔"

یہ سرجیکل اسٹرائیک کی عمدہ مثال ہے جس کی کامیابی کے لئے پوری تیاری کرنی ہوتی ہے۔ انتہائی موزوں اقدامات اٹھانے ہوتے ہیں کہ حالات قابو سے باہر نہ ہوں اور مقصد بھی حاصل ہو' یعنی دشمن کو واضح پیغام مل جائے کہ وہ اپنی حرکات سے باز رہے۔

بھارت اور اسرائیل کی پاکستان ایٹمی پلانٹ پر حملے کی کوشش:

سوال: بھارت اور اسرائیل کے بارے میں خبریں ملی ہیں کہ وہ پاکستان کے خلاف متحد ہو کر کوئی کاروائی کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خبریں کہاں تک درست ہیں؟

جواب:...... پاکستان کے خلاف بھارت اور اسرائیل کا ناپاک گٹھ جوڑ کوئی نئی بات نہیں

ہے۔ 1980ء میں بھی وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کو تباہ کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں جس وقت ہمارا ایٹمی پروگرام ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھا۔ اس وقت دشمن کو موثر جواب دینے کے لئے ہمارے پاس ایف سولہ طیارے بھی نہیں تھے۔ اس سازش کا انکشاف دی ایشین ایج کی دو جرنلسٹس Adrian Levy and Catherine Scott-Clark کی لکھی ہوئی کتاب Deception: Pakistan, United States and the Secret Trade in Nuclear Weapons میں تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔

تفصیل یوں ہے کہ بھارتی گجرات کے "جہان گڑھ ائر فیلڈ" پر اسرائیلی جہازوں کا ایک سکواڈرن پاکستان کے کہوٹہ ایٹمی پلانٹ پر حملہ کرنے کے لئے بالکل تیار تھا۔ ان کا منصوبہ تھا کہ وہ ایک کومپیٹ یا فائٹ گروپ کی شکل میں پرواز کرتے ہوئے پاکستان میں داخل ہوں گے تا کہ پاکستانی ریڈار کو دھوکہ دیا جا سکے اور ریڈار آپریٹر یہ سمجھیں کہ شاید یہ کوئی ایک ہی بڑا مسافر بردار جہاز ہے۔ پھر وہ کہوٹہ پر بمباری کر کے اس کو تباہ کر دیں گے اور وہاں سے سیدھے جموں و کشمیر کے راستے نکل جائیں گے۔ اس حملے کی اطلاع جنرل ضیاء الحق کو ملی' ہماری انٹیلی جنس ایجنسی نے حملے سے صرف چند گھنٹے پہلے حملے اور سازش کا سراغ لگا لیا۔ جنرل ضیاء الحق نے ساری صورت حال کا تیزی سے جائزہ لیا اور فوری فیصلہ کیا کہ حملے کو روکا نہیں جائے گا بلکہ ناکام بنایا جائے گا تا کہ پاکستان کو جوابی حملے کا جواز مل سکے۔ اس حکمت عملی کے تحت ایک بھرپور جوابی حملے کا پلان بنایا گیا۔

پاکستانی ائر فورس کے تین دستے تشکیل دیے گئے۔ پہلے کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ اسرائیلی جہازوں کے حملے کو ناکام بنائے اور ان کو مار گرائیں۔ دوسرے دستے کو ممبئی میں موجود بھارت کے بھابھا نیوکلیئر پلانٹ کو تباہ کرنے کا ٹاسک ملا جبکہ تیسرے دستے کو نجیو ڈیزرٹ میں موجود اسرائیل کے ڈیمونا نیوکلیئر پلانٹ کو تباہ کرنے کا ٹاسک دیا گیا۔ لیکن دور دراز اہداف پر حملے کا مسئلہ یہ تھا کہ پاکستانی جہاز وہاں ری فیولنگ نہ کر پاتے اور ان کی واپسی ناممکن تھی لیکن پھر بھی متعدد پائلٹ اس مشن پر جانے کو تیار تھے۔ امریکی سیٹلائٹ نے

پاکستانی جہازوں کی غیر معمولی نقل و حرکت کو نوٹ کیا اور فوراً اسرائیل اور بھارت کو آگاہ کیا اور انہوں نے خوف زدہ ہو کر اپنے مشن سے پسپائی اختیار کر لی۔

بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ:

بھارت اسرائیل گٹھ جوڑ اس بڑے منصوبے کا حصہ ہے جو اسی سال وارسا (Warsaw) کے مقام پر تشکیل دیا گیا ہے۔ 4 جولائی 2017ء کے مودی کے دورہ اسرائیل کو قومی اور بین الاقوامی میڈیا نے شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ یہ دورہ تاریخی اہمیت کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ 1992ء میں دونوں ملکوں کے مابین سفارتی تعلقات کے فروغ کے بعد کسی بھی بھارتی وزیراعظم کا یہودیوں کی سرزمین کا پہلا دورہ تھا جس کا اختتام 2.6 ملین امریکی ڈالر مالیت کے اسلحے کے معاہدے پر دستخطوں کی صورت میں ہوا جس سے بھارت کو اسلحہ سپلائی کرنے والے ممالک میں اسرائیل دوسرا بڑا ملک ہے۔ یہ تذویراتی شراکت کی ایک بھیانک صورت ہے جو دفاعی تجزیہ کاروں کی نظروں میں خطے میں طاقت کے توازن کو بگاڑ دے گی اور اسلحہ کی دوڑ میں تیزی آ جائے گی۔

بھارت نے اپنی اقتصادی و تذویراتی سمت تبدیل کر لی ہے اور امریکہ سے درخواست کر رہا ہے کہ وہ اس کی اقتصادی اور عسکری پشت پناہی کرتا رہے۔ یہی وہ تاریخی موڑ ہے جب امریکیوں نے بھارت پر واضح کر دیا کہ اگر وہ واشنگٹن کے ساتھ بہتر تعلقات کا خواہاں ہے تو اسے پہلے اسرائیل کے ساتھ بہتر تعلقات قائم کرنا ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں واشنگٹن جانے کے لیے تل ابیب کا راستہ اختیار کرنا ہوگا ان تعلقات کی عملی صورت کشمیر اور فلسطین میں دیکھی جا سکتی ہے جہاں بھارت اور اسرائیل نہتے مسلمانوں کے ساتھ انسانیت سوز سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ متعدد ایسے واقعات ہیں جو اس امر کے شاہد ہیں کہ بھارت اور اسرائیل کے باہمی گٹھ جوڑ کا مقصد خطے میں سازشی چالوں کے ذریعے اپنے مفادات کے حصول کو یقینی بنانا ہے۔

اس پس منظر میں دونوں ممالک کے مابین دفاعی و تذویراتی تعاون میں ہر گزرتے دن کے ساتھ پختگی آتی جا رہی ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ مزید برآں بھارت اور

اسرائیل کا (Barak 8) میزائل جسے اسرائیل ایرو سپیس انڈسٹریز (Israel Aerospace Industries) اور بھارت کے ادارے (India's Defense Research & development Organization - IDRDDO) نے مل کر ڈیزائن کیا ہے اور اس کی تیاری Raefel Advanced Defense System & Bharat Dynamic Limited نے کی۔ اس میزائل کو دنیا کے فضائی نظام میں طاقت ور قرار دیا جاتا ہے۔ اس کی ساخت ایسی ہے کہ یہ ہر طرح کے فضائی خطرے' طیاروں' ہیلی کاپٹروں اور ڈرونز حملوں کے خلاف کامیاب دفاع کر سکتا ہے۔ حملہ کرنے والے میزائلوں کو 0.5 کلومیٹر سے لے کر 90 کلومیٹر کے رینج تک کامیابی سے روکنے کی صلاحیت ہے۔

اس کے علاوہ بھارت اور اسرائیل کے درمیان اسلحہ کے معاہدے میں Spice 2000 Bombs and laser-designations pods بھی شامل ہیں۔ اس نظام میں جی پی ایس گائیڈڈ (GPS Guided Precision Targeting) اور Spike-anti-Tank Guided Missile System" کو کامیابی سے نشانہ بنانے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ اس میزائل کو آدمی اٹھا کر فائر کر سکتا ہے اور یہ Tandem-charged Heat Warhead کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کا رینج 4 کلومیٹر تک ہے۔ اس کے علاوہ فیلکن اواکس (Phalcon AWACS) جو کہ بنیادی طور پر اسرائیل کے پیشگی اطلاع دینے کی صلاحیت کے حامل راڈاروں سے لیس ہے جنہیں روسی آئی ایل ٧٦ (IL-76) ٹرانسپورٹ طیاروں پر نصب کیا گیا ہے۔

امریکہ نے دوسری جنگ عظیم کے بعد اپنی عسکری بالادستی قائم کرنے کے لیے 700 سے زیادہ مختلف ملکوں میں فوجی اڈے قائم کئے اور ان سینکڑوں مراکز کا رابطہ مرکزی کنٹرول روم A-1 Centre, Pentagon سے ہے۔ اس صلاحیت کو افغانستان میں بھرپور طریقے سے استعمال کیا گیا اور اسی کنٹرول روم میں بیٹھ کر ہزاروں میل دور سے صدر اوباما اور ان کی کیبنٹ نے اسامہ بن لادن کے قتل کا منظر دیکھا۔

امریکہ کی بھارت کی بالادستی کی کوششیں:

سوال: امریکہ ہمارے خطے میں بھارت کو بالادستی دلوانا چاہتا ہے' بالکل اسی طرح جیسا کہ اس نے مشرق وسطی میں اسرائیل کو بالادستی دلوا رکھی ہے۔اس بارے میں آپ کیا کہیں گے؟

جواب: بھارتی بالادستی کا امریکی منصوبہ(Indian Hegemony Plan)امریکہ اور بھارت کے اعصاب پر سوار ہے۔ سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد امریکہ نے پورے علاقے میں اپنی بالادستی قائم کرنے کا منصوبہ بنایا جس طرح مشرق وسطی میں اسرائیل کے ذریعے وہ اپنے مفادات کا تحفظ کر رہا ہے۔ بھارت کی بالادستی کا مجوزہ علاقہ افغانستان سے لے کر بنگلہ دیش اور اس سے آگے ایشیائی بحرالکاہل (Asia Pacific) تک کا ہے۔ اس مقصد کے لئے امریکہ نے 2005 میں بھارت کے ساتھ اسٹریٹیجک پارٹنرشپ (Strategic Partnership) کا معاہدہ کیا اور اس کے بعد 2015 میں اسٹریٹیجک ڈیفنس پارٹنرشپ (Strategic Defence Partnership) کا معاہدہ کیا جس کے تحت اب امریکہ اعلی ٹیکنالوجی کے ہتھیار اور سازوسامان (Hitech Weapons & Equipment) جو اب تک اسرائیل کو دیتا رہا ہے' اب بھارت کو بھی دے رہا ہے اور اس مقصد کے لیے امریکہ بھارت اور اسرائیل کے درمیان مفاہمت موجود ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ امریکہ کی ٹیکنالوجی کا مقابلہ مشکل ہے اور مستقبل قریب میں بھارت کو ہم پر برتری حاصل ہوجائے گی خصوصا سائبر وارفیئر (Cyber Warfare) اور (Outer Space Technology) کے حصول میں اور یہی وہ صلاحیت ہے جس کی بدولت بھارت دھونس' دھاندلی' ظلم و بربریت کے تمام طریقے استعمال کرنے سے گریز نہیں کر رہا ہے۔اس کام میں اسے امریکہ کی بھرپور معاونت حاصل ہے۔ بھارت کو امریکی اتحادی ہونے کا بڑا زعم ہے۔اس زعم کے سبب مودی نے کشمیر میں ظلم و بربریت کا جو سلسلہ قائم کر رکھا ہے وہ قابل مذمت ہے۔سائبر ٹیکنالوجی کے میدان میں برابری کے حصول کی خاطر ہمیں

پاکستان کے اندر سائبر خلاء کے اعلی ماہرین پر مشتمل ایک سیل تشکیل دینا لازم ہے تا کہ ضروری ایجادات کر کے ہم بروقت اپنا ذاتی سائبر نظام وضع کر سکیں جو ہمیں اس قابل بنا دے گا کہ ہم سائبر خلاء میں ہونے والی نت نئی تبدیلیوں سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

امت مسلمہ کے خلاف سازشیں:

سوال:...... سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادیوں نے دنیائے اسلام کو اپنا دشمن سمجھا ہے اور پچھلی تین دہائیوں سے کئی مسلمان ملکوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ پاکستان کو بھی مختلف سمتوں سے خطرات کا سامنا ہے۔ یہ خطرات کیا ہیں اور ان سے کس طرح نمٹا جا سکتا ہے؟

جواب:...... مسلم دشمنی میں امریکہ کے ساتھ اسرائیل اور بھارت بھی پیش پیش ہیں۔ مشرق وسطی کے علاقے میں اسرائیل کی بالادستی قائم کی گئی تا کہ وہاں امریکہ کے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ وسطی ایشیا' جنوبی ایشیا اور ایشیا پیسیفک کے علاقوں میں بھارت کی بالادستی کو مضبوط کیا جا رہا ہے۔ مسلمان ملکوں کی کمزوریوں کو ابھار کر انہی کے خلاف استعمال کرنے کا عمل جاری ہے' مثلا:

پاکستان میں دہشت گردی اور بغاوت کو ابھارا گیا ہے۔ اسی گٹھ جوڑ نے قوم کو فرقہ واریت اور نظریاتی و سیاسی انتشار کے عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ دنیائے اسلام کے خلاف موجودہ دور کی پہلی صلیبی جنگ 2001ء میں شروع ہوئی اور ابھی تک نہ صرف جاری ہے بلکہ ایک نیا رخ اختیار کر چکی ہے۔ جنرل پرویز مشرف کے بدترین فیصلے کے سبب آج ایک عذاب ہم پر مسلط ہے۔ امریکہ اور بھارت کے گٹھ جوڑ کے نتیجے میں بھارت نے افغانستان میں اپنا جاسوسی نیٹ ورک بنایا جسے پاکستان کے خلاف سی آئی اے(CIA) 'ایم آئی 6' موساد اور نیٹو ممالک کی انٹیلی جنس ایجنسیوں کی مدد حاصل رہی ہے۔اس سازش کے خلاف ہماری کسی حکومت نے احتجاج تک بھی نہیں کیا۔

2005ء میں امریکہ نے بھارت کے ساتھ اسٹریٹیجک پارٹنرشپ کا معاہدہ کیا اور

بھارت کو یہ ہدف دیا کہ اس علاقے میں اسلامی انتہا پسندی کو ختم کرے اور چین کی بڑھتی ہوئی طاقت کو محدود کرے۔ اس مقصد کے لئے افغانستان میں بھارت کی مداخلت کو جواز دینے کے لئے افغانستان کو جنوبی ایشیا کا حصہ قرار دیا ہے جبکہ جغرافیائی اعتبار سے افغانستان وسطی ایشیا کا حصہ ہے۔ اور آج سے چند سال قبل بھارت سے اسٹریٹیجک ڈیفنس پارٹنرشپ کا معاہدہ کر کے امریکہ بھارت کی وسط ایشیا سے لے کر جنوبی ایشیا اور اس سے آگے جنوب مشرقی ایشیا تک بالادستی قائم کرنا چاہتا ہے جس طرح اسرائیل کو پورے جنوب مغربی ایشیا میں بالادستی حاصل ہے۔

2016ء میں ترکی کے صدر جناب طیب اردگان جب پاکستان کے دورے پر آئے تھے تو انہوں نے خبردار کیا تھا کہ "پاکستان کی سلامتی کو فتح اللہ گولن طرز" کے خطرے کا سامنا ہے جو ہماری قومی سلامتی کے لئے انتہائی خطرناک ہے اور ہمیں اس سے نمٹنے کے بروقت اقدامات کرنے ہوں گے۔ ترک صدر کی اس وارننگ کا باریک بینی سے تجزیہ کرنے کے بعد اس کے مضمرات سامنے آئے ہیں۔ ہماری اندرونی سیاسی و نظریاتی تفریق دن بدن گھمبیر ہوتی جا رہی ہے اور اس بات کی متقاضی ہے کہ اپنے تمام تر وسائل کو بروئے کار لا کر اس خطرے کا سد باب کرنے کی سعی کریں کیونکہ نظریات سے عاری نظام حکمرانی دباؤ برداشت نہیں کر سکتا۔

اللہ تعالی نے ہمیں اپنے لئے نظام حکمرانی کے انتخاب کا اختیار دیا ہے جس کی بنیاد قرآن و سنہ کے زریں اصولوں پر قائم ہونا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم نے قرآن و سنہ کو پس پشت ڈالتے ہوئے مغربی جمہوریت کو فوقیت دی۔ ماضی کی کسی حکومت نے ملک کی نظریاتی سرحدوں کو مضبوط بنانے کی طرف دھیان دیا نہ ہی متعدد مذہبی جماعتوں کو یہ توفیق ہوئی کہ حکومتوں کی توجہ اس جانب مبذول کراتیں۔ ہم اپنے بچوں کو مسلم شناخت دینے میں ناکام رہے ہیں کیونکہ ہمارا نظام تعلیم قرآن و سنہ کی تعلیمات سے عاری ہے۔

قومی ایکشن پلان سے ایسا تاثر ملتا ہے کہ پاکستان میں دہشت گردی کی بنیادی وجہ

مذہب ہے جو ایک بیمار ذہنیت کی اختراع ہے جس نے ہمارے معاشرے کو سیاسی و معاشرتی ،لبرل، روشن خیال اور قوم پرست مذہبی گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ لبرل اور سیکولر طبقہ اکثریت میں ہونے کی وجہ سے سیاسی طور پر اہمیت کا حامل ہے۔ مذہبی طبقہ بے بسی کی علامت بن چکا ہے جس کی سیاست میں کوئی جگہ بنتی نظر نہیں آ رہی اور نہ ہی پالیسی فیصلوں میں اس کی کوئی اہمیت ہے کیونکہ ہمارے لوگ انہیں ووٹ دینا پسند نہیں کرتے لیکن حیرت ہے کہ اس کے باوجود اسی طبقے کو ملک میں دہشت گردی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

نظریاتی تفریق کو ہوا دینے کے لئے ہماری نظریاتی اساس پر کھلا حملہ کیا گیا ہے۔ 2008ء میں اوبامہ کے دور میں جان کیری نے اعلان کیا کہ امریکہ نے "پاکستانی قوم کی نظریاتی درستگی کے لئے ڈیڑھ ارب ڈالر کی رقم مختص کی ہے جو براہ راست اداروں، این جی اوز اور شخصیات کو دی جائے گی۔" اس کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے۔

اس سنگین مسئلے کا ایک سادہ سا حل موجود ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہماری دینی جماعتیں جو پچھلے ستر سالوں سے قومی سیاست اور معاملات سے لاتعلق رہی ہیں، ان کے لئے لازم ہے کہ اب قومی سیاسی دھارے میں شامل ہو کر جمہوری طریقے سے اس خرابی کو دور کریں۔ الحمدللہ، اب مولانا فضل الرحمن یہ مقدس مشن لے کر میدان میں آ چکے ہیں اور کامیابی کی طرف گامزن ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ اگلے انتخابات میں مولانا اور ان کے اتحادی قومی اسمبلی کی کم از کم 25 سے 30 سیٹیں جیتنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ان چند سیٹوں کو بڑی اہم پوزیشن حاصل ہو گی جس سے وہ قوم کے نظریہ حیات کو صحیح مقام پر رکھنے میں کامیاب ہوں گے۔ انشاءاللہ

پاکستان معتدل اسلامی معاشرے کی اعلی ترین مثال ہے جہاں ہر مذہبی مکتبہ فکر کے لوگ بستے ہیں جن میں خارجی، تکفیری، سلفی، وہابی، قادری، نقشبندی، دیوبندی، بریلوی، شیعہ اور سنی شامل ہیں لیکن بدقسمتی سے سیاسی و نظریاتی صلیبی جنگ نے معتدل مسلم معاشرے کے روشن چہرے کو داغدار کر دیا ہے۔ ہمیں اس صورت حال کا مداوا کرنے کے لئے صرف ایک سادہ سا فیصلہ کرنا ہو گا جو ہمارے قومی نظریہ حیات کے مطابق ہو۔ ہماری پارلیمنٹ کو ایک

قانون کی منظوری دینا ہوگی کہ تمام اردو اور انگلش میڈیم سکولوں میں تیسری جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک دینی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے۔ صرف یہی ایک ایسا راستہ ہے جس سے ہمارے قومی نظریہ حیات کی دونوں شرائط پوری ہو سکتی ہیں اور جمہوریت ہمارا نظام حکومت ہوگا جس کی بنیادیں قرآن وسنہ کے اصولوں پر قائم ہوں گی۔

ہمارے پڑوس میں ایران میں ایسا نظام حکومت قائم ہے جسے ولایت فقیہہ کا نام دیا گیا ہے جس کی بنیادیں قرآن وسنہ کے اصولوں پر قائم ہیں۔ یہ نظام ایرانی قوم کو اسلام دشمن قوتوں اور سیاسی و اقتصادی پابندیوں کے خلاف لڑنے کا عزم اور حوصلہ دیتا ہے۔ اسی طرح افغانوں نے اسلامی جمہوری ریاستی نظام کا علم اٹھاتے ہوئے گذشتہ تین دہائیوں میں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کو عبرتناک شکست سے دوچار کیا ہے اور اپنے اس عزم پر سختی سے قائم ہیں کہ قابض فوجوں کا ایجنڈا ان کے لئے ناقابل قبول ہے کیونکہ ایسا کرنا ان کی قومی اقدار ملی غیرت رسم ورواج اور نظریات کے خلاف ہے۔ یہ نظریہ ہی وہ قوت ہے جسے دوام حاصل ہے۔

اسلامی نظام کی بنیادوں کی حفاظت:

سوال: آپ نے کہا ہے کہ ایران، پاکستان اور افغانستان ایک موثر اسلامی اتحاد تشکیل دے سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ مغربی دنیا اسے برداشت نہیں کرے گی اور وہ مسلم ممالک کو نقصان پہنچانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔ جیسا کہ وہ ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ مسلم ممالک اپنے اسلامی نظام کی بنیادوں کی حفاظت کیسے کر سکتے ہیں؟

جواب: دنیائے اسلام کے رہنما ان سازشوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ ایرانی رہنماء روح اللہ خمینی نے اپنے اعلی پائے کے ایٹمی سائنسدان محسن فخری زادہ کے قتل پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ انہیں ایرانی ایٹمی پروگرام کی وجہ سے قتل نہیں کیا گیا بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ "ہمارے دشمن ہمارے اسلامی نظام کی بنیادوں کے مخالف ہیں جس کی وجہ سے وہ کبھی اس دشمنی سے باز نہیں آئیں گے"۔

یہ بنیادی سچائی ہے۔ اسی سازش کے نتیجے میں ایران افغانستان اور پاکستان سنگین

اثرات بھگت رہے ہیں اور اپنی قومی اقدار اور ایمان و یقین کے تحفظ کی بڑی قربانیاں دی ہیں مثلا پچھلی چار دہائیوں سے ایران اس سازش کا بڑی ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کر رہا ہے۔ پہلے حربے میں امریکہ کو ایرانی انقلابیوں کی گرفت سے اپنے یرغمالیوں کو آزاد کرانے میں ناکامی ہوئی اور اس مقصد کے لئے کی جانے والی کاروائی خود ان کی اپنی تباہی کا سبب بنی۔ اس کے بعد انہوں نے صدام حسین کی ہمت بندھائی کہ وہ ایران پر حملہ کرے جس کے نتیجے میں آٹھ سالہ طویل جنگ ہوئی اور دونوں جانب بے گناہ مسلمانوں کا خون بہتا رہا اور جب ایران نے شط العرب عبور کیا تو صدام حسین نے مہذب دنیا کی طرف سے فراہم کئے جانے والے کیمیائی ہتھیاروں سے حملہ کر دیا۔ اس کے بعد ایران کو اقتصادی طور پر اپاہج بنانے کیلئے ایران کو طرح طرح کی پابندیوں میں جکڑ دیا گیا جس کا گذشتہ تیس برسوں سے ایرانی قوم جوانمردی سے سامنا کر رہی ہے لیکن ان کے عزم و استقلال کو نہیں توڑ سکیں۔ ایران کو سزا دینے کی خاطر اس سال کے شروع میں وارسا پلان (Warsaw Plan) کے تحت ایک اتحاد بنایا گیا جس کے بعد صدر ٹرمپ نے ایرانی جنرل قاسم سلیمانی کو ٹارگٹ کر کے قتل کرایا۔ ایران نے جوابی کاروائی کرتے ہوئے امریکہ اور اسرائیل کی بجائے سعودی عرب پر حملہ کیا جو ایک معروف امریکی صحافی کے بقول معمولی نوعیت کی کاروائی نہیں تھی:

> "14 ستمبر 2019ء کو علی الصبح ایرانی ائرفورس نے عبقیق (Abqaiq) میں واقع سعودی عرب کے تیل کی اہم تنصیبات پر بیس (20) ڈرونز اور درست نشانے پر لگنے والے کروز میزائلوں (precision guided missiles) سے حملہ کیا جس میں سعودی عرب کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ یہ تعجب خیز نوعیت کی کاروائی تھی۔ ایرانی ڈرونز اور میزائلوں نے اس خاموشی سے نچلی پرواز کرتے ہوئے حملہ کیا کہ امریکی اور سعودی ریڈار بھی ان کا سراغ نہ لگا سکے۔ ایک اسرائیلی عسکری تجزیہ نگار کہتا ہے کہ وہ ایران کی ان صلاحیتوں کو دیکھ کر دنگ رہ گئے' جو مشرق وسطی میں پرل ہاربر (Pearl Harbor) کی طرز کا حیران کن حملہ تھا۔"

7 دسمبر 1941ء کو پرل ہاربر پر حملے کے بعد امریکہ دوسری عالمی جنگ میں شامل ہوا تھا لیکن ابقیق پر حملے کے بعد ٹرمپ سعودی عرب کی مدد کو نہ آئے بلکہ محض تین ہزار کا علامتی فوجی دستہ بھیج کر اس امر کو یقینی بنایا ہے کہ "ہم جو کچھ ان کے لئے کر رہے ہیں وہ اس کی قیمت ادا کرتے رہیں گے' یہی ہماری اولین ترجیح ہے۔"

2006ء میں حزب اللہ اسرائیل جنگ میں حزب اللہ نے چند ہزار فری فلائٹ راکٹوں کے حملے کر کے اسرائیل کو شکست دی تھی۔ اب ایران اور اس کے اتحادی بھی چند ملین فری فلائٹ راکٹ اور درست نشانہ پر لگنے والے ایرانی میزائلوں کی صلاحیت حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں خودکش بمبار بھی اس جنگ میں شامل ہونے کے حکم کے بیتابی سے منتظر ہیں۔

جہاں تک ایران کے ایٹمی پروگرام کی تیاری کی بات ہے تو اس سلسلے میں صدر ٹرمپ نے ایران کے ساتھ کئے جانے والے ایٹمی معاہدے سے دستبردار ہو کر ایران کی مدد کی ہے جس سے حوصلہ پا کر ایران نے ایٹم بم کے لئے یورینیم کی افزودگی کا عمل جاری رکھا ہے۔ اسی طرح امریکہ نے افغانستان میں روسی جارحیت کے خلاف پاکستان کو شامل کر کے پاکستان کی بھی مدد کی تھی۔ اس دوران پاکستان نے یورینیم کی افزودگی کا عمل جاری رکھا اور ایٹم بم تیار کر لیا۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ پاکستان کے ایٹم بم بنانے کے حوالے سے "امریکی نگران" کی مثبت رپورٹ کے باوجود امریکی صدر سال بہ سال کانگریس کو یقین دلاتے رہے کہ "پاکستان ابھی تک اس منزل تک نہیں پہنچا کہ ایٹم بم بنا سکے۔"

گذشتہ چار دہائیوں سے افغانی قوم نے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کے خلاف برسرپیکار رہتے ہوئے انہیں شکست دی ہے اور اپنے اسلامی نظام کی بنیادوں کا تحفظ کیا ہے۔ 1989ء میں جب روس پسپا ہوا تو افغان مجاہدین کو اسلامی حکومت بنانے کے حق سے محروم کر دیا گیا اور وہاں خانہ جنگی کرائی گئی جس کی کوکھ سے 2001ء میں طالبان نے جنم لیا۔ امریکہ نے افغانستان پر قبضہ کرنے کی خاطر جبر و تشدد کی حکمت عملی جاری رکھی تاکہ

طالبان کو مجبور کیا جا سکے کہ وہ افغانستان میں اسلامی امارات کے قیام کے مقصد سے پیچھے ہٹ جائیں لیکن طالبان ان کا حکم ماننے کے لئے تیار نہ ہوئے کیونکہ ملا عمر کے بقول "جس طرح 1990ء میں امریکہ اور پاکستان' دونوں نے ہمیں دھوکہ دیا تھا' اب ہمیں دوبارہ دھوکہ نہیں دیا جا سکتا۔"

افغانیوں نے اپنے اسلامی نظام کی بنیادوں کے تحفظ کی بڑی بھاری قیمت چکائی ہے اور دنیا کی دو سپر پاورز کے خلاف کامیاب مزاحمت کا نیا باب رقم کیا ہے جو منفرد نوعیت کا ہے اور اپنے ایمان و یقین' قومی روایات و اقدار کے تحفظ کی خاطر' انسانی جدوجہد کی تاریخ میں ایسی مزاحمت کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ماشاء اللہ۔ طالبان کو کوئی جلدی نہیں کہ امریکی فوجیں کب افغانستان سے نکلتی ہیں کیونکہ "وقت ان کے ہاتھ میں ہے جبکہ دشمن کی دسترس محض گھڑی تک محدود ہے۔" زمینی حقائق سے صاف عیاں ہے کہ طالبان مطمئن ہیں' جیسا کہ ایک معروف پاکستانی تجزیہ نگار کے ان الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے:

"اب بھی ملک کے زیادہ تر دیہی علاقے طالبان کے قبضے میں ہیں جہاں ان کی اپنی خودساختہ حکومت ہے' ٹیکس وہ خود وصول کرتے ہیں' راتوں کو ان کا راج ہوتا ہے اور اسلامی ریاست (آئی ایس آئی ایس) کے خلاف دفاعی حصار ہیں' جس کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہوں نے مارچ 2020ء میں کنڑ اور اس کے مضافات سے اسلامی ریاست کو بے دخل کیا تھا۔ اور اگر 2011ء میں دنیا کے تقریباً پچاس (50) طاقتور ممالک کے ایک لاکھ پچاس ہزار (150,000) سے زائد فوجی دستے دو دہائیوں تک افغانستان میں امن نہیں قائم کر سکے تو دو ہزار فوجیوں کی کیا اوقات ہے؟ کابل کی حکومت مصنوعی اور عارضی سہاروں پر قائم ہے اور امریکہ کے نومنتخب صدر مزید مدت تک کھلی اجازت دینے کے لئے رضامند نظر نہیں آتے۔

پاکستان اپنے اسلامی نظام کی بنیادوں کو تحفظ دینے میں ناکام رہا ہے کیونکہ دنیا کے نقشے

پر ابھرتے ہی اس نے سرد جنگ میں شمولیت اختیار کر کے امریکہ کی طرفداری کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے سے امریکہ نے ہمارے سیاسی اور سلامتی کے نظام پر کنٹرول حاصل کر لیا جس کی وجہ سے پاکستان میں نہ تو جمہوریت پنپ سکی اور نہ ہی صحت مند معاشرتی نظام قائم ہو سکا ہے۔ لیکن افسوس ناک بات یہ تھی کہ جب امریکہ نے پاکستانی قوم کی ذہنیت سازی (Perception Management) کے لئے 1.4 بلین ڈالر کی خطیر رقم مختص کی' اور' ریڈ انڈین' سمجھتے ہوئے ہمیں نظم و ضبط سکھانا چاہا تو ہمارے منتخب حکمرانوں نے خوشدلی سے یہ رقم اداروں' غیر حکومتی اداروں (NGOs) اور ہر ایسے شخص کو جو مقصد کے حصول کو یقینی بنانے کا اہل ہو' ان میں تقسیم کرنے کی اجازت دے دی۔ اسی کے نتیجے میں ہمارے تعلیم یافتہ طبقے میں ایسی ذہنیت ابھری ہے جو لبرل ازم (Liberlaism) اور سیکولر ازم (Secularism) جیسے سماجی نظام کی بات کرتے ہیں جس کا محور اللہ تعالیٰ کی ذات کی بجائے انسان کی اپنی ذات ہے۔ نعوذ باللہ۔

یہ ایک المیہ ہے جس سے پاکستان کے سماجی و معاشرتی نظام پر انتہائی مہلک اثرات مرتب ہوئے ہیں اور ہمارا سیاسی نظام بری طرح افراتفری کا شکار ہے جبکہ ملکی مفادات کا تقاضا ہے کہ ایک منصفانہ جمہوری اور اسلامی نظام کے تحفظ کی خاطر ایسی "سماجی یک جہتی" قائم ہو جو انقلابی ایران اور جہادی افغانستان کے ساتھ مل کر دنیائے اسلام کے اس حصے' جو آج دشمنوں کی زد میں ہے' کے تحفظ کے لئے انتہائی ضروری سلامتی کی تذویراتی گہرائی (Strategic Depth of Security) کی چھتری مہیا کر سکے۔

پاکستان میں سیاسی عدم استحکام کے اسباب:

سوال:...... قیام پاکستان سے لے کر اب تک ہمارے ملک کو وہ استحکام حاصل نہیں ہوا جو اس کا حق بنتا تھا۔ مسائل اور مشکلات سے گذرتے ہوئے ہم نے آدھا ملک گنوا دیا اور اب وہ بنگلہ دیش کے نام سے الگ ملک ہے۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان ایک 'ناکام ریاست' ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے اور اس کے کیا اسباب ہیں اور کس طرح ہم پاکستان کو صحیح سمت دے سکتے ہیں؟

جواب:...... دراصل اس کا بنیادی سبب ہماری اپنی اندرونی کمزوریاں ہیں جن کو ابھی تک ہم دور نہیں کر سکے اور نہ ہی ہم نے ماضی میں کی جانے والی غلطیوں سے سبق سیکھا ہے۔ ہماری سب سے بڑی کمزوری جمہوری نظام میں اکثریت کی اہمیت کو نہ سمجھنا ہے اور اس پر عمل پیرا نہ ہونا ہے۔ یعنی اکثریت کے جبر (Tyranny of Majority) کو تسلیم نہیں کرتے۔

قائداعظم محمد علی جناح اور تحریک پاکستان کے قائدین نے ملک کے لئے ایسے جمہوری نظام کا وعدہ تھا کیا جس کی بنیادیں قرآن و سنہ کے سنہری اصولوں پر قائم ہوں۔ یہی وہ بنیادی فیصلہ تھا جس کی روشنی میں 1973ء میں وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستانی قوم کے نظریہ حیات کی ترجمانی کرتے ہوئے آئین میں اس کی تشریح کی' یعنی جمہوری نظام کے قیام اور اس کی مضبوطی کا وعدہ کیا جو مرکزی تصور ہے اور یہ تصور اکثریت کے بنیادی اصول پر قائم ہوتا ہے۔ اگر ایک جماعت کو صرف ایک نشست کی برتری حاصل ہوتی ہے تو وہ حکومت بنا سکتی ہے جیسا کہ ایک امیدوار کو صرف ایک ووٹ کی اکثریت پر فاتح قرار دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کو "اکثریت کا جبر" کہا جاتا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اس حقیقت سے انحراف کیا جس کے سبب مشرقی پاکستان ہم سے الگ ہو گیا۔

مشرقی پاکستان پورے ملک کی مجموعی آبادی کا 53 فیصد تھا۔ اس کی اکثریت کو ہماری قیادت نے تسلیم نہیں کیا۔ قائداعظم کے بعد اگر کسی کو حکومت بنانے اور وزیراعظم بننے کا حق تھا تو مشرقی پاکستان کے اے کے فضل حق جیسے بالغ نظر قائدین موجود تھے جو وزیراعظم بننے کے لئے موزوں ترین شخصیت تھے مگر مغربی پاکستان کے قائدین نے انہیں ان کے جائز حق سے محروم رکھا۔ جب 1954ء کے انتخابات ہوئے تو مشرقی پاکستان سے حسین شہید سہروردی' مولانا بھاشانی اور اے کے فضل حق اور شیخ مجیب الرحمٰن جیسے قائدین نے بھرپور حصہ لیا اور پورے ملک کی بنیاد پر اکثریت حاصل کی لیکن اس کے باوجود انہیں حکومت بنانے کی اجازت نہیں دی گئی۔

اسی طرح 1965ء میں محترمہ فاطمہ جناح نے مشرقی پاکستان سے اکثریت حاصل کی

لیکن دھاندلی کے ذریعے انہیں ہرادیا گیا۔ 1970ء میں جب جنرل یحییٰ خان نے انتخابات کرائے تو مشرقی پاکستان سے شیخ مجیب الرحمٰن کی جماعت عوامی لیگ کو مجموعی طور پر واضح اکثریت ملی۔ یحییٰ خان نے مشرقی پاکستان کے دورے میں قومی اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ کو ڈھاکہ میں بلائے جانے کا اعلان کیا لیکن مغربی پاکستان واپس آ کر وہ اس اعلان سے پھر گئے جس کے بعد مشرقی پاکستان میں حالات خراب ہوئے اور بغاوت شروع ہوئی جس کے نتیجے میں مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہو گیا۔ جمہوریت کا مطلب ہی اکثریت کی رائے کا احترام ہے' یعنی ''ووٹ کا تقدس۔''

ہمارے قومی اداروں کی کمزوری اور سیاستدانوں میں سیاسی اصولوں کی پاسداری کا فقدان ہے' جسے سیاسی ناپختگی بھی کہا جا سکتا ہے' جو ہمارے سیاسی وقومی معاملات پر بری طرح اثر انداز ہے۔ مثلاً' امریکہ نے فوج' عدلیہ' انتظامیہ اور چند سیاسی جماعتوں کو ساتھ ملا کر چار مرتبہ ہمارے ملک میں فوجی حکومتیں قائم کیں۔ یہاں تک کہ 2007ء میں مشرف کی بنائی ہوئی حکمت عملی کے تحت جمہوری طریقے سے نظام کی تبدیلی کا فیصلہ کیا گیا تو سازش ناکام ہوئی کیونکہ اس وقت کی فوجی قیادت نے اس مکروہ کھیل کا حصہ بننے سے انکار کر دیا تھا اور جب انتخابات ہوئے تو مشرف کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور پیپلز پارٹی نے حکومت بنائی جبکہ پنجاب میں مسلم لیگ (ن) کی حکومت قائم ہوئی جس سے امریکی ایوانوں میں ہلچل مچ گئی۔ اسی روز معروف امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ نے اپنے اداریے میں امریکی پالیسی سازوں کی مذمت کی جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

پنجاب کی اکثریت ہمیشہ مقتدر قوتوں کی نگاہوں میں کھٹکتی رہی ہے۔ اسی بات کے پیش نظر ہمارے ملک کی سیاست میں اتار چڑھاؤ نظر آتا ہے۔ ہماری اس کمزوری کو بار بار ہمارے دوست نما دشمنوں نے ابھارا ہے اور اپنے مفادات حاصل کئے ہیں حالانکہ کام بہت آسان ہے کہ قومی اسمبلی فیصلہ کرے کہ ہمارے سیاسی نظام میں جو کمزوریاں اور خرابیاں ہیں انہیں درست کر لیا جائے یعنی بجائے چار صوبوں کے مزید صوبے بنا دیے جائیں تاکہ

پورے ملک میں سیاسی توازن قائم ہو اور ہمارے دشمنوں کو اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملے۔

اسی کمزوری کا نتیجہ ہے کہ پاکستان بننے سے آج تک ہمارے چھوٹے صوبوں میں معمولی اختلافات' جو باہمی افہام وتفہیم سے بخوبی حل کئے جا سکتے تھے' انہیں طاقت کے بل بوتے پر حل کرنے کی کوششیں کی جاتی رہیں۔ بلوچستان' وزیرستان' باجوڑ اور فاٹا جیسے علاقوں میں سیاسی معاملات کو عسکری قوت کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی گئی حالانکہ ہم مشرقی پاکستان کے سیاسی معاملات کو عسکری قوت کے ذریعے حل کرنے کا خطرناک تجربہ کر چکے تھے جو ہمارے لئے مشعل راہ ہو سکتا تھا۔

تحریک پاکستان خالصتاً ایک سیاسی تحریک تھی جو قائداعظم محمد علی جناح اور ان کے ساتھیوں کی سیاسی بصیرت کا کمال تھا جنہوں نے ایک خالص' پرامن اور منظم سیاسی تحریک کے ذریعے ملک کو آزادی دلوائی۔ ہم مسلمانوں پر' خواہ وہ ہندوستان کے کسی بھی حصے میں ہوں' دین کے حوالے سے کوئی پابندی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی سختی تھی' اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت کی تمام دینی جماعتیں تحریک پاکستان میں شامل نہیں ہوئیں سوائے مولانا شبیر احمد عثمانی کی جماعت جمعیت علمائے اسلام کے جنہوں نے جماعت سے الگ ہو کر تحریک پاکستان میں قائداعظم کا ساتھ دیا۔

پاکستان کا مطالبہ بنیادی طور پر مسلمان اکثریتی علاقوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا تاکہ انگریزوں کے جانے کے بعد جو خوف تھا کہ ہندو اکثریت معاشرتی واقتصادی طور پر مسلمانوں پر جبر کرے گی وہ ختم کیا جا سکے جیسا کہ آج ہم نریندر مودی کے دور میں دیکھ رہے ہیں لیکن قائداعظم کی دوررس نگاہوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا کہ جس طرح بھارتی حکومت نے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے خصوصاً کشمیری مسلمانوں کو کس قدر اذیتیں دی جا رہی ہیں جو گذشتہ ستر (70) سالوں سے اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

ہماری سیاسی جماعتیں' دینی جماعتوں کو تمام خرابیوں کا سبب سمجھتی ہیں۔ اس لئے کہ

ملک میں موجود دو درجن سے زائد دینی جماعتوں کا حکومت بنانے اور چلانے میں کوئی کردار نہیں ہے۔ وہ ایک نظر انداز شدہ قوت ہیں لیکن اس کے باوجود ہماری تمام سیاسی جماعتوں پر ہر وقت ان کا خوف طاری رہتا ہے۔ ان دینی جماعتوں کو جب تک قومی سیاسی دھارے میں نہیں لایا جائے گا ہماری قوم میں معاشرتی انتشار قائم رہے گا۔ قصور ہمارے مدرسوں کا نہیں ہے بلکہ ہماری بے راہ رو سیاسی سوچ وعمل کا ہے۔

ہمارا اپنے قومی نظریہ حیات سے انحراف خطرناک علامت ہے جبکہ ہمارے آئین میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ ملک کا نظام حکومت 'جمہوریت' ہوگا جس کی بنیادیں قرآن و سنہ کے زریں اصولوں پر قائم ہوں گی لیکن اب تک جتنی بھی حکومتیں آئی ہیں تمام کا زور صرف جمہوریت پر ہی رہا ہے اور قرآن وسنہ کو پس پشت ڈالے رکھا ہے۔ دین کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ قوم کو ملائیت کی جانب راغب کیا جائے بلکہ صرف وہ بنیادی تعلیم ہے جو ہر مسلمان کو دی جانی لازم ہے اور اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم اپنے تمام سکولوں میں دینی نصاب تعلیم رائج کریں جو 1973ء کے آئین میں لازم قرار دیا گیا ہے تاکہ ہر پاکستانی کو اپنی پہچان مل سکے ورنہ آج ہمارے معاشرے میں جو نظریاتی اختلاف موجود ہے وہ قوم کو ابتری کی جانب لے جا رہا ہے۔ ایسی ابتری جو 1965ء میں انڈونیشیا میں خانہ جنگی کا باعث بنی تھی جس میں لاکھوں لوگ قتل ہوئے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کمزوری لاعلاج ہو جائے۔

امریکہ کو ہماری کمزوریوں کا ادراک شروع دن سے ہی تھا اور انہی کمزوریوں کو ابھار کر وہ اپنے مقاصد حاصل کرتا رہا ہے جس سے ہمارے قومی مفادات کو سخت نقصان پہنچا ہے۔ یہاں تک کہ ہم امریکی مفادات کی جنگ لڑتے رہے ہیں۔ کبھی امریکہ کے ساتھ مل کر روس کے خلاف جنگ کی اور کبھی امریکہ کی خوشنودی کی خاطر برادر اسلامی ملک افغانستان کے خلاف جنگ میں شامل ہوئے۔ ان غلط فیصلوں کے نتیجے میں ہم پر دہشت گردی کا عذاب مسلط ہے جس کے تدارک کی کوششوں میں ہم نے ہزاروں لوگوں کی جانیں قربان کیں اور پھر بھی ہم سے تقاضا ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر رہے اور مطالبہ کیا جاتا ہے کہ

غیور افغان قوم کو امریکہ اور اس کے مسلط کردہ حکمران اشرف غنی کی حکومت کے ساتھ مذاکرات کی میز پر لائیں۔

یہ ایسے مطالبات ہیں جنہیں پورا کرنا ہمارے لئے بہت مشکل ہے کیونکہ ہم نے غیروں کے ساتھ مل کر افغان قوم کے ساتھ جنگ کی ہے اور ہم نے ان سے ترک تعلق کر لیا۔ یہاں تک کہ افغانی جو دشمن کے خلاف جنگ کر رہے تھے ان کے خاندان والوں کو 2010ء کی دہائی میں پاکستان سے نکالا تو افغانوں کا ہم سے ناراض ہونا ایک فطری بات تھی' جو ہماری حکومتوں کی اس احمقانہ پالیسی کا قدرتی رد عمل تھا۔ ایران کی حکومت نے افغانیوں کا ساتھ دیا' ان کے خاندانوں کو تحفظ دیا اور ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ آج امریکہ افغانوں کے ساتھ معاملات طے کرنا چاہتا ہے مگر ہماری صلاحیتیں محدود ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں ترکی' روس اور چین کی مدد درکار ہوگی۔ قدرت نے ہمیں ایک موقع دیا ہے کہ اپنی غلطیوں کا مداوا کر سکیں اور افغان بھائیوں کے ساتھ مل کر افغانستان میں قیام امن کی کوششوں میں کامیابی حاصل کریں۔

موجودہ دور میں نظام حکومت چلانا آسان کام نہیں ہے جبکہ ہماری حکومتیں قومی معاملات کو کبھی "کچن کیبنٹ" کبھی "کور کمیٹی" اور کبھی عارضی گروپ (Adhoc Group) کے ذریعے چلاتی رہی ہیں جبکہ مہذب جمہوری حکومتوں نے نیشنل سکیورٹی کونسل کو ذمہ داریاں دی ہوئی ہوتی ہیں۔ نیشنل سکیورٹی کونسل ملک کے تمام تحقیقی اداروں' منتخب ٹیکنوکریٹس اور متعلقہ ماہرین کی مدد سے تمام ملکی مسائل پر غور کر کے حکومت کو اپنی سفارشات پیش کرتی ہے اور حکومت کا سربراہ اپنے وسائل اور حالات کو دیکھتے ہوئے عمل درآمد کا فیصلہ کرتا ہے۔ آج سے تقریباً بیس سال قبل بھارت نے اس طرح کی نیشنل سکیورٹی کونسل تشکیل دی اور فوائد حاصل کئے۔ اس طرح سے حاصل ہونے والی مکمل دانشورانہ رائے کے ذریعے نالج بیسڈ (Knowledge based) پالیسی سازی ممکن ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ہمارے حکمران نیشنل سکیورٹی کونسل کے نام سے الرجک اور خوفزدہ ہیں۔

ہماری ایک کمزوری یہ بھی ہے کہ ہم زمینی حقائق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور

حقائق کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے ہیں۔ جب تک کوئی قوم اپنے نظریہ حیات کے مطابق اپنے معاملات کو نہیں چلاتی اس وقت تک اسے قوموں کی برادری میں باعزت مقام حاصل نہیں ہوتا۔ ہمارے نظریہ حیات کی تشریح ہمارے آئین میں موجود ہے لیکن ہم اس سے مسلسل انحراف کرتے رہے ہیں۔ ہمیں اب اس روش کو ترک کرنا ہوگا۔ جب تک ہم اپنی اصل (دین اسلام) سے نہیں جڑیں گے تب تک حالات میں بہتری کی توقع دیوانے کے خواب کے مترادف ہوگی۔

ہم جمہوریت' جمہوریت کا راگ الاپتے تو تھکتے نہیں لیکن ابھی تک جمہوریت کا مطلب ہی نہیں سمجھ پائے۔ ہمیں نہ تو ووٹ کے تقدس کا لحاظ رکھنا آیا اور نہ ہی عوامی رائے کا احترام کرنا سیکھا ہے۔ جمہوریت میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں لیکن ہم نے عوامی رائے کو پس پشت ڈالنے کے نت نئے طریقے ایجاد کئے اور من پسند نتائج حاصل کرنے کے لیے قومی اداروں کو ساتھ ملا کر عوامی مینڈیٹ پر ڈاکہ ڈالنے کی راہ اختیار کر رکھی ہے۔

حد تو یہ ہے کہ غیرملکی آقاؤں کی خوشنودی سے اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کے لئے ہماری اسٹیبلشمنٹ بھی اس بھیانک کھیل میں شامل رہی ہے۔ مقتدر قوتوں کی جانب سے چھوٹے صوبوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی اور ان کے حقوق کی پامالی بھی ایک اہم وجہ ہے۔ ہم نے کبھی ان کے مسائل کو سمجھا ہی نہیں اور اگر سمجھا بھی ہے تو ان کو حل کرنے کے لئے ان سے بات چیت کرنے کی راہ اپنانے کی بجائے ان کے خلاف لشکر کشی کی اور طاقت کے بل بوتے پر انہیں تابع بنانا چاہا' جو موجودہ تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ اگر آج بھی ہم بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کے نظریہ پاکستان پر عمل پیرا ہونے کا تہیہ کر لیں تو ہمارے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ قائداعظم نے 1947ء کو پہلی قانون ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

''آپ کا تعلق چاہے کسی مذہب' فرقے یا برادری سے ہو' اصولوں پر اس کا کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ پاکستانی شہری ہونے کی حیثیت سے تمام شہریوں کو برابری

کی سطح پر حقوق حاصل ہوں گے۔''

یہ ہیں وہ اہم مسائل جو فوری توجہ کے متقاضی ہیں' جنہیں حل کرنے کے لئے ہمیں اپنے ذاتی مفادات سے آگے بڑھ کر قومی مفادات کو اہمیت دینا ہوگی۔ ارادے کی مضبوطی اور خلوص نیت شرط ہے۔ ہمارے پڑوس میں دو قوموں کی روشن مثال ہمارے سامنے ہے کہ جن کے دلوں میں ان کا نظریہ حیات زندہ ہے اور انہوں نے بڑی ہمت اور عزم کے ساتھ اپنے قومی مفادات کا تحفظ کیا ہے۔ افغان قوم نے چند دہائیوں کی مدت میں دنیا کی ہر بڑی سے بڑی طاقت کو شکست دی جس کی انسانی تاریخ میں مثال نہیں ملتی اور انہی چند دہائیوں کے دوران ایران نے امریکہ کے ظلم وستم اور مالی وتجارتی بندشوں کے باوجود ایک ہی جھٹکے میں مشرق وسطی کے تذویراتی نظام کو بدل کے رکھ دیا ہے اور اب امریکہ ایران سے مذاکرات کرنے پر مجبور ہے۔

سوال:...... 17 اگست 1988ء کو آپ کی سربراہی میں عسکری قیادت نے عنان اقتدار چیئرمین سینیٹ کے حوالے کر دیا تھا جو آئینی طریقہ تھا جبکہ 1969ء میں جنرل ایوب خان جب اقتدار سے الگ ہوئے تو انہوں نے اقتدار چیئرمین سینیٹ کی بجائے جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر دیا۔ اس پر آپ کیا کہیں گے؟

جواب:...... اس کی سب سے بڑی وجہ سیاستدانوں پر عدم اعتماد تھا کہ 25 مارچ 1969ء کو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے مستعفی ہو کر اقتدار آرمی چیف جنرل یحییٰ خان کے سپرد کر دیا جنہوں نے مارشل لاء قائم رکھا۔ ایوب خان نے قومی نشریاتی رابطے پر اعلان کیا کہ ملک میں امن و امان کی بگڑتی ہوئی صورت حال کے پیش نظر اقتدار سے الگ ہو رہا ہوں۔ اس طرح ملک میں ان کے دس سالہ اقتدار کا خاتمہ ہوا جو 27 اکتوبر 1958ء کو سیاسی افراتفری کی وجہ سے رونما ہوا تھا۔ مستعفی ہونے سے پہلے جنرل ایوب خان نے جنرل یحییٰ خان کے نام خط لکھا جس میں انہوں نے سول ملٹری تعلقات کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔

میرے عزیز جنرل یحییٰ

مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ اس وقت ملک کی تمام سول انتظامیہ اور آئینی ادارے غیر موثر ہو چکے ہیں۔ اگر صورت حال اسی طرح زوال پذیر رہی تو ہماری مہذب بقاء ممکن نہیں رہے گی۔ میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ اقتدار سے الگ ہو جاؤں اور نظام مملکت پاکستان کی وفاقی افواج کے حوالے کر دوں جو اس وقت ملک کا واحد آئینی اور موثر ادارہ ہیں اور ملک کا کنٹرول سنبھال سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے وہ ایسی صلاحیت رکھتے ہیں کہ ملک کو ابتری اور مکمل تباہی کی صورت حال سے نکال سکیں۔ وہ تنہا ملک میں امن قائم کر سکتے ہیں اور ملک کو دوبارہ مہذب اور آئینی طریقے سے ترقی کی راہ پر گامزن کر سکتے ہیں۔ ہمارے لئے دین اور بنیادی اصولوں پر مبنی جمہوریت کی بحالی' امن و امان اور عوامی ضروریات کی پاسداری ہماری اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ اسی میں ہمارے عوام کے تحفظ اور بھلائی کا راز پوشیدہ ہے جو اپنے عزم و استقلال کی وجہ سے دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کرنے کی امنگ رکھتے ہیں۔

یہ امر انتہائی باعث دکھ ہے کہ اب جبکہ ہم ایک خوشگوار اور ترقی یافتہ مستقبل کی راہ پر گامزن ہو چکے تھے تو ملک کو بے جا احتجاجوں اور ہنگاموں کی نذر کر دیا گیا ہے۔ اس احتجاج کو آج جائز قرار دیا جا رہا ہے' لیکن وقت بتائے گا کہ یہ بدامنی ایک سوچے سمجھے منصوبے اور پس پردہ عناصر کی شہہ پر پھیلائی گئی ہے۔ انہوں نے حکومت کے لئے ملک میں قانون کی عملداری' نظام مملکت چلانا اور عوام کی جان و مال کی حفاظت کرنا ناممکن بنا دیا ہے۔ سول انتظامیہ اور عوامی اظہار رائے کے ہر عنصر کو بے جا تنقید اور بلیک میلنگ کے ذریعے ناکارہ بنا دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشرتی و اخلاقی اصولوں کا ہر عنصر تباہ ہو چکا ہے جس سے حکومت غیر فعال اور غیر موثر ہو کر رہ گئی ہے۔

ملک کی اقتصادیات تباہ ہو چکی ہیں۔ کاریگروں اور مزدوروں کو لاقانونیت اور ظالمانہ اقدامات اٹھانے کی ترغیب دی جا رہی ہے جبکہ اجرت' تنخواہوں اور مراعات میں اضافے کے مطالبات کی وجہ سے ملکی پیداوار میں شدید کمی واقع ہو رہی ہے۔ برآمدات میں خطرناک حد

تک کمی ہو چکی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ یہ معاملہ جلد ہی ملک میں افراط زر کے اضافے کا باعث بن جائے گا۔ یہ سب گذشتہ چند مہینوں سے جاری احتجاجی تحریک کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ معصوم اور بھولے عوام کی ایک کثیر تعداد ایسے عناصر کی سازشوں کا شکار ہو رہی ہے۔ ہم سے غلطیاں ضرور ہوئی ہیں لیکن جو کچھ ہم نے کیا ہے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ کچھ عناصر چاہتے ہیں کہ جو کچھ میری اور مجھ سے پہلی حکومتوں نے کیا ہے اسے عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا جائے۔ سب سے افسوسناک اور دل شکن بات یہ ہے کہ کچھ ایسے عناصر بھی ہیں جو قائداعظم کی قربانیوں' یعنی قیام پاکستان کی خاطر ان کی کوششوں کو بھی فراموش کرنے کی مذموم سازشوں میں ملوث ہیں۔

میں معاشرتی اور آئینی طریقوں سے موجودہ حالات کو سدھارنے میں ناکام ہو چکا ہوں۔ میں نے احتجاجی قائدین کو ملاقات کی دعوت دی ہے' ان میں سے بہت سے لوگ ایک کانفرنس میں آئے اور میں نے ان کے تمام مطالبات غیر مشروط طور پر تسلیم کر لئے لیکن اس کے باوجود چند عناصر اس کانفرنس میں نہ آئے' اور نہ آنے کی وجہ وہی بہتر بتا سکتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ایک مشترکہ فارمولا تیار کریں لیکن کافی وقت گزرنے کے بعد بھی وہ کوئی فارمولا پیش نہ کر سکے اور بالآخر دو نکات پر متفق ہوئے اور میں نے دونوں مطالبات تسلیم کر لئے۔ اس کے بعد میں نے انہیں پیشکش کی کہ جو معاملات ابھی حل طلب ہیں انہیں انتخابات میں منتخب ہونے والے عوامی نمائندوں کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ میرا کہنا تھا کہ کانفرنس میں موجود وفود چونکہ عوام کے منتخب کردہ نہیں ہیں' لہٰذا انہیں آئینی و معاشرتی معاملات کے بارے فیصلہ کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں جب کہ بعض معاملات پر خود ان کا آپس میں بھی اتفاق نہیں۔

میرا خیال تھا کہ دونوں مطالبات پر غور کرنے کے لئے میں قومی اسمبلی کا اجلاس طلب کروں گا لیکن جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ ایسا کرنا ایک فضول مشق ہوگی کیونکہ اسمبلی کے ممبران آزاد اور با اختیار نہیں ہیں لہٰذا دونوں مطالبات پر ان کے متفق ہونے کا کوئی امکان

نہیں ہے۔ بے شک ممبران اسمبلی کو دھمکیاں دی جارہی ہیں اور مجبور کیا جا رہا ہے کہ وہ یا تو اجلاس کا بائیکاٹ کریں یا ایسی ترمیم کا بل پیش کریں جس سے مرکزی حکومت عملی طور پر ختم ہوجائے' مسلح افواج کا نظام ناکام ہو جائے' ملک کی اقتصادیات تقسیم ہو جائیں' اور پاکستان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایسی صورت حال میں قومی اسمبلی کا اجلاس بلانا' حالات کو مزید بگاڑنے کا سبب بن سکتا ہے کیونکہ دھمکیوں' ہنگاموں اور احتجاج کے ماحول میں بنیادی نوعیت کے مسائل کو حل کرنے کے لئے کوئی کیسے ٹھنڈے دل سے غور کر سکتا ہے۔

اس گھمبیر صورت حال پر قابو پانے میں سول حکومت مکمل طور پر بے بس ہو چکی ہے لہٰذا دفاعی اداروں کا آگے بڑھنا لازم ہے۔ یہ آپ کی قانونی اور آئینی ذمہ داری ہے کہ نہ صرف بیرونی خطرے کی صورت میں ملک کا دفاع کریں بلکہ اندرونی خلفشار اور بدانتظامی کے خلاف بھی ملک کو تحفظ فراہم کریں۔ قوم آپ سے ملک کی سلامتی اور یک جہتی کے تحفظ' امن و امان کے قیام' معاشرتی' اقتصادی اور انتظامی امور کی بحالی کی توقع رکھتی ہے۔ آئیں ایک سو بیس ملین عوام کی اس سرزمین کو امن و امان اور خوشیوں بھری زندگی کی طرف لوٹانے کی سعی کریں۔ مجھے یقین ہے کہ ملک کو جو خطرناک مسائل درپیش ہیں' آپ اپنے جذبہ حب الوطنی' عزم اور استقلال سے ان سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ آپ ایک ایسی فوج کے سربراہ ہیں جس کو دنیا بھر میں عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

پاکستانی فضائیہ اور نیوی میں آپ کے ساتھی بھی عزت والے لوگ ہیں اور آپ کو ان کی حمایت و تائید حاصل ہے۔ پاکستانی مسلح افواج باہم متحد ہو کر ملک کو ٹوٹنے سے بچا سکتی ہیں۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں گا کہ آپ بری' بحری اور فضائیہ کے تمام سپاہیوں کو میرا یہ پیغام پہنچا دیں کہ مجھے ہمیشہ فخر رہے گا کہ میں آپ لوگوں کا حاکم اعلیٰ (Supreme Commander) رہا ہوں۔ ان میں سے ہر ایک کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ مشکل کی اس گھڑی میں سب کو ''محافظین وطن'' کا کردار ادا کرنا ہے۔ قومی مفادات کی پاسداری میں ان کا کردار اسلام کے زریں اصولوں سے مزین ہونا چاہیے۔ طویل عرصے تک ملک کے غیور اور

باہمت عوام کی خدمت کرنا میرے لئے ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کامیابی و کامرانی میں آپ کی نصرت و رہنمائی فرمائے۔ آپ کے غیر متزلزل جذبہ حب الوطنی کی تعریف کرتے ہوئے میں اس بات کا بھی اعتراف کرتا ہوں کہ وطن سے محبت آپ کی زندگی کا جزو لاینفک رہی ہے۔

میں آپ کی کامیابی اور اپنے عوام کی بہتری کے لئے دعا گو ہوں۔

جنرل ایوب خان

نیشنل سیکورٹی کونسل کی افادیت:

سوال:...... نیشنل سیکورٹی کونسل کا قیام کیوں ضروری ہے اور اس کی افادیت کیا ہے؟

جواب:...... نیشنل سیکورٹی کونسل کی افادیت کو ہمارے حکمران آج تک نہیں سمجھ سکے۔ ہر ملک کا اپنا ایک نظریہ حیات ہوتا ہے۔ اگر ملک نظم و ضبط کے مطابق چل رہا ہو تو قومی سلامتی کے تقاضے پورے ہوتے ہیں۔ قومی معاملات میں نظم و ضبط قائم رکھنا کسی ایک فرد یا چند لوگوں کی معاونت سے ممکن نہیں ہے بلکہ اس مقصد کے حصول کے لئے چند بنیادی اصولوں پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لئے مختلف ممالک میں مختلف طریق کار اختیار کئے گئے ہیں۔ مثلاً آج سے تقریباً بیس سال قبل بھارت نے ایک ایسا طریق کار اختیار کیا ہے جو چند ترامیم کے ساتھ ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے' مثلاً:

☆ کسی معتبر شخص کو قومی سلامتی کا مشیر مقرر کرنا ضروری ہے۔

☆ نیشنل سیکورٹی ایڈوائزر کے تحت ملک کے متعلقہ تحقیقی ادارے' دانشور' ہنرمند اور باصلاحیت لوگوں کے تعاون سے سال کے بارہ مہینے ملک کے تمام مسائل پر غور و فکر کر کے تجاویز تیار کی جاتی ہیں۔ یہ تجاویز ان معاملات سے متعلق ہوتی ہیں جن پر تحقیق کرنے کے لئے حکومت وقت اس ادارے کو تفویض کرتی ہے۔

☆ دوسری سطح پر یہ تجاویز متعلقہ وزارتوں اور اداروں کو پیش کی جاتی ہیں اور جائزہ لیا جاتا ہے کہ کیا وسائل حاصل ہیں اور ان تجاویز پر عمل درآمد سے کسی قسم کی خرابی تو پیدا نہیں

ہوگی۔ کمزوریوں کو دور کر کے تجاویز کو حتمی شکل دی جاتی ہے۔

☆ تیسری سطح پر یہ تجاویز وزیراعظم کو پیش کی جاتی ہیں اور حتمی فیصلہ وزیراعظم کا ہوتا ہے جنہیں اپنی کابینہ اور متعلقہ افراد کی مشاورت حاصل ہوتی ہے۔

اس طریق کار کا فائدہ یہ ہے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ دانشورانہ آراء (Intelltectual Inputs) شامل ہوتی ہیں اور غلطی کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران اپنی صوابدید کو ترجیح دیتے ہیں' کچن کیبنٹ بنا کے بڑے بڑے فیصلے کر لیتے ہیں اور ٹھوکر کھاتے ہیں۔ انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں' مثلاً ہمارے سابقہ وزیراعظم نواز شریف نیشنل سکیورٹی کونسل کے نام سے الرجک ہیں' خوفزدہ ہیں' یہاں تک کہ 1996ء میں جب سابق آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت نے نیشنل سکیورٹی کونسل کے حق میں آواز اٹھائی تو نواز شریف اتنا ناراض ہوئے کہ جہانگیر کرامت سے استعفیٰ مانگ لیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد جنرل پرویز مشرف کے ہاتھوں اس فیصلے کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔

آج بھی جنرل پرویز مشرف کے دور کی بنائی ہوئی نیشنل سکیورٹی کونسل موجود ہے' جو دراصل کرائسس مینجمنٹ ٹیم (Crisis Management Team) ہے کہ جب کوئی بڑا مسئلہ سامنے آتا ہے تو اکٹھا ہو کے اس سے نمٹنے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ دراصل نیشنل سکیورٹی کونسل کا کام تو یہ ہے کہ کسی بھی مسئلے کا گھمبیر ہونے سے پہلے' قابل عمل حل ہمارے پاس موجود ہوتا کہ بروقت اس کا تدارک بھی ہو سکے۔

پاکستان کے خلاف عالمی سازشیں:

سوال:—— پاکستان کئی سالوں سے مغربی سرحدوں پر شرپسند عناصر کے خلاف کامیاب فوجی کارروائیاں کر رہا ہے لیکن پھر بھی دہشت گردی ختم نہیں ہوئی ہے۔ کیا وجہ ہے اور اس کا ذمہ دار کون ہے؟

جواب:—— یہ دہشت گردی ایک بہت بڑی سازش کا نتیجہ ہے جو آج سے کئی سال پہلے شروع ہوئی جب پاکستان نے امریکہ کے ساتھ مل کر افغانستان کے خلاف جنگ شروع

کی۔ ان سازشوں کے پیچھے ایسے ممالک کا بھی ہاتھ ہے جو ہمارے دوست تصور کئے جاتے ہیں۔ ان سازشوں کا آغاز اکتوبر 2001ء میں افغانستان پر قبضے کے بعد ہوا جب کابل کے شمال میں جبل السراج کے مقام پر ایک جاسوسی کا بڑا مرکز قائم کیا گیا اور اس نیٹ ورک کو چلانے کی ذمہ داری بھارت کو دی گئی۔ میں نے 2007ء میں اس نیٹ ورک کے متعلق تحقیقات کیں جس کی پوری تفصیل قومی اخباروں میں شائع ہوئی لیکن حکومت وقت نے امریکہ سے احتجاج بھی نہیں کیا کہ بھارت کو افغان سرزمین پاکستان کے خلاف استعمال کرنے سے روکتا۔

امریکہ اور بھارت نے 2005ء میں اسٹریٹیجک پارٹنرشپ کا معاہدہ کیا جس کے اہداف میں سرفہرست ''چین کی تیزی سے بڑھتی ہوئی عسکری اور اقتصادی قوت کو روکنا اور کم کرنا اور علاقے میں بڑھتے ہوئے اسلامی انتہا پسندی کے خطرے کا مؤثر سدباب کرنا تھا۔'' چونکہ دونوں ممالک کے مقاصد ایک دوسرے سے ہم آہنگ تھے اس لئے ان کے لئے ان ہر دو اہداف کا حصول یکساں اہمیت کا حامل تھا۔ اب انہیں افغانستان میں فوجی کارروائیوں کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی ابتری سے نمٹنے کے لئے ایک جامع اور مؤثر انٹیلی جنس نیٹ ورک قائم کرنے کی ضرورت تھی تاکہ پاکستان اور دیگر ہمسایہ ممالک مثلاً چین' روس' وسطی ایشیائی ممالک اور ایران کو غیر مستحکم کیا جا سکے۔

اس کام کو آسان بنانے کے لئے امریکی اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے اعلان کیا کہ ''افغانستان' جو جغرافیائی اعتبار سے وسطی ایشیا کا ایک حصہ رہا ہے' اسے اب جنوبی ایشیا کا حصہ سمجھا جائے گا۔'' اس اعلان کے پس پردہ کارفرما حکمت یہ تھی کہ بھارت کے لئے افغانستان تک مداخلت آسان ہو جائے اور وہ اپنی مرضی کا کردار ادا کر سکے اور اس قابل ہو سکے کہ افغانستان کی سرزمین کو ہمسایہ ممالک کے خلاف جاسوسی کے اڈے کے طور پر استعمال کر سکے۔ اس مقصد کے لئے پورے افغانستان میں ایک انٹیلی جنس نیٹ ورک قائم کر دیا گیا ہے جو کئی سالوں سے خصوصاً پاکستان اور تمام پڑوسی ممالک کے خلاف اب تک فعال ہے۔

افغانستان کے اندر قائم اس انٹیلی جنس نیٹ ورک کی نشاندہی کے لئے ہمارے پاس کافی معلومات ہیں جو مہذب دنیا کی اپنے مفادات کی خاطر کھیلی جانے والی ''گریٹ گیم'' کی گرہیں کھولنے کے لئے کافی ہیں۔ اس ادارے کا مرکز جبل السراج میں واقع ہے جس کا نظام سی آئی اے' موساد' ایم آئی سکس 6 بی این ڈی (جرمن انٹیلی جنس کا ادارہ) اور این ایس ڈی' مشترکہ طور پر چلاتے ہیں۔ یہ پختہ عمارتوں' اونچے اونچے انٹینا (Antenas) اور جدید الیکٹرانک سہولتوں سے آراستہ ایک وسیع رقبے پر پھیلا ہوا بڑا مرکز بن گیا ہے۔ اس کی ذیلی شاخیں سروبی' قندھار' فرح' ہرات' مزار شریف اور فیض آباد میں قائم کی گئی ہیں۔

افغانستان پر قابض فوجوں کا انٹیلی جنس نیٹ ورک

سروبی اور قندھار میں قائم اس کی ذیلی برانچیں پاکستان کے خلاف کام کرتی ہیں۔ فیض آباد میں قائم شاخ چین کے خلاف' مزار شریف کی برانچ روس اور وسطی ایشیائی ممالک کے خلاف اور ہرات میں قائم برانچ ایران کے خلاف سرگرم عمل ہے۔ اس نقشے میں اس جاسوسی نیٹ ورک کی نشاندہی کی گئی ہے۔ سازشوں کا ایک خوفناک کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ آیئے اس ادارے کے کام کرنے کے طریق کار کا ایک سرسری جائزہ لیں۔

پاکستان کے خلاف ایک انٹیلی جنس چوکی سروبی میں قائم ہے جس کا سربراہ ایک بھارتی جنرل ہے جو بارڈر روڈ آرگنائزیشن (Border Road Organization - BRO) کا انچارج ہے۔ اس کے ماتحت غزنی' خوست' گرویز' جلال آباد' اسد آباد' واخان اور فیض آباد میں ذیلی شاخیں قائم ہیں۔ بی آر او نے سروبی سے اسد آباد تا فیض آباد ایک سڑک تعمیر کی ہے جو ہر موسم میں یکساں کارآمد ہے۔ سروبی میں قائم ادارے کی پاکستان کے سرحدی صوبے خیبر پختون خواہ میں تخریبی کاروائیاں کرنے کی ذمہ داری ہے۔

وطن دشمن پاکستانیوں کو اس مقام پر ملک میں تخریبی کاروائیوں اور عدم استحکام پھیلانے کے لئے باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ واخان کے علاقے میں الیکٹرانک سسٹم کی جدید ترین سہولتوں سے آراستہ متعدد اڈے قائم ہیں تا کہ وہ پاکستان' چین' ازبکستان اور تاجکستان پر نظر رکھ سکیں اور دہشت گردی کے منصوبے بنا سکیں۔

قندھار کے مقام پر دوسری چوکی قائم ہے جس کی ذیلی شاخیں لشکر گاہ اور ناوہ (Nawah) میں قائم ہیں اور ان کا ہدف صوبہ بلوچستان ہے۔ بلوچستان کے وطن دشمن عناصر اور بلوچستان لبریشن آرمی کو لشکر گاہ کے مقام پر تربیت دی جاتی ہے اور ان عناصر کی ہر ممکن مدد کی جاتی ہے۔ ان کا خصوصی ہدف گوادر' سینڈک اور حب میں مختلف منصوبوں پر کام کرنے والے چینی کارکنوں کو نشانہ بنانا ہے۔ پاکستانی ساحلوں پر واقع جیوانی اور کلامت کے مقام پر مقیم امریکی' بلوچستان لبریشن آرمی کو تعاون مہیا کرتے ہیں اور ملک کے اندر عدم استحکام پیدا کرنے کے منصوبے بناتے ہیں اور پاکستان و ایران کے خلاف کاروائیوں میں بھرپور تعاون فراہم کرتے ہیں۔

پاکستان میں واقع منڈ کی چوکی سے ایران کے خلاف بھی کاروائیاں کی جاتی ہیں جبکہ بحیرہ عرب میں موجود امریکی بحریہ اور مسقط کے انٹیلی جنس کے اڈے ان کی ہر طرح کی رہنمائی اور مدد کے لئے ہمہ وقت تیار رہتے ہیں۔ جیوانی اور کلامت کی ساحلی سہولتیں پاکستان نے افغانستان میں کاروائی کے لئے خود امریکہ کو دی تھیں جو اب انہیں پاکستان اور ایران کے

خلاف تخریبی کارروائیوں کے لئے استعمال کر رہا ہے۔

چین کے خلاف فیض آباد (بدخشاں) میں واقع انٹیلی جنس کی برانچ ہے جہاں پر تقریباً 350 کے لگ بھگ بھارتی مسلمان سپاہی' انجینئرز اور کارندے کام کرتے ہیں۔ اس کا مقصد چین کے صوبہ سنکیانگ کے باغیوں کو چین میں تخریبی کارروائیوں کے لئے تربیت فراہم کرنا ہے۔ بھارتی علماء ان کی روحانی تبلیغ پر مامور ہیں جو یہ تاثر دیتے ہیں کہ فیض آباد کا ادارہ پاکستان چلا رہا ہے۔

حال ہی میں بھارت کو تاجکستان کے اندر کلائی کاملی (Kalai Kamli) کے مقام پر فوجیں تعینات کرنے کی جو سہولت دی گئی ہے اس کے سبب تاجکستان اور ازبکستان میں بھارت اپنی من مرضی کے مطابق تخریبی کارروائیاں کرنے کے لیے آزاد ہوگا۔ مزار شریف میں قائم جاسوسی اڈا روس کے خلاف سی آئی اے' موساد اور بی این ڈی کے زیر سایہ کام کرتا ہے۔ اس کا مقصد چیچنیا اور ترکمانستان کے وطن دشمن عناصر کو تربیت فراہم کرنا ہے۔ رشید دوستم اور احمد ضیا مسعود ازبکستان اور تاجکستان میں تخریبی کارروائیوں کے بہت متحرک کردار ہیں۔

ایران کے خلاف فرح میں قائم اڈے کا انتظام سی آئی اے' را اور موساد مل کر چلاتے ہیں۔ اس مقام سے اور پاکستان میں واقع کلامت' جیوانی اور مند کے مقامات سے ایران کے اندر تخریبی کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ ان کارروائیوں کے نتیجے میں گذشتہ چند سالوں میں ایران کے بہت سے سکیورٹی اہلکار شہید ہو چکے ہیں۔ دہشت گرد تنظیم جنداللہ کو ایران میں اس قسم کی کارروائیاں کرنے کے لئے ہر قسم کا تعاون مہیا کیا جاتا ہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سازشی منصوبے میں جن مقامات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور جنہیں سازش کے اڈوں کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے انہیں بھارتی کونصلیٹ کا درجہ دیا گیا ہے تاکہ تخریبی کارروائیوں کو سفارتی تحفظ مہیا ہو۔ پاکستان اور ایران پر اکثر و بیشتر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ افغانستان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرتے ہیں حالانکہ معاشرتی انصاف اور انسانی حقوق کی علمبردار قومیں افغانستان میں انسانیت سوز کارروائیوں کے ساتھ

ساتھ ہمسایہ ممالک میں عدم استحکام پیدا کرنے کی خود مرتکب ہو رہی ہیں۔ یہ نام نہاد مہذب قومیں مشترکہ طور پر افغانستان پر ناجائز فوجی تسلط قائم کئے بیٹھی ہیں۔ پاکستان اور دیگر ہمسایہ ممالک کو غیر مستحکم کرنے کے لئے افغانستان کی خود مختاری کو پامال کئے جانے کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ بھارت' امریکہ اور نیٹو کے مابین اسٹریٹیجک پارٹنرشپ کا یہی مقصد تھا۔

ہمارے پڑوس میں افغانستان کی جہادی قوت ہے جس نے دنیا کی ہر بڑی طاقت کو شکست دی ہے۔ ہمارا پڑوسی ملک ایران ایک انقلابی قوت ہے جس نے طویل عرصے سے عالمی پابندیوں کا جوانمردی سے مقابلہ کیا ہے۔ اس طرح ہمارے تینوں اطراف میں بڑی مضبوط انقلابی قوتیں برسرپیکار ہیں اور درمیان میں ایٹمی پاکستان ہے جسے ہمارے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خان نے "ایشیا کے قلب (Heart of Asia)" کا نام دیا تھا۔ اس مرکزی قوت کو کمزور کرنے کی کوششیں عروج پر ہیں۔ سیکولر اور لبرل ازم کا پرچار ہو رہا ہے' جسے سمجھنے اور تدبر کے ساتھ نمٹنے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اس خطرناک صورت حال سے بچ سکیں جو 1965-66 میں انڈونیشیا میں خانہ جنگی کی صورت میں رونما ہوئی تھی۔

ہمارا قومی نظریہ حیات بڑا واضح ہے۔ بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے اسے مزید واضح کر دیا تھا۔ اس سلسلے میں قائداعظم کی تقریروں سے چند اقتباسات میں پہلے بیان کر چکا ہوں' کچھ مزید اقتباسات پیش کروں گا۔

☆ فروری 1948ء میں ملیر کینٹ میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

"آپ کو ہماری اسلامی جمہوریت' جس کی بنیاد معاشرتی انصاف ہے' کا دفاع کرنا ہے۔ اسلامی جمہوریت کا مساویانہ اصول' بھائی چارے' معاشرتی ہم آہنگی' اور اتحاد' ہمارے دین کی اساس ہے جو ہماری تہذیب اور ثقافت کا جزو ہے۔"

☆ 23 مارچ 1948ء کو چٹاگانگ میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

"میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا نظام حکومت اسلام کے بنیادی اصولوں پر قائم ہوگا جو جمہوری ہوگا۔ یہ اصول آج ہماری زندگیوں میں لاگو ہیں

اور یہی اصول آج سے تیرہ سو سال پہلے بھی رائج تھے۔"

☆☆14 فروری 1948ء کو بلوچستان کے شہر بی میں دربار سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"زندگی کے سنہری اصولوں پر عمل کرنا ہی ہماری طاقت اور ترقی کا ضامن ہو سکتا ہے جسے ہمارے پیارے نبی محمد مصطفی ﷺ نے ایک قانون کی شکل دی تھی۔"

پاکستان کے نظام حکومت کے بارے میں قائداعظم نے بہت پہلے رہنما اصول وضع کر دیے تھے جبکہ ہماری قوم کو آئین کی تیاری میں تقریباً ایک چوتھائی صدی کا عرصہ لگا۔ ہمارے آئین میں ہمارے قومی نظریہ حیات کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ "قرآن وسنہ کے اصولوں پر مبنی جمہوری نظام کے لئے جدوجہد جاری رکھی جائے گی۔" جس کے دو اہم عناصر 'جمہوریت' اور 'اسلامی نظریہ' ہیں لیکن بدقسمتی سے ہم دونوں عناصر کی پاسداری میں بری طرح ناکام رہے ہیں اور ابھی تک کوئی ایسا نظام وضع نہیں کر سکے ہیں جو ہماری امیدوں اور امنگوں کا ترجمان ہو۔

مسئلہ کشمیر کے فیصلے کا وقت قریب:

سوال:...... کشمیر کی جنگ آزادی عروج پر ہے۔ پاکستان کا کیا ردعمل ہونا چاہیے؟

جواب:...... مسئلہ کشمیر کے فیصلے کا وقت آ گیا ہے جسے سمجھنے کے لئے اس کا تاریخی پس منظر جاننا ضروری ہے۔ کشمیر کی حالیہ تاریخ کچھ اس طرح ہے کہ مغل بادشاہوں کے خلاف افغانیوں نے جنگ لڑ کر کشمیر اور پنجاب پر قبضہ کیا اور طویل عرصہ حکومت کی۔ افغانیوں کا تسلط سکھوں نے ختم کیا اور پنجاب سمیت کشمیر پر حکومت کرنے لگے۔ جب انگریز برصغیر میں داخل ہوئے تو انہوں نے سکھوں سے جنگ جیت کر پنجاب سمیت پاک و ہند پر قبضہ کیا جس میں کشمیر بھی شامل تھا۔ بعد ازاں مہاراجہ گلاب سنگھ 75 لاکھ نانک شاہی سکے انگریزوں کو ادا کر کے مشہور زمانہ "معاہدہ لاہور" کے تحت 1846ء میں پہلا حکمران بنا۔

1885ء میں گلاب سنگھ کی وفات کے بعد پرتاب سنگھ حکمران بن گیا۔ اس وقت کے قانون کے مطابق ریاست سے باہر کا کوئی شخص کشمیر میں اراضی نہیں خرید سکتا تھا۔ یہ قانون

آج بھی ریاست میں لاگو ہے جس کی وجہ سے آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر میں پاکستان یا بھارت کا کوئی شخص اراضی نہیں خرید سکتا۔ برصغیر کی تقسیم کے وقت مہاراجہ ہری سنگھ کشمیر کا حکمران تھا۔ مسلمانوں نے ڈوگروں سے آزادی کی سیاسی و عسکری جدوجہد دوقومی نظریے کی بنیاد پر تقسیم ہند سے قبل شروع کر دی تھی۔ مہاراجہ ہری سنگھ نے انگریزوں کے ذریعے پاکستان اور ہندوستان سے معاہدہ کر کے ریاست کی آزادانہ حیثیت برقرار رکھنے کی کوشش شروع کر دی جب کہ کشمیری مسلمانوں نے قائداعظم سے مل کر ریاست جموں و کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کی جدوجہد شروع کی جو مہاراجہ کو قطعی منظور نہ تھی۔

ریاست کی دو بڑی سیاسی جماعتوں نیشنل کانفرنس اور مسلم کانفرنس نے قائداعظم کو کشمیر کے دورے کی دعوت دی۔ دورے میں قائداعظم نے کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کی خواہاں مسلم کانفرنس کو ہی مسلم لیگ قرار دیا۔ نیشنل کانفرنس کے شیخ عبداللہ کا خیال تھا کہ ریاست کی آزادانہ حیثیت برقرار رہے۔ بعد میں مہاراجہ ہری سنگھ اور شیخ عبداللہ ایک ہو گئے۔

ان حالات میں 19 جولائی 1947ء میں مسلم کانفرنس نے مشہور زمانہ قرارداد الحاق پاکستان منظور کی۔ کشمیری مسلمانوں نے مسلح جدوجہد کی قیادت 22 سالہ نوجوان سردار محمد عبدالقیوم خان کے سپرد کی۔ 23 اگست 1947ء کو نیلہ بٹ سے شروع ہونے والی جدوجہد 15 ماہ تک جاری رہی اور ریاست جموں و کشمیر کے 84 ہزار مربع میل علاقے میں سے 32 ہزار مربع میل علاقہ (آزاد کشمیر اور گلگت و بلتستان) آزاد کرایا گیا۔

مہاراجہ ہری سنگھ کو جب اپنی پسپائی نظر آئی تو اس نے شیخ عبداللہ اور ہندوستان سے مدد مانگ لی کہ ریاست پر پاکستان نے حملہ کر دیا ہے۔ ہندوستان نے اپنی فوج بھی اتاری لیکن اس کے ساتھ ہی بھارت اقوام متحدہ میں پہنچ گیا۔ اقوام متحدہ نے یونائیٹڈ نیشن کمیشن فار انڈیا اینڈ پاکستان (United Nation's Commission for India and Pakistan) بنایا جس نے سیز فائر کروا کر قرارداد پاس کی کہ ہندوستان اور پاکستان رائے شماری کا اہتمام کریں جس میں کشمیری عوام خود فیصلہ کریں گے کہ انہوں نے پاکستان کے

ساتھ الحاق کرنا ہے یا ہندوستان کے ساتھ۔

بھارتی وزیراعظم جواہر لال نہرو نے 2 نومبر 1947ء کو آل انڈیا ریڈیو پر خطاب کرتے ہوئے کہا تھا:

> ''جموں و کشمیر کی قسمت کا فیصلہ کرنے کا اختیار وہاں کے عوام کے پاس ہے۔ ہم نے جو وعدہ کیا ہے وہ صرف کشمیری عوام سے ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے ساتھ ہے اور ہم اس سے کبھی' کسی بھی صورت میں منحرف نہیں ہوں گے۔''

25 نومبر 1947ء کو جواہر لال نہرو نے بھارتی پارلیمنٹ کو بتایا:

> ''ہم نے تجویز دی ہے کہ جب کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا موقع دیا جائے تو اس کی نگرانی کوئی غیر جانبدار ٹریبونل کرے جیسا کہ اقوام متحدہ کا ادارہ۔''

شیخ عبداللہ نے کشمیر کی پاکستان کے ساتھ الحاق کی مخالفت ضرور کی لیکن ماسوائے مہاراجہ ہری سنگھ کے کسی کشمیری نے الحاق ہندوستان کی بات نہیں کی۔ اس تناظر میں بھارت کے زیر قبضہ کشمیر کو بھارت کا حصہ ماننے کی بجائے اس کی حیثیت کو متنازع قرار دیا گیا جس کا فیصلہ ہونا باقی ہے۔ سیز فائر اور قرارداد آنے کے بعد لائن آف کنٹرول کے اس پار تحریک آزادی کا بیس کیمپ قرار دے کر یہاں آزاد حکومت قائم کر دی گئی جبکہ اس پار بھی بھارت کے زیر تسلط حکومت قائم ہوئی جسے کشمیریوں کی اکثریت نے آج تک تسلیم نہیں کیا۔

مسئلہ کشمیر پر پاکستان اور ہندوستان کے درمیان تین جنگیں ہو چکی ہیں۔ بھارت نے اقوام متحدہ کے کمیشن کی 19 سے زائد قراردادوں پر عمل درآمد سے انحراف کیا ہے جبکہ کشمیریوں نے پرامن جدوجہد جاری رکھی ہے اور آج تک وہ 9 لاکھ بھارتی فوج کی بربریت کی وجہ سے ڈیڑھ لاکھ سے زائد جانیں قربان کرنے کے باوجود بھارت سے آزادی کے حصول تک جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کئے ہوئے ہیں۔

ہمارے خطے میں قیام امن کا دارومدار دو اہم معاملات کو سلجھانے پر موقوف ہے۔

افغانستان اور کشمیر۔ لیکن نام نہاد مہذب دنیا نے مسئلہ کشمیر پر مجرمانہ خاموشی اختیار کر رکھی ہے جو قابل مذمت ہے۔ مسئلہ کشمیر کے حوالے سے اقوام متحدہ کا کردار بھی شرمناک ہے کیونکہ وہ اپنی قراردادوں پر عمل کرانے میں بری طرح ناکام ہوا ہے۔ یوں تو بھارت دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہونے کا دعویدار ہے لیکن مقبوضہ کشمیر کے نہتے عوام پر جس بہیمانہ طریقے سے ظلم و بربریت کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے وہ اس کے جمہوری چہرے اور سیکولرازم کے چہرے پر بدنما داغ ہے۔

سوال:...... کشمیر کی جنگ آزادی کو آپ کس مقام پر دیکھتے ہیں۔ کیا ہمارے کشمیری بھائی اپنے مقاصد حاصل کر سکیں گے اور کیا اس جدوجہد میں پاکستان کی معاونت' سفارتی' سیاسی اور اخلاقی حدود تک ہی محدود رہے گی؟

جواب:...... کشمیر کی جنگ آزادی کی تحریک کو جب سے عوام نے اپنے ہاتھوں میں لیا ہے تحریک نے ایک نیا رخ اختیار کر لیا ہے جس کے آگے جابر قوتیں بے بس نظر آتی ہیں اور یہ بات اب یقینی ہے کہ بہت جلد تحریک آزادی اپنے منطقی انجام کو پہنچے گی۔ اس تحریک کو اس مقام پر پہنچنے میں سات دہائیوں کا عرصہ لگا ہے۔ کشمیر کی تحریک آزادی کے ساتھ ہماری حکومتیں جو جو سلوک کرتی رہی ہیں' وہ افسوسناک ہے۔

آج کشمیریوں کی جنگ آزادی جس مقام پر ہے اسے مقبول بٹ کی شہادت سے مہمیز ملی ہے۔ وہ مقبوضہ کشمیر میں قتل کے الزام میں سری نگر جیل میں قید تھے جہاں سے 8 دسمبر 1968ء کو اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ سرنگ بنا کر فرار ہوئے۔ کئی ہفتوں تک برف پوش پہاڑوں پر سفر کرنے کے باعث ان کے پاؤں زخمی ہو گئے۔ یہ بڑی مشکل سے مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے درمیان واقع لائن آف کنٹرول تک پہنچے اور مقامی لوگوں کو اپنی اصلیت بتائی۔ مقامی لوگ انہیں کندھوں پر اٹھا کر گاؤں لے آئے اور ان کے زخموں کا علاج کیا۔

مقبول بٹ نے خود پاکستانی فوج کو اطلاع کرائی تو انہیں چناری لایا گیا۔ فوجی جوانوں نے بھی ان کی بہت خدمت کی لیکن جب صدر پاکستان جنرل ایوب خان کو پتا چلا کہ یہ وہی

مقبول بٹ ہے جو کے اپج خورشید کا ساتھی ہے تو حکم دیا کہ سری نگر جیل سے فرار ہونے والے ان تینوں افراد کو مظفر آباد کے بلیک فورٹ میں بند کر دیا جائے۔ جنرل ایوب خان کے حکم پر مقبول بٹ پر جو تشدد کیا گیا اس پر وہ بہت کم زبان کھولتے تھے۔ کہتے تھے غیروں کے ظلم پر تو چیخ سکتا ہوں لیکن اپنوں کے ظلم پر کیا بولوں؟ جنرل ایوب خان کا خیال تھا کہ مقبول بٹ معاہدہ تاشقند کے خلاف ایک خطرہ ہیں' لہٰذا انہیں قید میں رکھا گیا لیکن مقبول بٹ کی گرفتاری کے خلاف آزاد کشمیر سمیت پاکستان کے مختلف شہروں میں مظاہرے شروع ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد وہ رہا ہو گئے۔

1970ء کے انتخابات قریب آئے تو مقبول بٹ نے آزاد کشمیر کے ساتھ ساتھ گلگت بلتستان میں بھی انتخابات کا مطالبہ کیا۔ وہ جب بھی گلگت بلتستان کے حقوق کی آواز اٹھاتے انہیں گلگت میں گرفتار کر لیا جاتا۔ 30 جنوری 1971ء کو دو کشمیری نوجوانوں ہاشم قریشی اور اشرف قریشی نے انڈین ایئر لائنز کا ہوائی جہاز ''گنگا'' اغوا کر لیا اور لاہور لے آئے۔ اس ہائی جیکنگ کے الزام میں ایک دفعہ پھر مقبول بٹ کو گرفتار کر لیا گیا۔ دو سال بعد وہ رہا ہوئے تو پاکستان کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ایک ملاقات میں انہیں پیشکش کی کہ آپ پیپلز پارٹی میں آ جائیں تو آزاد کشمیر کے وزیراعظم بن سکتے ہیں۔ مقبول بٹ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ میری منزل وزیراعظم بننا نہیں بلکہ کشمیر کی آزادی ہے۔

1976ء میں وہ واپس مقبوضہ کشمیر چلے گئے اور دوبارہ گرفتار ہوئے۔ جنرل ضیاء الحق کا دور آیا تو ان کے وزیر خارجہ آغا شاہی انہیں کشمیر میں تحریک آزادی کی مدد کا مشورہ دیتے تھے لیکن جنرل ضیاء یہ مشورہ نظر انداز کر دیتے کیونکہ وہ امریکہ کے ہمراہ افغانستان میں مصروف تھے۔ اس دوران جب 1984ء میں بھارت نے سیاچن کی چوٹیوں پر قبضہ کر لیا تو جنرل ضیاء کی آنکھیں کھلیں۔ اسی سال گیارہ فروری کو مقبول بٹ کو پھانسی دے دی گئی اور کشمیر میں مظاہرے شروع ہوئے۔ نواز شریف نے ان کی کتاب پر پابندی لگا دی تھی۔

اب کشمیریوں کی جنگ آزادی اس مقام پر پہنچ چکی ہے تو عمران خان کی حکومت نے

سفارتی سطح پر تحریک کے حق میں آواز اٹھائی ہے جو خوش آئند ہے اور خصوصاً اس وقت جب افغانستان میں دنیا کی واحد سپر پاور شکست کھا چکی ہے اور وہاں سے نکلنا چاہتی ہے مگر اپنی سازشی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہے لیکن ان کے پاس طالبان کے سامنے ہتھیار ڈالنے اور شکست تسلیم کرنے کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ طالبان ہی افغانستان میں مستقبل کی امن کی راہوں کا تعین کریں گے۔ اسی طرح کشمیر کی جنگ آزادی بھی جلد اپنے منطقی انجام کو پہنچے گی اور اپنے مستقبل کا فیصلہ وہاں کے عوام ہی کریں گے۔

وہ فیصلہ کیا ہو گا' اس کے امکانات پر نگاہ رکھنا ضروری ہے ورنہ ہمیں ہزیمت اٹھانا پڑے گی۔ وسیع امکان ہے کہ کشمیری پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کریں گے لیکن پاکستان کی سرد مہری' مبہم کشمیر پالیسی' سیاسی انتشار اور اپنے ہی لوگوں کے خلاف لشکر کشی جیسے عوامل کی وجہ سے وہ شک و شبہات میں ہوں گے۔ آزاد کشمیر کے ساتھ ان کے تعلقات کی نوعیت کیا ہو گی کیونکہ کشمیر کی جنگ آزادی میں ان کا کوئی کردار نہیں ہے۔ مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر کے لوگوں کے درمیان نمایاں فرق ہے۔ اس لئے ان باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہماری حکمت عملی تیار ہونی چاہیے تاکہ الحاق کے راستے میں کوئی مشکل نہ پیش آئے۔

بھارت نے کشمیریوں کی جنگ آزادی کو دبانے کی کوشش میں نہتے کشمیریوں پر بہت ظلم کیا ہے جب کہ جنگ آزادی Non-Violent ہے۔ لیکن ظلم بڑھتا ہی رہا ہے اور انسانی فطرت ہے کہ ''تنگ آمد بجنگ آمد'' اور اب اس تحریک میں شدت آنی شروع ہو گئی ہے۔ 14 فروری 2019ء کو ایک خودکش بمبار نے مقبوضہ کشمیر کے علاقے پلوامہ کے قریب ایک فوجی قافلے کو نشانہ بنایا جس میں 45 بھارتی فوجی ہلاک ہوئے۔ اس حادثے سے بھارتی صدمے اور غصے سے بپھر گئے اور ان کی قیادت نے اس کا الزام جیش محمد پر لگا دیا جسے پاکستان میں ملک دشمن کارروائیوں کی وجہ سے پہلے ہی کالعدم قرار دے رکھا ہے۔

اب آرٹیکل 370 اور 35A کو منسوخ کرنے کے فیصلے سے مودی کا مقصد جموں و کشمیر کی حیثیت کو ہندوتوا کی شکل میں تبدیل کرنا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ ٹرمپ فلسطین کی

زمین اور یروشلم کو یہودیوں کے حوالے کرنے کی خاطر کر رہے ہیں۔ ریاست کشمیر کی حیثیت کو تبدیل کرنے کے پیچھے جو بھارتی سازشیں اور عزائم کارفرما ہیں ان کے نتیجے میں ابھرتے ہوئے سیاسی حقائق کا تقاضا ہے کہ ہم مندرجہ ذیل عوامل کو پیش نظر رکھتے ہوئے اہم پالیسی فیصلے کریں:

☆ قابض فوجوں کے آخری سپاہی کے افغانستان سے نکلتے ہی جہاد افغانستان اپنے کامیاب انجام کو پہنچنے والا ہے۔ یہی طالبان کی شرط ہے جسے تسلیم کرنے کے علاوہ امریکیوں کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔ دنیا بھر کے ممالک سے آئے ہوئے جہادی، خصوصاً کشمیری مجاہدین افغانستان سے نکلنے کے بعد کشمیر کا رخ کریں گے، جیسا کہ 1989-90ء میں روسی فوجوں کے انخلاء کے بعد ہوا تھا۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ تحریک آزادی بتدریج پرتشدد ہوتی جائے گی۔ لہٰذا اس صورت حال کو سنبھالنے کے لئے بھارت مزید دو انفنٹری ڈویژن فوج مقبوضہ کشمیر میں تعینات کر چکا ہے، جو آرٹیکل 370 اور 35اے کو منسوخ کرنے کے فیصلے کے بعد پیدا ہونے والے حالات کو سنبھالنے کے لئے ہے۔

☆ بھارت نے کشمیریوں کی تحریک آزادی کو بے دردی سے کچلنے کا فیصلہ کیا ہے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ اگر اس سلسلے میں کوتاہی کی گئی تو کشمیریوں کی تحریک آزادی میں نیا ولولہ پیدا ہوگا جس سے بھارت کے دیگر حصوں میں جاری متعدد علیحدگی پسند تحاریک آزادی کو حوصلہ ملے گا۔ لہٰذا بھارت مقبوضہ کشمیر پر تسلط برقرار رکھنے کی خاطر کسی بھی قسم کی کارروائی سے دریغ نہیں کرے گا۔

☆ پاکستان کو کشمیر میں الجھا کر وارسا پلان (Warsaw Plan) پر عملدرآمد شروع ہو چکا ہے کیونکہ اس طرح پاکستان ایران کی بھرپور مدد نہیں کر سکے گا اور اسرائیل کے لئے ایران کی عسکری و اقتصادی قوت کو کم کرنے میں آسانی ہوگی۔

پاکستان کو جو لازمی اقدامات اٹھانے چاہئیں ان میں قومی سلامتی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مربوط منصوبہ بندی سب سے اہم ہے۔ ہمیں چاہیے کہ حکمت عملی وضع کرتے

ہوئے سفارتی، سیاسی، اقتصادی اور عسکری عوامل کو یکساں اہمیت دیں جو پاکستانی قوم کی امنگوں کی عکاس ہو۔ عسکری منصوبہ بندی کے حوالے سے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

☆ ہماری حقیقی سلامتی کی بنیاد پاکستان، ایران اور افغانستان کے مابین علاقائی اتحاد کا قیام ہے تاکہ مشترکہ طاقت اور مضبوط قومی ردعمل سے سازشوں کو ناکام کیا جا سکے۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے جسے سازشوں کے ذریعے روکا گیا ہے۔

☆ ایرانی قوم نے گذشتہ چار دہائیوں سے امریکہ کی عیارانہ چالوں، جابرانہ اقتصادی پابندیوں اور غیر اخلاقی شرائط کا پامردی سے مقابلہ کر کے ایک بہادر انقلابی قوم ہونے کا ثبوت دیا ہے اور اب وارسا پلان (Warsa Plan) کے مکروہ چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ ایسے مشکل وقت میں ہم دونوں ملکوں کو ایک دوسرے کی اشد ضرورت ہے۔

☆ افغانی قوم نے گذشتہ چار دہائیوں میں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کو شکست سے دوچار کیا ہے۔ یہ ایسا انوکھا واقعہ ہے جس کی انسانی تاریخ کی جنگوں میں مثال نہیں ملتی۔ ان کی شاندار جدوجہد پاکستان کے لئے مشعل راہ ہے۔ پاکستانی مسلح افواج، ان چیلنجوں سے نمٹنے کے لئے ہماری قومی سلامتی کا اہم ترین عنصر ہیں۔

الحمدللہ، ہماری مسلح افواج بھارت کے توسیع پسندانہ عزائم کے خلاف کمر بستہ ہیں۔ بلاشبہ ہماری فوج کا شمار اس وقت دنیا کی بہترین افواج میں ہوتا ہے اور وہ دفاع وطن کی خاطر ہر لمحہ تیار ہیں۔ ہماری روایتی افواج ہی جنگ لڑیں گی اور انشاءاللہ فتح یاب ہوں گی۔ عسکری مہارت سے مرتب کی گئی حکمت عملیوں اور پالیسی فیصلوں سے جنگ کی حکمت عملی کو مزید مضبوط کیا جانا اشد ضروری ہے۔

پاکستان کو اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لئے بھارت کے ساتھ فیصلہ کن جنگ کے لئے ہمہ وقت تیار رہنا ہوگا۔ آزادی کے دیگر عوامل کے تحفظ کے لئے ایسی تیاری انتہائی ضروری ہے تاکہ کشمیری عوام کی آزادی اور پاکستان کے لئے پانی کا تحفظ بھی یقینی بنایا جا سکے جس پر ہماری زندگی کا انحصار ہے۔ اصل حکمت عملی یہ ہوگی کہ ہم جنگ کئے بغیر ہی اپنے

اہداف حاصل کریں۔

مقبوضہ کشمیر اور آسام میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا مقصد ہندو آبادی کا تناسب زیادہ کر کے انہیں ہندو اکثریتی علاقوں میں تبدیل کرنا ہے۔ کشمیریوں کو ڈر ہے کہ حکومتی منصوبہ روبہ عمل ہونے سے کشمیریوں کی خودمختاری چھن جائے گی اور ہندوؤں کو یہاں لا کر بسانے سے کشمیر کی اکلوتی مسلم ریاست کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ان تبدیلیوں سے کشمیری اس خصوصی حق سے بھی محروم کر دیے جائیں گے جس کے تحت کوئی غیر کشمیری یہاں پر جائیداد نہیں خرید سکتا۔ مودی کا یہ ایجنڈا چند صدیاں پہلے امریکہ میں اٹھائے جانے والے اقدامات جیسا ہے جہاں ریڈ انڈین باشندوں کو آبادی سے علیحدہ کر کے مخصوص علاقوں میں رکھا گیا تھا' جہاں وہ ابھی تک محدود ہیں۔

مودی کے ایجنڈے پر عمل درآمد سے موجودہ صورت حال دنیا بھر کے جہادیوں کو دعوت عام دے رہی ہے۔ اس لئے کہ کفر نے اسلام کو للکارا ہے۔ ان چیلنجوں کے جواب میں عالمی جہادی کشمیر کا رخ کریں گے۔ افغانستان کی طرح بالآخر کل یہی جہادی کشمیر کی باگ ڈور سنبھال لیں گے اور انہی کے سامنے بھارتی قیادت صلح کی بھیک مانگ رہی ہوگی جیسے کہ آج امریکہ افغان طالبان کے آگے سجدہ ریز ہے۔ یہ وہ طاقت ہے جو ان تمام طاغوتی طاقتوں کو شکست دے چکی ہے جنہوں نے اسلام کو اپنا دشمن سمجھا ہوا ہے اور پچھلی چار دہائیوں میں متعدد اسلامی ملکوں کو تباہ کیا ہے۔ لاکھوں مسلمان قتل ہوئے ہیں لیکن اس بربریت کے خلاف اللہ نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے:

> ''یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ کے نور کو پھونکیں مار کر بجھا دیں گے لیکن اللہ اپنے نور کو پورا کئے بغیر رہنے والا نہیں ہے۔'' (التوبہ)

یمن کے حوثیوں نے ڈرون حملہ کر کے سعودی عرب کے قصبوں میں تیل کے دو پمپنگ اسٹیشنز (Oil Pumping Stations) کو نقصان پہنچایا ہے۔ شاید یہ حربے جنگ شروع کرنے میں کارگر ثابت ہو جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسرائیل امریکی

ایف 35 طیاروں کے ذریعے ایران میں دور تک اہداف کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر ایرانیوں کے پاس اسرائیل سے نمٹنے کے لئے ایک بڑی ناقابل شکست صلاحیت بھی موجود ہے جس سے اسرائیل کی سلامتی داؤ پر لگ جائے گی۔ اگر جنگ شروع ہو جاتی ہے تو اس کے انداز بالکل نرالے ہوں گے کیونکہ میزائل' راکٹ' ڈرون اور خودکش حملہ آور کی تعداد ہی فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ لہٰذا اسرائیل کے اپنے مفاد میں ہے کہ وہ ٹرمپ کے راستے پر نہ چلے اور دو قومی نظریے پر عمل پیرا ہو کر خطے میں دیرپا قیام امن کی کوششیں کرے۔

نئی جنگی تدابیر اور پاکستان کے دفاع کے تقاضے:

سوال:...... آج کل مختلف جنگی تدابیر ایجاد ہو چکی ہیں۔ ان تدبیروں کی افادیت کیا ہے اور پاکستان کے لئے خصوصاً اپنے دفاع کے لئے کیا تدبیریں کی جا سکتی ہیں؟

جواب:...... موجودہ دور میں جنگ کے ذریعے اپنے دشمن کو شکست دے کر تباہ و برباد کر دینا مقصد نہیں ہوتا بلکہ ایسے ہتھیار' ٹیکنالوجی اور تدبیریں استعمال کی جاتی ہیں کہ دباؤ میں آ کر دشمن مقابلہ کرنے کا حوصلہ کھو دے اور ایک تباہ کن جنگ کے بغیر ہی کامیابی حاصل ہو۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہمیں معلوم ہو کہ دشمن کی صلاحیت کیا ہے اور وہ ہمارے لئے کیا خطرات پیدا کر سکتا ہے اور ساتھ ہی ہمیں اچھی طرح اندازہ ہو کہ اپنے مقاصد کے حصول کے لئے ہماری اپنی صلاحیت اور استعداد کیا ہے۔ یہ ٹیکنالوجی اور تدبیریں کیا ہیں' ان کا مختصر سا جائزہ لیتے ہیں:

☆Space Warfare' جس کی تیاری امریکہ نے شروع کر دی ہے۔ خلاء میں اس نے اپنی Space Command بنا لی ہے۔ دوسرے صلاحیت رکھنے والے ممالک بھی اس تیاری میں مصروف ہیں۔

☆Cyber Warfare دشمن ملک کے نظریات کو کمزور کرنا' بغاوت کی ترغیب دینا' دہشت گردی اور انتشار پھیلانا' مرضی کی حکومت قائم کرنا' وغیرہ وغیرہ۔ ہمارا ملک سالہا سال سے اس سازش کی زد میں ہے۔

☆Artificial Intelligence Warfare کمپیوٹر ٹیکنالوجی کو استعمال کر کے مختلف طریقوں سے دشمن کی وہ تمام صلاحیتیں جو کمپیوٹر کے سہارے چلتی ہیں' ان پر کنٹرول حاصل کرنا' انہیں جام کردینا' ناکارہ بنادینا' بہت آسان ہوگیا ہے۔

☆Guerilla Warfare, Psychological Warfare کے طریقے تو کافی عرصوں سے مختلف جنگوں میں استعمال ہوئے ہیں۔

موجودہ دور کی کہ نئی جنگی حکمت عملی Hibrid Warfare کے نام سے موسوم ہے۔ کچھ لوگ اسے Fifth Generation Warfare بھی کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے Jihadi Warfare کی روایت خود اسلام دشمنوں کے ہاتھوں پیدا کی ہے جو اب مودی کے اعصاب پر سوار ہے۔

ہمارا سیاسی نظام:

سوال:...... عمران خان کی حکومت کے خلاف مولانا فضل الرحمٰن نے لانگ مارچ شروع کیا اور کافی دنوں تک اسلام آباد میں دھرنا دیے بیٹھے رہے۔ آپ اس معاملے کو کس تناظر میں دیکھتے ہیں؟

جواب:...... حکومت کی تبدیلی کے لئے دھرنے کی روایت عمران خان نے 2014 میں ڈالی تھی جس کا اب خود انہیں سامنا ہے کیونکہ اب وہی 'حکومت کی تبدیلی' کی لہر کہیں زیادہ شدت کے ساتھ ان کے اقتدار کے دروازے تک پہنچ چکی ہے۔ مولانا فضل الرحمٰن کی قیادت میں دائیں بازو کی مذہبی جماعتیں جو گذشتہ بہتر سالوں سے سیاسی طور پر بے وقعت رہی ہیں' اچانک قومی سیاسی افق پر مرکزی حیثیت اختیار کر چکی ہیں اور اب تقریباً پانچ لاکھ عوام کی حمایت کے ساتھ اقتدار کے دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ انہیں ملک کی اہم سیاسی قیادت کی بھی حمایت حاصل ہے۔

حالات کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ چند سال قبل یہ عمران خان ہی تھے جو ڈی چوک میں وزیراعظم نواز شریف حکومت کے خاتمے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ وہ اس کوشش میں کامیاب

ہوئے اور قوم کو ہر قسم کی کرپشن اور استحصال سے پاک ''نئے پاکستان کا خواب'' دکھا کر ملک کے وزیراعظم بن گئے لیکن وہ اس مقصد میں نہ صرف بری طرح ناکام ہوئے ہیں بلکہ سیاسی طور پر تنہائی کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس دوران انہوں نے دوستوں سے زیادہ دشمن بنائے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نصف ملین لوگوں پر مشتمل عوام کا ایک حیرت انگیز خطرناک اجتماع جسے Critical Mass کہا جاسکتا ہے' جس میں تین اہم طبقات شامل ہیں:

☆مولانا کی اپنی جماعت' اور دوسری جماعتوں کے لوگ جو انتہائی منظم ہیں' ان کی تعداد زیادہ ہے۔

☆عمران کی حکمرانی سے اکتائے ہوئے عوام' جنہیں حکومت سے کسی خیر کی توقع نہیں وہ بھی ان کے ساتھ ہیں۔

☆ناراض نوجوانوں کا ایسا طبقہ جو ایمان کی طاقت سے معمور ہے اور لبرل ازم' سیکولرازم اور دوسرے تمام 'ازم' کو مسترد کرتا ہے' وہ مولانا کے ہجوم میں شامل ہیں۔

عمران کی سیاسی تنہائی کی بڑی وجہ ان کی جلد بازی اور غیر ضروری اقدامات ہیں۔ وہ اپنے سیاسی حریفوں کو بدنام اور رسوا کرنے کے عمل میں بہت دور جا چکے ہیں حتیٰ کہ وہ اپنی سیاسی اساس' یعنی پارلیمنٹ کو بھی بے وقعت کرنے کا باعث بنے ہیں۔ روحانی راہنمائی کی خاطر ان کی شخصیت اسلام' لبرل ازم اور خانقاہ کے مابین گم ہو چکی ہے جیسا کہ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ:

> *"My Islam was selective. I accepted only parts of the religion that suited me. It was not so much out of conviction but love for my mother and that I stayed a Muslim." (Arab News)*

> ''اسلام سے میرا تعلق معنوی ہے جس میں سے میں نے صرف اپنے لئے بہتر حصوں کو منتخب کیا۔ یہ کسی یقین کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اپنی ماں سے محبت کے

سب تھا کہ میں آج ایک مسلمان ہوں۔" (عرب نیوز)

جبکہ اللہ کا حکم ہے کہ دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

مولانا کے دھرنے اور حکومت سے ٹکراؤ کا منصوبہ سیاسی جماعتوں نے بنایا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ جب عمران خان کے استعفے کا مقصد پورا نہیں ہوگا تو یہ ہجوم ڈی چوک (D-Chowk) کی جانب بڑھے گا۔ پولیس اور رینجرز انہیں روکنے میں ناکام ہوں گے تو فوج آگے بڑھے گی۔ ٹکراؤ ہوگا' لاشیں گریں گی' ہنگامہ برپا ہوگا' حالات قابو سے باہر ہوں گے اور حکومت کنٹرول قائم نہ رکھ سکے گی۔ مولانا نے اس سازش کو سمجھ لیا اور تھم گئے۔ آگے بڑھنے کی بجائے پلان بی پر عمل شروع کیا' یعنی پورے ملک میں احتجاج کا سلسلہ شروع کیا تاکہ اجتماعی طاقت کا جو مظاہرہ انہیں ہو چکا تھا اس کی قومی سطح پر تصدیق ہو جائے۔ اب انہیں قومی سطح پر ایک سیاسی قوت کی پہچان حاصل ہو چکی ہے جسے وہ جمہوری طریقے سے اگلے انتخابات میں بھرپور انداز میں استعمال کریں گے۔ اس طرح قومی اسمبلی کی پچیس سے تیس سیٹیں حاصل کر کے قومی سیاسی دھارے میں اپنا مقام حاصل کریں گے۔ اسی کو حقیقی سیاست (Real Politics) کہتے ہیں۔

دشمنوں کی تمام تر کوششوں کے باوجود نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ امریکہ کی اس ذہن سازی کی سازش کا حصہ نہیں بن سکا۔ اس کو دین سے بیزاری کی یہ تعلیم نہیں مل سکی جس میں ملک کے غریب نوجوان شامل ہیں۔ انہیں دینی مدارس کے علاوہ کوئی تعلیم نہیں دیتا۔ وہ نوجوان آج مولانا کے ساتھ ہیں۔ اس لئے مولانا کے آزادی مارچ کا بنیادی مقصد دین اسلام کی سربلندی ہے۔ ان کا مقصد وزیراعظم بننا نہیں اور نہ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا ہے۔ ان کا اصل مقصد اسلام کے خلاف اس سازش کو جو ذہن سازی کے نام پر ہوئی ہے' ختم کرنا ہے۔ پاکستان کا آئین بھی مولانا کے اس مطالبے کی تائید کرتا ہے کہ ملک میں جو بھی قانون سازی ہوگی' قرآن وسنت کے مطابق ہوگی۔

سوال:...... گیارہ جماعتوں کا اتحاد بنا ہے جبکہ ان کے درمیان سیاسی اختلافات بھی

ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ یہ جماعتیں یکجا ہو کر تحریک کو کسی منطقی انجام تک پہنچا سکیں؟

جواب:—— حزب اختلاف کی جماعتیں اس دم گھٹنے والے ماحول سے چھٹکارا پانے کے لئے اتحاد بنانے پر مجبور ہوئی ہیں۔ نوجوان بلاول بھٹو زرداری ہوئی حزب اختلاف کی جماعتوں کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو دو بڑی سیاسی جماعتوں اور مضبوط دینی جماعتوں پر مشتمل ہے اور عوام کی کثیر تعداد کو متحرک کر سکتی ہیں جیسا کہ انہوں نے اس سال کے شروع میں اسلام آباد کے نزدیک اکٹھا کیا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک طاقتور تحریک بن سکتی ہے' خصوصاً جب عمران خان خود کہہ رہے ہوں کہ "پاکستان مسلم لیگ (ن) اور پاکستان پیپلز پارٹی دونوں اداروں کی پیداوار ہیں۔" انہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ عوام کے مزاج کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اداروں کا مزاج بھی تبدیل ہو جایا کرتا ہے' چاہے کھیل کا میدان ایک ہی کیوں نہ ہو۔ اب عمران خان کو دو راستوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے:

ملک کو بدترین صورت حال کی طرف جانے سے پہلے مصلحت کی راہ اختیار کرتے ہوئے قبل از وقت انتخابات کے ذریعے سیاسی صورت حال کا موزوں حل تلاش کریں جو ممکن ہے۔

حزب اختلاف کو اپنا کھیل کھیلنے دیں اور نتائج سے بے پرواہ ہو کر ان کے خلاف کارروائی کریں۔ ریاستی طاقت کا استعمال کر کے تحریک کو دبانے کی راہ اختیار کریں۔ نتائج کیا ہوں گے' وقت بتائے گا۔

سوال:—— کیا آپ کو اس تحریک کی کامیابی کے کوئی امکانات دکھائی دیتے ہیں؟

جواب:—— اگر سیاسی جماعتیں ذاتی مفادات کی بجائے ملکی مفادات پر مبنی ایجنڈا لے کر میدان میں اتریں گی تو یقیناً اس تحریک کو عوامی پذیرائی ملے گی جو تحریک کی کامیابی کی ضمانت ہوگی۔ عمران خان کہتے ہیں کہ "وہ آخری بال تک لڑنے کے قائل ہیں۔" لہٰذا اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ وہ معاملات کو کھلے میدان میں حل کرنے کا فیصلہ کریں گے جبکہ اس کے جواب میں حزب اختلاف نے تحریک چلانے کی جو سیاسی حکمت عملی وضع کر رکھی ہے اس کے خدوخال بڑے واضح ہیں' مثلاً آل پارٹیز کانفرنس کا اعلامیہ بجائے کسی سیاسی قائد

کے مولانا فضل الرحمٰن نے پڑھا' یعنی ان کے سیاسی وزن کو تسلیم کیا گیا ہے۔

سوال:...... اس اتحاد میں ایک بڑی دینی جماعت کو اہم سیاسی ذمہ داری دی گئی ہے کہ جس کے سبب اس جماعت کے قومی سیاسی دھارے میں شامل ہونے کے امکانات ہیں۔ کیا یہ تبدیلی ہمارے جمہوری نظام کے لئے اچھی پیش رفت ثابت ہوگی؟

جواب:...... یہ ایک مثبت پیش رفت ہے کہ جس کے سبب ہماری دینی جماعتوں کو سیاسی نظام کا حصہ بن کر اپنا کردار ادا کرنے کا موقع ملے گا ورنہ الگ تھلگ رہ کر ہمیشہ ان جماعتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھا گیا جس سے خرابی پیدا ہوئی ہے۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کے تحریک کی قیادت سیاسی حکمت کے تحت جمعیت علمائے اسلام (ف) کو سونپی گئی ہے' جس کا مطلب ہے کہ آئندہ قائم ہونے والے کسی بھی نظام میں جمعیت علمائے اسلام (ف) اپنے لئے نمایاں سیاسی مقام حاصل کر سکے گی۔ اس امر کا کافی مدت سے انتظار تھا خصوصاً 2018ء کے انتخابات میں جب دینی جماعتوں نے بڑے قومی سیاسی دھارے میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا لیکن ان کی راہ میں روڑے اٹکائے گئے' بالخصوص مولانا سمیع الحق جو کہ پاکستان تحریک انصاف کی جانب سے امیدوار تھے' وہ انتخابات میں حصہ نہ لے سکے۔

اب حزب اختلاف کی صفوں میں اصغر خان جیسا کوئی شخص موجود نہیں ہے جو حالات بگڑنے کی صورت میں فوج کے سربراہ کو اقتدار سنبھالنے پر اکسا سکے۔ اس تناظر میں نواز شریف کے تند و تیز خطاب کو توجہ طلب قرار دیا جا رہا ہے کہ اس بیان سے قومی اداروں کے مابین بدگمانی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سوال:...... کیا حکومت تحریک کو دبانے کے لئے طاقت کا استعمال کرے گی یا کھلے دل سے حزب اختلاف کو تحریک چلانے کی اجازت دے دے گی؟

جواب:...... حکومت کے ارادوں کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انہوں نے تحریک کو دبانے کے لئے طاقت کے استعمال کا فیصلہ کیا ہے۔ شہباز شریف کو نیب نے حراست میں لے لیا ہے' زرداری پر فرد جرم عائد کی جا چکی ہے اور جادو کا کھیل شروع ہو چکا

ہے۔ عمران خان کو تحریک کو دبانے کے لئے ٹائیگر فورس کو استعمال کرنے پر اکسایا جا سکتا ہے جیسا کہ بھٹو نے ایف ایس ایف (FSF) کو استعمال کیا تھا جس کے انتہائی مہلک نتائج برآمد ہوئے تھے۔ بالآخر نظام کو بچانے کے لئے سلامتی کے اداروں کو مداخلت کرنا پڑے گی۔ حکومت کے پاس آخری حربہ یہی ہوگا۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو یہ صورت حال انتہائی مخدوش شکل اختیار کر جائے گی کیونکہ عوام کا مزاج ایک اور فوجی حکومت قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔

سوال:...... اگر یہ تحریک کامیاب ہوتی ہے تو پھر وہی موروثی قائدین اقتدار میں ہوں گے جن پر سنگین الزامات ہیں۔ اگر قائدین ہی بدنام ہوں گے تو قوم ان سے بھلائی کی امید کیسے رکھے گی؟

جواب:...... بے شک حزب اختلاف کی بڑی جماعتوں کی قیادت پر کرپشن کے الزامات ہیں لیکن ان کے درمیان صاف شفاف کردار کے حامل ایسے قابل لوگ بھی موجود ہیں جو حکمرانی کا تجربہ بھی رکھتے ہیں اور جمہوری اقدار کے تحفظ اور آئین کی حکمرانی پر یقین رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ معاملات کو سنبھال کر شفاف انداز سے انتقال اقتدار یقینی بنا سکتے ہیں بجائے اس کے کہ دھاندلی زدہ انتخابات یا ریاست کے پس پردہ کارفرما قوت (Deep State) کی چالوں کے ذریعے یا چار اے (Four "A") کا گٹھ جوڑ اقتدار سنبھال لے۔ اہم بات یہ ہے کہ عوام یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ کرونا کی وباء کی آلودگی کے باوجود جمہوریت کو آزاد فضا میں سانس لینے کا موقع دیا جانا لازم ہے۔ اس صورت حال پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ "جس خیال کا وقت آ گیا ہو کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔" (وکٹر ہیگو)

میرا مشورہ ہے کہ جو بھی حکومت آئے وہ نیشنل سکیورٹی کونسل (NSC) ضرور بنائے تا کہ معاونین خصوصی کی ضرورت نہ ہو اور نہ ہی نیشنل سکورٹی کونسل ایسی ہو جیسی عمران خان نے بنائی ہے جو دراصل Disaster Management Council ہے۔ مہذب جمہوری ممالک میں ایسی NSC موجود ہیں جو نیشنل سکیورٹی کے مشیروں کے تحت سال کے بارہ مہینے ملکی مسائل کا تجزیہ کر کے حکومت کو صائب مشورے دیتی رہتی ہیں۔ اس ادارے کو ملک کے

صاحب دانش افراد اور تمام تحقیقی اداروں کی معاونت حاصل ہوتی ہے۔ غلط فیصلوں کے امکان بہت کم ہوتے ہیں لیکن کتنی مضحکہ خیز بات ہے کہ 1996 میں جب جنرل جہانگیر کرامت نے یہی مشورہ دیا تو اس وقت کے وزیراعظم نواز شریف نے چیف آف آرمی سٹاف کو فارغ کر دیا اور اس فیصلے کا خمیازہ نواز شریف آج تک بھگت رہے ہیں۔

پی ڈی ایم اور پی این اے کا موازنہ:

سوال:۔۔۔۔ عمران خان کی حکومت ختم کرنے کے لئے حزب اختلاف نے پی ڈی ایم (PDM) کے نام سے تحریک چلانے کا اعلان کیا ہے۔ کچھ سیاسی عناصر اس تحریک کو 1977ء میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کو گرانے کے لئے قائم ہونے والی تحریک پی این اے (PNA) کا دوسرا جنم کہہ رہے ہیں۔ آپ اس تحریک کے بارے میں کیا کہیں گے؟

جواب:۔۔۔۔ اس تحریک یعنی پی ڈی ایم کا موازنہ 1977ء میں قائم ہونے والے پاکستان نیشنل الائنس (PNA) سے کرنا ناانصافی ہو گی کیونکہ پی این اے اور حال ہی میں 2020ء میں آل پارٹیز کانفرنس کے بعد ترتیب پانے والی پاکستان ڈیموکریٹک تحریک (PDM) میں ایک اہم فرق ہے۔ پی این اے سیاسی جماعتوں کے درمیان طے پانے والا ایک اتحاد تھا جبکہ پی ڈی ایم ایک جمہوری تحریک ہے۔ یہ باریک فرق ماضی میں قائم ہونے والے اتحاد میں سازشی کھیل اور حالیہ ترتیب پانے والی تحریک کے مقاصد کا فرق بھی ظاہر کرتا ہے۔ پی این اے (PNA) کو پس پردہ بیرونی ہاتھوں نے تشکیل دیا تھا جو بھٹو کے اقتدار کے خاتمے کے خواہاں تھے:

> ''کیونکہ وہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بانی تھے: انہوں نے پاکستان میں اسلامی ممالک کی سربراہی کانفرنس بلا کر مسلم امہ کے مابین اتحاد قائم کرنے کی کوشش تھی جس کا کوئی قائد نہیں تھا مگر سعودی عرب کے شاہ فیصل اس تنظیم کی قیادت کرنے پر رضامند ہوئے تھے اور یہ بھٹو ہی تھے جنہوں نے شاہراہ قراقرم کی تعمیر سے چین کے ساتھ ہمارے تزویراتی تعلقات کی بنیاد رکھی تھی۔''

سیاسی طور پر بھٹو کی پوزیشن نہایت مضبوط تھی اور انہیں صرف غیر سیاسی ہتھکنڈوں ہی کے ذریعے اقتدار سے ہٹایا جا سکتا تھا۔ لہٰذا یہ کھیل کھیلنے کے لئے دینی جماعتوں اور سیاسی موقع پرستوں کا ایک گروہ تیار کیا گیا۔ ان سیاسی قائدین میں کچھ ایسی شخصیات بھی تھیں جنہیں آرمی چیف کو اقتدار سنبھالنے کی ترغیب دیتے ہوئے ذرا بھی شرم محسوس نہیں ہوئی کیونکہ امریکہ کے ایجنڈے کی تکمیل فوج کے مضبوط ہاتھوں کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی تھی۔ ان کا مقصد منصوبے کے عین مطابق پورا ہوا۔ بھٹو اور شاہ فیصل کو یکے بعد دیگرے قتل کر دیا گیا۔

اسی طرح کی ایک PDM تحریک 1969 میں چلی تھی جس کے سربراہ نوابزادہ نصراللہ خان تھے۔ اس اتحاد میں شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی بھی شامل تھیں۔ اس کے پیچھے امریکی سازش تھی جو جنرل ایوب خان کو ہٹانا چاہتے تھے۔ ایوب خان کا مطالبہ تھا کہ امریکہ دوست بن کر رہے 'آقا نہیں' جو امریکہ کو منظور نہ تھا؛ جنوری 1969 میں تحریک شروع ہوئی اور دو ماہ بعد ایوب خان نے استعفیٰ دے دیا اور ایک بڑی غلطی کے مرتکب ہوئے کہ انہوں نے اقتدار جنرل یحییٰ خان کے حوالے کر دیا' جنہوں نے مشرقی پاکستان کے سیاسی مسائل کو فوجی طاقت سے حل کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہے' جس کے نتیجے میں پاکستان دو لخت ہو گیا۔

پی ڈی ایم (PDM) سیدھی سادھی جمہوری تحریک ہے کیونکہ اس کے پس پردہ کوئی بیرونی قوت نہیں ہے۔ اس تحریک کا مقصد جمہوری طریقوں سے تبدیلی لانا ہے جو عمران خان کے نئے پاکستان کے نظریے کا قدرتی ردعمل ہے' جس کے تین اہم بنیادی اہداف ہیں:

> ''مثلاً ملک کو معاشرتی و اقتصادی طور پر ریاست مدینہ کے اصولوں پر استوار کرنا؛ پاکستان کو بدعنوانی (Corruption) سے پاک کرنا اور پاکستان کے غریب عوام کی لوٹی ہوئی دولت کی واپسی کو یقینی بنانا ہے۔''

گذشتہ دو سالوں سے ان مسائل کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے سیاسی قائدین کو بدنام کرنے کی مہم جاری ہے' جس کے نتیجے میں صرف سیاسی جماعتوں کی ساکھ کو ہی نقصان نہیں پہنچا ہے

بلکہ جمہوریت کا چہرہ بھی داغدار ہوا ہے۔ عدالتیں' نیب (NAB)' ایف آئی اے اور انٹیلی جنس ایجنسیاں بدعنوان عناصر کے خلاف سخت ترین کاروائی کررہی ہیں لیکن اب تک عام آدمی کی زندگی میں بہتری نہیں آئی ہے بلکہ ''حکمرانوں کی جانب سے اختیارات کے اندھے استعمال اور نااہل طرزِ حکمرانی کے نتیجے میں اختیار اور طاقت دونوں زوال پذیر ہیں۔'' میڈیا کی زبان بندی جیسے اقدامات سے ریاست کی حاکمیت کو اخلاقی طور پر ہزیمت اٹھانی پڑی ہے۔

سوال:...... کیا روایتی سیاسی جماعتیں' جمعیت علمائے اسلام کے اس مقصد کے حصول میں اس کا ساتھ دیں گی؟ جبکہ وہ اپنے چھوٹے سے چھوٹے فیصلے کے لئے امریکہ کی طرف دیکھتی ہیں؟

جواب:...... میرا نہیں خیال کہ مسلم لیگ (ن) یا پیپلز پارٹی ان کا ساتھ دے گی یا اس مطالبے کو تحریک انصاف بھی تسلیم کرے گی۔ ان میں سے کوئی بھی اس راستے پر نہیں چلے گا۔ اصل تصادم یہی ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لئے مولانا فضل الرحمٰن اتنا بڑا جم غفیر لے کر اسلام آباد آئے۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ یہ لوگ جمہوریت کے لئے نہیں بلکہ دین کی سربلندی کے لئے آئے تھے۔ مولانا کے نفاذ اسلام کے مطالبے کا ساتھ نہ ن لیگ دے گی' نہ پیپلز پارٹی اور نہ ہی تحریک انصاف۔

اس تضاد کے نتیجے میں تصادم ہوگا۔ مجھے خوف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جیسا کہ 60ء کی دہائی میں انڈونیشیا میں ہوا تھا۔ اس وقت دین اسلام کے ماننے والے سادہ مسلمانوں سے سوشلزم اور کیمونزم کا تصادم ہوا تھا جس کے نتیجے میں خانہ جنگی ہوئی اور 15 سے 16 لاکھ لوگ قتل ہوئے۔ انڈونیشیا تو جزیرہ تھا' ہم جزیرہ نہیں ہیں۔ ہمارے ایک طرف انقلابی ایران ہے' دوسری طرف جہادی افغانستان ہے۔ بھارت ہم پر نظریں گاڑے بیٹھا ہے اور پاکستان کے اندر 25 سے 30 دینی جماعتوں کا گروہ ہے۔ اس تصادم کو مزید شدت دینے کے لئے بھارت جلتی پر تیل چھڑکتا رہے گا۔ حکومت کو اس خطرے کو محسوس کرنا چاہیے۔

سوال:...... آپ نے یہ بھی تجویز دی ہے کہ آج کی صورت حال میں قومی حکومت بنائی

جائے۔ اس وقت کس طرح ممکن ہے کہ یہ قومی حکومت تشکیل دی جائے؟

جواب:...... اس وقت ملک میں سیاسی ابتری ہے۔ پیپلز پارٹی' نون لیگ اور پی ٹی آئی آپس میں لڑ لڑ کر لہولہان ہیں۔ ان میں اب کوئی دم خم نہیں۔ یہ اب مضبوط سیاسی جماعتیں نہیں رہیں۔ یہ سب لوگ اندر سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی حکومت چلانے کے قابل نہیں ہے۔ خود مولانا فضل الرحمٰن میں بھی یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لیں اور حکومت چلائیں۔ سیاسی استحکام کے لئے ضروری ہے کہ ایک مخلوط قومی حکومت تشکیل دی جائے تاکہ سیاسی جماعتیں مل بیٹھ کر اپنے آپ کو منظم اور مضبوط کرلیں۔ آپس کے جھگڑوں کو ختم کریں۔ معاملات کی نزاکت کو سمجھا جائے۔ اس لئے قومی حکومت کی جانب سنجیدگی سے سوچا جائے اور اسی پر مذاکرات کئے جائیں۔ ڈیڑھ دو سال کی مدت میں قومی حکومت صاف ستھرے انتخابات کا اہتمام کرسکے گی۔

سول ملٹری تعلقات:

سوال:...... آج کل ملک کے اندر فوج پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ عمران خان کی حکومت کی حمایتی ہے اور سیاسی معاملات میں فوج کا عمل دخل ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟

جواب:...... دراصل یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو سمجھنے کا ہے نہ سمجھانے کا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب آرمی سیاسی حکومت سے دور رہ کر کام کرتی ہے تو خراب سول و ملٹری تعلقات کا رونا رویا جاتا ہے جیسا کہ جنرل راحیل کے وقت میں ہوا۔ جب وہ ریٹائر ہوئے تو نواز شریف کے لوگوں نے کہا ''شکر ہے وہ چلا گیا' ہمارے اعصاب پر سوار تھا۔'' اس کے برعکس جنرل باجوہ نے حکومت کے ساتھ قریبی روایات رکھیں تو کہا جاتا ہے کہ وہ عمران خان کو سرپرستی مہیا کررہے ہیں۔

مثال یہ ہے کہ جب عمران خان نے دھرنا شروع کیا تو وہ برابر ''ایمپائر کی انگلی'' کے انتظار میں رہے کہ کب آرمی مداخلت کرتی ہے اور نواز شریف کی حکومت گرے۔ نئے الیکشن ہوں' عمران خان کامیاب ہوں اور حکومت بنائیں۔ بالکل اسی طرح جیسے 1998ء میں عمران

خان کی جماعت کے لوگ جی ڈی اے کا حصہ ہوتے ہوئے میرے پاس آئے تھے کہ میں بھی سازش کا حصہ بن جاؤں لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔

دراصل پاکستان کے اندر ایک ڈیپ سٹیٹ(Deep State) موجود ہے جو اس طرح کے سیاسی کھیل کھیلتی رہتی ہے۔ جب ہنگامہ عروج پر تھا' تو جنرل راحیل نے عمران اور قادری کو بلا بھیجا۔ یہ دونوں اچھلتے کودتے آرمی ہاؤس پہنچے کہ بس کام بن گیا لیکن جنرل راحیل نے یہ کہہ کر ان کے سروں پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا کہ "برادر محترم' یہ ہنگامہ ختم کرو' جاؤ نواز شریف سے معاملات طے کرلو۔"

آرمی چیف کی توسیع پر غیر ضروری ہنگامہ:

سوال:۔۔۔ پچھلے چند مہینوں سے ملکی اداروں کے درمیان ایک ہنگامہ سا برپا ہے' خصوصا آرمی چیف کی مدت ملازمت میں توسیع کے حوالے سے۔ آپ نے بھی اس پر تبصرہ کیا ہے۔ یہ تو ایک عام سا مسئلہ ہے۔ اسے اتنا پیچیدہ کیوں بنا دیا گیا؟

جواب:۔۔۔ آپ نے درست کہا ہے' یہ ایک عام سا مسئلہ ہے جسے سازشی عناصر اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔ وہ مقصد ہے حکومت کی تبدیلی (Regime Change) کا۔ سالہا سال سے یہ سازشیں روبہ عمل رہی ہیں اس لئے سازشی اس کام میں بڑے ماہر ہو گئے ہیں۔ اس سازشی ٹولے کو ڈیپ سٹیٹ کا نام دیا گیا ہے ۔سوشل سائنسدانوں نے اس کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے:

"The real government that exists beneath the surface, as shadowy conspirators, who use street power, to thwart the agenda of the sitting government, skillfully manipulating the power of the state institutions."

"یہ ریاست کے اندر ایک ایسی مذموم ریاست ہے جو حقیقی ریاست کے پس منظر میں رہ کر کام کرتی ہے اور سازشی عناصر کے تعاون سے برسراقتدار حکومت کے

ایجنڈے کو ناکام بنانے کے لئے انتہائی مہارت سے ریاستی اداروں کو ہی استعمال کرکے عوامی احتجاج کے سہارے اپنے مقاصد حاصل کرتی ہے۔"

دوسری جانب حکومت کے ایوانوں میں بھی کچھ اسی طرح کی کمزوری نظر آئی ہے۔ حکومت نے آرمی چیف کی مدت ملازمت میں توسیع کرنے کے معاملے میں انتہائی لاپرواہی کا مظاہرہ کیا تو سپریم کورٹ نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ حکومت کے لئے سردردی کا سبب ان کے اپنے اقدامات تھے کیونکہ ایسا لگا گویا ان سے کوئی جرم سرزد ہو گیا ہے اور خود ہی آرمی چیف کو توسیع دینے کے اپنے حق سے دستبردار ہو گئی اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا کہ نظریہ ضرورت کے تحت حکومتیں پچھلے ستر سالوں سے اس روایت پر عمل کرتی رہی ہیں۔ مثلاً پانچ آرمی چیفس' تین نیول چیفس اور ایک ائر چیف کو مدت ملازمت میں توسیع دی گئی ہے۔ مصلحتا ایسی روایت کی گنجائش رکھی جاتی ہے تاکہ حکومت ضرورت کے تحت اس سہولت سے استفادہ کر سکے۔

جنرل کیانی کو دی جانے والی توسیع کو سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا تھا لیکن عدالت عالیہ نے یہ کہتے ہوئے اس درخواست کو مسترد کر دیا تھا کہ آئین کے آرٹیکل(3)199 کے تحت یہ مقدمہ ان کے دائرہ اختیار میں نہیں آتا۔ حیرت انگیز صورت حال یہ ہوئی کہ حکومت نے کابینہ' وزیراعظم اور صدر مملکت کی منظوری سے آرمی چیف کو مدت ملازمت میں توسیع دی لیکن چند ہی دنوں بعد حکومت خود مغلوب ہو گئی کہ شاید انہوں نے کوئی غیر آئینی کام کر دیا ہے اور معاملے سے دستبردار ہو گئی۔ عدالت عالیہ نے اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیا حالانکہ یہ معاملہ عدالت کے دائرہ اختیار میں آتا ہی نہیں تھا اور اسے درست کرنے کی ذمہ داری پارلیمنٹ کے حوالے کی گئی ہے۔

☆—☆—☆

باب دہم

حالات حاضرہ پر تبصرے

افغانستان کے خلاف امریکی سازشیں:

افغانستان میں روس اورامریکہ کی شکست جدید عسکری تاریخ کا اہم ترین واقعہ ہے۔ USSR کو 1988 میں اپنی شکست کا اندازہ ہو گیا تھا چنانچہ انہوں نے افغانستان سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے برعکس امریکہ کو اپنی شکست 2012 میں صاف نظر آ رہی تھی لیکن ان میں شکست قبول کرنے کا حوصلہ نہ تھا۔ وہ برے ارادوں کے ساتھ سازشوں میں مصروف ہیں۔ وہ چاہتے یہ ہیں کہ سانپ بھی مرجائے اورلاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔

1989 سے لے کر اب تک امریکہ افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی راہ میں رکاوٹیں ڈالتا رہا ہے اور حال ہی میں جب افغانستان سے نکلنے کے معاہدے پر دستخط کیے گئے تو ''امریکہ' افغانستان میں اسلامی امارت کے قیام کو قبول نہیں کرتا'' جیسے الفاظ بارہ مرتبہ دہرائے گئے۔ اس معاہدے پر کسی امریکی حکومت کے نمائندے کے دستخط بھی نہیں ہیں۔ اس قسم کے جابرانہ رویے سے امریکہ کی ناقص سفارتی سوچ کا اظہار ہوتا ہے جو ایک عظیم طاقت کے شایان شان نہیں ہے۔

افغانستان میں رونما ہونے والے واقعات سے کشمیر میں جاری تحریک آزادی میں نیا ولولہ پیدا ہوگا جیسا کہ 1990 میں روسی انخلاء کے بعد افغانستان میں پیدا ہوا تھا اور یہ تحریک جہادی تحریک میں بدل جائے گی جس سے بھارت کے سامنے صرف دو راستے ہوں گے کہ وہ یا تو کشمیر سے نکل جائے یا پھر اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عمل کرتے ہوئے کشمیری عوام کو ان کا حق خودارادیت دے۔

امریکہ کی طالبان سے مذاکرات کی خواہش:

فروری 2012ء میں امریکی ایمبیسی سے 20 سال بعد مجھے ٹیلیفون آیا کہ سابقہ ڈپٹی

سیکرٹری آف اسٹیٹ (Mr. Richard Armitage) مجھ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔ ان کی درخواست ہے کہ آپ کل ان کے ساتھ ایمبیسی میں لنچ کریں' اس کے بعد بات چیت ہوگی۔ میں نے جواب دیا وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں تو میرے گھر آئیں' میں ایمبیسی نہیں آؤں گا' وہ مان گئے۔ بات ہوئی' ہیلو ہائی کے بعد طے ہوا کہ دوسرے دن گیارہ بجے ملاقات ہوگی۔ یہ وہی Richard Armitage تھے جنہوں نے 2001ء میں نائن الیون (9/11) کے بعد جنرل مشرف کو ٹیلیفون کیا تھا اور ڈرا دھمکا کے ان سے ساتوں شرائط منوالی تھیں جبکہ مشرف اس وقت ملک کی سب سے طاقتور شخصیت تھے۔ میں نے دعا کی ''یا رب یہ شخص جو آج مجھ سے مدد کا طلبگار ہے' وہ کل پاکستان پر جنگ کا عذاب نازل کرنے کی دھمکیاں دے رہا تھا' آج وہ مجھ سے مدد مانگنے آیا ہے' اسے نیچا دکھا دے۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ ان کا مقصد افغان طالبان سے روابط قائم کرنا تھا' اس لئے میں نے اپنی مدد کے لیے کرنل امیر امام (مرحوم) کو بلا لیا تھا۔ دوسرے دن صبح وہ میرے گھر آئے۔ کرنل امام کو دیکھ کر گھبرائے لیکن ان کا تعارف کرایا تو پہچان گئے کہ یہ وہی ہیں جو ہرات میں ہمارے کونسل جنرل رہ چکے تھے۔ انہوں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا کہ وہ امریکی سینٹ کی افغان کمیٹی کے صدر ہیں اور طالبان سے مذاکرات کے خواہش مند ہیں۔ کرنل امام نے کہا کہ یہ ممکن ہے بشرطیکہ آپ خلوص اور اعتماد کے ساتھ مذاکرات چاہتے ہوں۔ کافی تفصیل سے بات ہوئی اور یہ طے ہوا کہ ان کا ہمارے ساتھ رابطہ رہے گا اور امید ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ کرنل امام نے طالبان قیادت سے رابطے کیے اور چند ہفتوں میں انہیں طالبان کی جانب سے پانچ نام مل گئے جن میں تین پختون' ایک تاجک اور ایک ہزارہ شامل تھے۔ وقت اور جگہ کا تعین مشاورت سے ہونا تھا۔ کرنل امام نے یہ خبر امریکی مہمان تک پہنچا دی جن کے ساتھ ای میل پر برابر رابطہ قائم تھا۔ اس معاملے کی پیش رفت سے کرنل امام نے متعلقہ پاکستانی حکام کو بھی باخبر رکھا۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک دن کرنل امام' ونگ کمانڈر خالد خواجہ کو ساتھ لے کر آئے

جو پاکستانی جہادیوں سے رابطے میں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ بی بی سی چینل 4 سے انہیں ٹاسک ملا ہے کہ وہ پاکستانی اور افغانی طالبان پر ڈاکومنٹری (Documentary) بنائیں اور اس مقصد کے لئے بہت جلد وہ سرحدی علاقوں کا دورہ کریں گے۔ میں نے انہیں خبردار کیا کہ ہماری سرحدیں غیر محفوظ ہیں اور دشمن کے ایجنٹوں سے بھری ہوئی ہیں' وہاں جانا خطرناک ہوگا۔ انہوں نے کہا وہاں ان کے اچھے دوست ہیں جو ان کا خیال رکھیں گے۔ میں نے کرنل امام سے پوچھا کہ آپ تو ان کے ساتھ نہیں جا رہے۔ انہوں نے کہا ہرگز نہیں۔ لیکن چند دنوں بعد مجھے بتایا گیا کہ دونوں حضرات اپنے مشن پر روانہ ہو چکے تھے' مجھے حیرت ہوئی۔ تین دنوں بعد خبر آئی کہ میران شاہ سے میر علی جاتے ہوئے دونوں کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا اس کی رپورٹنگ پریس میں ہوتی رہی اور بالآخر دونوں کو شہید کر دیا گیا۔ اناللہ واناالیہ راجعون۔

اس پورے واقعے کے پیچھے وہی سازش کارفرما نظر آتی ہے جو رچرڈ آرمیٹج کی طالبان سے روابط کی پیش رفت کو ناکام بنانے کے لئے کی گئی۔ انہوں نے جب یہ بات متعلقہ حکام کو بتائی تو وہی منفی سوچ رکھنے والے عناصر حرکت میں آئے جنہوں نے پاکستانی طالبان کے ساتھ ہمارے مذاکرات سبوتاژ کئے تھے۔ مثلاً مولوی نیک محمد' بیت اللہ محسود اور حکیم اللہ محسود کو قتل کیا گیا۔ یہاں تک کہ ملا منصور کو بھی مار ڈالا' اس لئے کہ وہ مذاکرات کے حامی تھے۔ اس سازش میں بی بی سی کو بھی استعمال کیا گیا' خواہ یہ کام انہوں نے اپنے کاروبار کا حصہ سمجھ کر کیا ہو اور ستم ظریفی دیکھئے کہ اس واقعے کے چھ سال گزر جانے کے بعد اب امریکہ' طالبان سے مذاکرات کے لئے بے تاب ہے' اس لئے کہ طالبان کے تابڑ توڑ حملوں سے افغانستان میں موجود امریکی فوج اور اس کے سازشی عناصر خوف و ہراس میں مبتلا ہیں اور جنگ کو مزید طول دینے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

طالبان اور امریکہ کے درمیان مذاکرات اور جنگ کی صورت حال کافی دلچسپ ہے۔ پچھلے کئی سالوں میں امریکہ اور طالبان کے درمیان مذاکرات ناکام ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ امریکہ افغانستان سے نکلنے کے بعد کچھ عرصہ تک اپنے فوجی وہاں رکھنا چاہتا ہے مگر طالبان

اس بات پر راضی نہیں ہیں۔ متعدد بار مذاکرات ہوئے اور ناکام ہوئے۔ امریکہ کے اس دباؤ کے ردعمل میں طالبان نے امریکی اور حکومتی تنصیبات پر حملوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے اور ان کی بالادستی قائم ہے۔ ان حالات کے تحت فریقین کے درمیان ابھی تک معاہدے کی تیاری کے سلسلہ میں خاطر خواہ پیش رفت نہیں ہوئی ہے لیکن مذاکرات جاری ہیں اور فریقین کے ورکنگ گروپس کی جانب سے پیش کی گئی تجاویز پر غور و خوض جاری ہے۔ طالبان اپنے موقف پر قائم ہیں کہ:

- ☆ ہمیں اور افغان قوم کو آزاد چھوڑ دو تاکہ ہم سب مل کر اپنے مستقبل کا فیصلہ کر سکیں۔
- ☆ چھ ماہ کے اندر اندر افغانستان سے نکل جاؤ
- ☆ ہم پر جتنی بھی پابندیاں عائد ہیں انہیں ختم کرو
- ☆ ہمارے قیدی رہا کرو
- ☆ افغانستان کی تباہی کے تم ذمہ دار ہو' اس کی تعمیر نو کا وعدہ کرو
- ☆ یاد رکھو کہ 1989ء میں روسیوں کے انخلا کے بعد ہم کو دھوکہ دیا گیا تھا۔ اب ہم کسی دھوکے میں نہیں آئیں گے۔

امریکہ اور طالبان کے درمیان مذاکرات جاری تھے اور آخری مراحل میں کیمپ ڈیوڈ کے مقام پر خفیہ مذاکرات کے بعد اچھی خبر کی توقعات تھیں کہ ٹرمپ نے مذاکرات کو ختم کر دینے کا اعلان کر کے عجیب بے یقینی کی صورت حال پیدا کر دی ہے۔ ایسا کیوں ہوا ہے' اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں: مثلاً:

☆ بھارت کی ضرورت ہے کہ افغانستان میں جنگ جاری رہے تاکہ جہادی کشمیر کا رخ نہ کریں اور پاکستان کے خلاف سازشی نیٹ ورک جو بھارت نے افغانستان میں بنایا ہوا ہے وہ ختم نہ ہو جائے۔

☆ اگر افغانستان میں امن ہوگا تو ایران' چین' روس اور پاکستان کو اپنا اثر و رسوخ بڑھانے میں بڑی کامیابی ہوگی اور امریکہ کی پسپائی ہوگی۔

☆ سی پیک (CPEC) اور ایس سی او (SCO) کی اقتصادی پالیسیاں' افغانستان کے تمام پڑوسی ممالک کو ایک مربوط نظام میں منسلک کر کے امریکہ اور بھارت کے پچھلے بیس سالوں کے منصوبوں کو ناکام بنادیں گی۔

☆ امریکہ کے لئے افغانستان میں کامیابی کے امکانات نہیں ہیں' اس لئے کہ امریکہ جنگ ہار چکا ہے' اس کی پوزیشن کمزور ہے اور پسپائی کے علاوہ اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

اہم ترین بات یہ ہے کہ طالبان افغانستان میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں جو امریکہ اور اس کے مغربی حواریوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے کیونکہ یہ حکومت جہادی افغانستان، انقلابی ایران اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سہ فریقی اتحاد کا پیش خیمہ ثابت ہوسکتی ہے۔ یہ اتحاد پوری امت مسلمہ کے لیے باعث تقویت ہوگا اور بین الاقوامی تنظیموں کے پلیٹ فارم پر مشترکہ موقف اختیار کرنے سے ان کی آواز بھی زیادہ موثر ہوگی۔ امکان یہ ہے کہ وسطی ایشیاء، مشرق وسطی اور افریقہ کے مزید ممالک بھی اس اتحاد میں شامل ہوجائیں گے اور یہ مزید طاقتور ہوجائے گا۔

طالبان نے پہلے ہی اس منصوبے پر عمل درآمد شروع کردیا ہے۔ افغانستان کے 80 فیصد علاقے پہلے ہی ان کے کنٹرول میں ہیں۔ کرزئی کی حکومت کابل اور اردگرد کے شہروں تک محدود ہے جن پر طالبان کسی بھی وقت قبضہ کرسکتے ہیں۔ امریکہ کئی برسوں سے اپنی کٹھ پتلی حکومت کو سہارا دیے ہوئے ہے لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج نہیں نکل سکے۔ افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام ناگزیر ہے دنیا کی کوئی طاقت اسے روک نہیں سکتی۔ ان شاء اللہ۔

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ طالبان پاکستان کی سلامتی کے لیے خطرہ ہیں۔ یہ انتہائی غلط تصور ہے۔ ایک غیر مستحکم اور غیر منضبط افغانستان، جہاں دہشت گرد ہتھیار لہراتے، آزادی سے گھومتے پھرتے ہوں، پاکستان کے لیے خطرے کا باعث ہوسکتا ہے لیکن مستحکم اور منضبط افغانستان پاکستان اور اردگرد کے ممالک کے لیے باعث تقویت ہوگا۔ حالیہ تاریخ اس حقیقت

کی گواہ ہے کہ طالبان حکومت کے پانچ سالوں میں افغانستان امن کا گہوارہ تھا۔ امن و امان کی صورت حال تسلی بخش تھی۔ عام شہریوں سے ہتھیار لے لیے گئے تھے۔ امریکہ نے افغانستان میں افیون کی کاشت ختم کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور لاکھوں ڈالر خرچ کرنے کے باوجود انہیں کامیابی نہ ملی۔ ملا عمر کے ایک حکم پر پوست کا صفایا ہوگیا۔ طالبان رہنماؤں نے بارہا یہ کہا ہے کہ روسیوں کی پسپائی کے باوجود ان سے غداری اور اسلام دشمن امریکہ کی حمایت کے باوجود وہ پاکستان کو اپنا دشمن نہیں سمجھتے۔ ہماری سلامتی کے تقاضے اور منزلیں ایک ہیں۔

ٹرمپ کا افغانستان سے نکلنے کا منصوبہ:

سوال:...... حالیہ دنوں میں امریکہ اور طالبان کے درمیان مذاکرات میں "افغانستان سے انخلاء کا امریکی منصوبہ" طے پایا ہے۔ اس منصوبے کے بارے میں آپ کا تجزیہ کیا ہے؟

جواب:...... حقیقت میں تو یہ منصوبہ آج سے آٹھ سال قبل 2012ء میں اس وقت آنا چاہیے تھا جب امریکہ پر واضح ہوگیا تھا کہ وہ افغانستان کی جنگ ہار چکا ہے۔ انہوں نے سینیٹ کی افغانستان کمیٹی کے سربراہ رچرڈ آرمیٹج کو طالبان کے ساتھ مذاکرات کے امکانات کا جائزہ لینے کے لئے پاکستان بھیجا۔ وہ مجھ سے ملے اور ہم نے طالبان کو مذاکرات کے لئے اپنے نمائندے نامزد کرنے پر رضامند کرلیا تھا لیکن پینٹاگون نے آرمیٹج کو مزید پیش رفت سے روک دیا۔ لیکن اب بھی ٹرمپ کے پیش کردہ منصوبے پر عمل درآمد کے حوالے سے اتنی دیر نہیں ہوئی۔

اس منصوبے کا اہم پہلو طالبان کے جانب سے امن کی ضمانت سے اٹھارہ ماہ کے عرصے میں امریکی فوجوں کا افغانستان سے انخلاء مکمل کرنا ہے اور افغان حکومت کے تحویل سے پانچ ہزار طالبان قیدیوں کی رہائی ہے۔ اس منصوبے میں منفی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مثبت اشارے بھی ہیں جو امن کی راہوں کا تعین کریں گے۔ امید کی جاتی ہے کہ منفی پہلوؤں کے مقابلے میں مثبت پہلوؤں کو سبقت حاصل ہوگی۔

منفی پہلوؤں کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے:

☆ امریکی انخلاء کا یہ منصوبہ بھارت کے لئے خاصے صدمے کا باعث بنا ہے۔ لہٰذا این ڈی ایس (NDS) اور را (RAW) باہمی اشتراک سے پاکستان اور دیگر ہمسایہ ممالک میں دہشت گرد کارروائیاں کر کے طالبان کو بدنام کرنے کی کوشش کریں گے کیونکہ بھارت اس منصوبے کو آئی ایس آئی (ISI) کی کامیابی سمجھتا ہے اور اس منصوبے کی کامیابی سے پاکستان کی مغربی سرحدیں پرسکون ہو جائیں گی۔ یہی حقیقت بھارت کو ہضم نہیں ہو رہی ہے۔

☆ اندرون ملک 'اشرف غنی' جنگی سردار اور دیگر چھوٹے چھوٹے گروپ ملک میں طالبان کی حکومت کے قیام کی مخالفت کریں گے۔ ان کی کوشش ہوگی کہ افغانستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے لئے' مشترکہ کوششوں کے ذریعے انٹرا افغان مذاکرات ناکام ہو جائیں۔ اگر انٹرا افغان مذاکرات کامیاب ہوتے ہیں تو یہ بات مستقبل میں افغانستان میں حکومت کے لئے مضبوط بنیاد بنے گی۔

☆ امریکہ بذات خود بھی افغانستان میں اسلامی مملکت کے قیام کی راہ میں مزاحمت کرے گا کیونکہ امن منصوبے میں سترہ (17) مرتبہ ان الفاظ کی تکرار کی گئی ہے کہ "امریکہ افغانستان میں اسلامی مملکت کے قیام کو منظور نہیں کرتا۔" مزید برآں منصوبے پر کسی امریکی حکومتی عہدیدار کے دستخط بھی نہیں ہیں' تاکہ حکومت کے لئے بعد میں یوٹرن (U-Turn) لینا آسان ہو۔

☆ ایک خاص مقصد کی خاطر امریکی اور اتحادی فوجوں کے انخلاء کے لئے اٹھارہ ماہ کے عرصے کی شرط رکھی گئی ہے اور در پردہ عزائم کی خاطر اچھی خاصی تعداد میں فوج موجود رہے گی۔ یہ ایک سازش ہے' اسی وجہ سے ایران نے اس منصوبے کو مسترد کر دیا ہے اور ترکی نے بھی روس کو شام سے نکل جانے کا کہا ہے۔

☆ 1989-90ء میں افغانستان سے روسی فوجوں کے انخلاء کے بعد جن ممالک نے وہاں پر اسلامی مملکت کے قیام کی مخالفت کی تھی؛ وہی اب بھی اس امر کی مخالفت کر رہے ہیں

کیونکہ ایک جہادی افغانستان؛ انقلابی ایران اور اسلامی پاکستان مل کر ایک تذویراتی محور بن جائیں گے جو تمام اسلامی دنیا کی سلامتی کی ضمانت ہوگا۔

مثبت پہلو مجھے زیادہ مضبوط نظر آتے ہیں' مثلاً:

☆ امریکی اس طویل جنگ سے تھک چکے ہیں اور طالبان کے ہاتھوں اٹھائی جانے والی شرمناک شکست پر افسردہ ہیں۔ وہ "باعزت انخلاء چاہتے ہیں' قبل اس کے کہ انہیں ذلت آمیز پسپائی پر مجبور ہونا پڑے۔ افغانستان میں امریکہ کو ویتنام جیسی صورت حال کا سامنا ہے۔" امریکہ افغانستان سے نکلنا چاہتا ہے لیکن شرمندگی سے بچنے کے لئے ہی اس نے فوجوں کے انخلا کے لئے اٹھارہ ماہ کی مدت مانگی ہے۔

☆ طالبان سے متعدد ضمانتیں مانگی جا رہی ہیں مگر ان کی قوت منتشر ہے اور ان کی حکمرانی میں کوئی ادارہ جاتی نظم نہیں ہے کہ وہ ایسی ضمانتیں اتنی جلدی فراہم کر سکیں۔ انہیں استحکام حاصل کرنے کے لئے وقت درکار ہے۔ یہی وہ "خطرناک وقفہ" ہے جس کو استعمال کر کے امن مخالف قوتیں' اس منصوبے کو ناکام بنانے کی کوشش کریں گی۔

☆ وقت اور ماحول (Time and Space) کو جنگی نکتہ نگاہ سے بڑی اہمیت حاصل ہے اور ان دونوں عناصر کو طالبان نے بڑی دانشمندی سے استعمال کیا ہے۔ امریکہ کو فضائی سبقت حاصل ہے لیکن یہ برتری جنگ میں فتح کے لئے مددگار نہیں ہے۔ چالیس سالہ ظالمانہ تصادم کے باوجود طالبان جنگ سے تھکے نہیں اور حالیہ دنوں میں اشرف غنی کی فوجوں کے خلاف انہوں نے تیرہ (13) صوبوں میں کامیاب کارروائیاں کرتے ہوئے تینتیس (33) اہداف کو نشانہ بنایا ہے جبکہ امریکہ فضائی کارروائیاں کر کے طالبان کو حکومتی فوجوں کے خلاف حملوں سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔

☆ 1989-90ء کے عرصے میں مجاہدین کے سات (7) جنگی کمانڈر اور دو (2) سرپرست تھے' آئی ایس آئی (ISI) اور سی آئی اے (CIA) جبکہ اس وقت ان کا صرف ایک کمانڈر ہے اور وہی سرپرست بھی ہے اور رہبر بھی ہے۔ طالبان کی کمانڈ کا شمالی ڈھانچہ مزار

شریف سے بدخشاں تک کے علاقے ملا عمر کے بیٹے کی کمان میں ہیں اور ہرات سے نورستان تک کے جنوبی علاقے سراج الدین حقانی کی انتہائی مضبوط کمان میں ہیں۔ طالبان کی کمانڈ کا ہیڈکوارٹر صوبہ قندوز میں ہے۔ افغانستان کے اسی فیصد علاقوں پر انہیں کنٹرول حاصل ہے جہاں پر شریعتی قوانین نافذ ہیں۔ یعنی ایک پورا حکومتی نظام موجود ہے۔

☆ طالبان کے جنگجوؤں کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے جو گذشتہ چالیس سالوں کے دوران پیدا ہوئے اور جنگ کے سایے میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ یہ جنگجو نہ صرف بہادر اور سخت جان ہیں بلکہ ملا عمر کے نظریے سے غیر متزلزل طور پر منسلک ہیں۔ 2003 میں میرے ایک سوال کے جواب میں ملا عمر نے اپنے نظریے کی تشریح ان الفاظ میں کی تھی:

> ''ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آزادی کے لئے جنگ جاری رکھیں گے کیونکہ ہمارا قومی نظریہ حیات' روایات اور ملی غیرت قابض فوجوں کے ایجنڈے کو قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ ہم جنگ جاری رکھیں گے اور انشاء اللہ فتحیاب ہوں گے اور ملک میں ایسی اسلامی حکومت قائم کریں گے جو نہ صرف ہمسایہ ممالک بلکہ دیگر تمام ممالک سے دوستانہ تعلقات رکھے گی۔'' پاکستان نے اس موقع پر ہمارا ساتھ نہیں دیا لیکن اس کے باوجود ہم ہمیشہ پاکستان کے ساتھ مل کر اپنے قومی مفادات کا تحفظ یقینی بنائیں گے۔''

سراج الدین حقانی کی حالیہ تحریر میں ملا عمر کے اس نظریے کی واضح تصویر دکھائی دیتی ہے جو سیاسی بصیرت کی غماز ہے اور افغانستان میں آئین و قانون کے تابع حکومت کے قیام کی ضمانت دیتی ہے اور عوام کے جذبہ حریت کی مکمل پاسداری کی بھی یقین دہانی کراتی ہے جنہوں نے صرف چار دہائیوں کے مختصر عرصے میں دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کو شکست سے دوچار کیا ہے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔

ٹرمپ کا منصوبہ پیچیدگیوں اور فریب کا مجموعہ ہے جس میں قوت اور کنٹرول پاس رکھنے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ افغانستان میں اسلامی حکومت کے قیام کو روک بھی سکے اور امریکہ

کے پرامن انخلاء کی بھی ضمانت ہو۔ یہ دو اہداف باہم متصادم ہیں جو اس قسم کے باعزت انخلاء کو ناکام بنادیں گے۔ ٹرمپ کو روس کی مثال سامنے رکھنی چاہیے جنہوں نے 1989 میں افغانیوں کے ساتھ باوقار اور باہمی خیرسگالی کی بنیاد رکھ کر انخلاء ممکن بنایا۔

داعش کیا ہے؟

سوال:...... چند سالوں سے عالم اسلام کو داعش کا خطرہ درپیش ہے۔ کہا جا رہا ہے کہ داعش کو شام اور عراق میں ختم کر دیا گیا ہے۔ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ داعش دیگر ممالک میں بھی پھیل جائیں گے۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب:...... اس سوال کا جواب دینے سے قبل ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ داعش کون ہیں اور کیسے اچانک نمودار ہوئے۔ داعش کا پہلی مرتبہ ظہور آج سے چودہ سو سال قبل خوارج کی شکل میں اس وقت ہوا جب اسلام کے ابتدائی دور کے دو گروہوں میں آپس کی جنگ شروع ہوئی اور دوسری مرتبہ اس کا قیام ابوبکر بغدادی کی زیر قیادت شام کی باہمی لڑائی کے خلاف ہوا۔ 2014ء میں داعش تین بڑے گروہوں' یعنی شامی' عراقی اور احمد خیشگی کی سربراہی میں تین تا چار ہزار سعودی جنگجوؤں پر مشتمل تھی۔ اب شام میں انہیں شکست ہو چکی ہے لیکن وہ بدستور ان دونوں ممالک کے لیے خصوصا اور گذشتہ تین دہائیوں میں جنگ کی تباہ کاریوں سے متاثر ممالک کے لیے خطرے کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

داعش کا ابھرنا عالم اسلام کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے' البتہ دوسروں کے لئے یہ ایک عجوبہ ضرور ہے۔ داعش کے ظہور میں آنے کا سبب وہ مظالم' نفرت اور محرومیاں و ناانصافیاں ہیں جو ایک عرصے سے ایک مخصوص طبقے کے لوگوں کے ساتھ روا رکھی جا رہی ہیں۔ اب وہی محروم اور پسے ہوئے لوگ اپنے انداز سے ان ناانصافیوں کا انتقام لینے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس قسم کا پہلا واقعہ سینتیسویں ہجری (H 37) میں خوارجیوں کی شکل میں رونما ہوا جنہوں نے نہروان کے مقام پر خلیفہ اسلام حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خلاف جنگ لڑی تھی۔ ان کے غصے کی وجہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی حضرت عائشہؓ اور

حضرت معاویہ کے خلاف لڑی جانے والی جنگ جمل اور جنگ صفین تھی جس میں عالم اسلام کی یہ مقتدر ترین اور قابل احترام ہستیاں ایک دوسرے کے خلاف مد مقابل تھیں۔ اس بنا پر خارجی ان سے متنفر ہو گئے تھے۔

حزب اللہ۔اسرائیل جنگ:

حزب اللہ اور اسرائیل کے درمیان جنگ میں عرب ممالک کے لیے ایک سبق ہے۔ 2006ء میں جب اسرائیل، ایران اور حزب اللہ کو دھمکیاں دے رہا تھا تو ایران کا ایک وفد مجھ سے ملنے آیا اور اس معاملے میں مجھ سے رہنمائی چاہی۔ میں نے انہیں بتایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ان کے پاس موثر جواب دینے کی صلاحیت موجود ہے لیکن انہیں چاہیے کہ وہ امریکی تنصیبات پر حملہ کر کے پرل ہاربر جیسی مصیبت مول نہ لیں۔ انہیں اپنی تمام تر توجہ اسرائیل پر مرکوز رکھنی چاہیے اور انہیں چاہیے کہ اسرائیل کے فضائی دفاعی نظام پر میزائلوں کے حملے کریں۔ ایرانی وفد ابھی پاکستان میں ہی تھا جب رائٹر نیوز ایجنسی کے کچھ صحافی مجھ سے ملنے آئے۔ انہوں نے پوچھا کے کیا مذاکرات ہوئے۔ میں نے بتایا کہ اگر اسرائیل نے جنگ شروع کی تو ایران راکٹوں سے جواب دے گا۔

جنگ کے کچھ دنوں بعد امریکہ کے واشنگٹن پوسٹ میں یہ خبر شائع ہوئی کہ پاکستانی فوج کے سابق سربراہ نے ایران کو مشورہ دیا ہے کہ وہ اسرائیل پر راکٹوں سے حملہ کریں اور اسے یرغمال بنالیں۔ اسرائیل نے آسان ہدف سمجھ کر حزب اللہ پر حملے کئے۔ حزب اللہ نے جواباً راکٹ برسائے، جنہیں روکنا اسرائیل کے فضائی نظام کے بس کی بات نہیں تھی۔ یہ حملے آہستہ آہستہ تل ابیب کی طرف بڑھتے گئے۔ اسرائیلی شہری خوف زدہ ہو کر بھاگے اور قبرص میں جا کر پناہ لی۔ سینکڑوں نے امریکی بحری جہازوں میں پناہ لی۔ یہ اسرائیل کے لئے بڑے خطرے کی بات تھی۔ اس نے اپنے زمینی دستوں کو حکم دیا کہ وہ حزب اللہ کے میزائل کے ٹھکانوں کو تباہ کریں۔ حزب اللہ کے مجاہدین نے ان کا مقابلہ کیا اور انہیں پسپائی پر مجبور کر دیا۔ بالآخر جنگ بند ہو گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل کے پاس حزب اللہ کے راکٹوں کے خلاف

کوئی دفاع نہیں ہے۔ یہاں تک کہ روس کا S-400 فضائی دفائی نظام بھی ان راکٹوں کے سامنے بے بس ہے۔ ایران ایک بڑی قوت ہے۔ اسرائیل ان سے نہیں لڑ سکتا۔ ایران، حزب اللہ، حماس اور یمنیوں کے پاس یہ راکٹ لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کے پاس ڈرونز بھی ہیں۔ لیکن سب سے مہلک ہتھیار "خودکش بمبار" ہیں جنہیں اسرائیل روک نہیں سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسرائیل نے ایران پر حملہ کیا تو خود اس کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔

امریکہ اور ایران کے تعلقات میں کشیدگی:

سوال:...... سعودی عرب کی تیل کی تنصیبات پر میزائل اور ڈرون کے حملے نے مشرق وسطی کے تذویراتی توازن کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے اور اب زیر عتاب ایران اس تذویراتی نظام کا مرکز بن گیا ہے اور ساتھ ہی امریکی فضائی دفاعی نظام (Iron-Dome) بھی ناکارہ ثابت ہوا ہے۔ اس پر کیا تبصرہ کریں گے؟

جواب:...... اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تیل کی تنصیبات پر ڈرون سے ہونے والے حالیہ حملے نے سعودی عرب کی قومی سلامتی کا پول کھول دیا ہے جو اربوں ڈالر کی لاگت سے امریکی "آئرن ڈوم" مہیا کر رہا تھا۔ ایک ہی حملے نے مشرق وسطی میں آٹھ امریکی عسکری اڈوں اور سعودی عرب، متحدہ عرب امارات اور دیگر عرب ممالک کی سلامتی کے نظام کو بے نقاب کر کے رکھ دیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صدر ٹرمپ کی جانب سے "Locked and Loaded" کے اعلان کو اہل دانش نے مسترد کر دیا ہے جو نہیں چاہتے کہ "امریکی فوجیں، سعودی عرب کے زرخرید غلاموں کا کردار ادا کریں۔" اسی سبب ایران بھی "اقتصادی جنگ، پابندیوں اور مزید پابندیوں" کی وجہ سے اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتے ہوئے اپنا تحفظ خود کرنے کے اصول کو اپنا چکا ہے اور اب اس کے خلاف کسی کو بھی جنگ کرنے کی جرات نہیں ہے۔

2007ء کی اسرائیل حزب اللہ جنگ اس کی ایک واضح مثال ہے جہاں امریکہ کا آئیرن ڈوم فضائی دفاع کا نظام (Iron-Dome Air Defense System)، حزب

اللہ کے فری فلائنگ راکٹوں (Free Flying Rockets) کے مقابلے میں شکست کھا گیا تھا اور اسرائیل جنگ ہار گیا۔ اعلیٰ تکنیکی (Hi-Tech) اور مہنگے ترین ہتھیاروں کا یہی جبر ہے کہ وہ سادہ اور کم قیمت ہتھیاروں کے مقابلے میں بے بس ہیں اور شکست کھا جاتے ہیں۔

اطلاعات کے مطابق یمن کے حوثیوں نے تقریباً ایک ہزار کلومیٹر کے فاصلے سے 22 ڈرون اور کروز میزائل داغے جن میں سے اٹھارہ نے ابقیق (Abqaiq) کو نشانہ بنایا اور چار نے اس کے قریب خریص (Khumrais) کو نشانہ بنایا جس کی وجہ سے متعدد دھماکے ہوئے اور آگ کے شعلے بلند ہوئے جن پر قابو پانے میں کئی گھنٹے لگے۔ سعودی عرب کا بہت بڑا نقصان ہوا۔

مجھے یاد ہے کہ صدر کلنٹن نے 1998ء میں افغانستان میں اسامہ بن لادن کی پناہ گاہ پر بارہ سو کلومیٹر کے فاصلے سے کروز میزائل فائر کئے تھے ان میں سے ستر میزائل اپنے ہدف کے علاقے میں گرے جبکہ باقی ایک سو پاکستان کے سرحدی علاقوں میں گرے جن میں سے بہت سے میزائل اچھی حالت میں تھے جو پاکستانی ہنرمندوں نے اٹھا لئے اور ان کی ریورس انجینئرنگ (Reverse Engineering) کر کے ٹوموہاک (Tomo Hawk) میزائل کا ابتدائی نمونہ تیار کر لیا تھا۔ اب یہ صلاحیت صرف امریکیوں ایرانیوں اور پاکستانیوں ہی کے پاس ہے۔ پاکستان اس کی رینج (Range) دو ہزار کلومیٹر تک بڑھا رہا ہے تاکہ بھارت کی آخری سرحدیں بھی اس کی زد میں ہوں گی۔

اب پومپیو کہتے ہیں کہ "ہمارا مقصد ایران کے خلاف جنگ سے اجتناب کرنا ہے۔ ہم خطے میں مزید فوجی بھیج رہے ہیں تاکہ جارحیت کو کنٹرول کیا جا سکے۔" اس کا مقصد عربوں کو جھوٹی تسلیوں کے سہارے بے وقوف بنانا ہے۔ ادھر ایران نے خبردار کیا ہے کہ "ہم گذشتہ چالیس سالوں سے ثابت قدم رہے ہیں اگر کسی ملک نے ایران پر حملہ کرنے کی جسارت کی تو وہی ملک میدان جنگ بنے گا۔" حالات انتہائی تباہی کی جانب جا رہے ہیں اور میدان سج چکا ہے۔ اس کے برعکس پاکستان کی نرم گفتاری کے سبب بھارت کا آرمی چیف ہماری تذویراتی

تنصیبات پر حملے کی دھمکی دے رہا ہے اور ہم اس کے بیان کی وضاحتیں مانگ رہے ہیں۔

عربوں کے پاس اپنی حساس تنصیبات کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لئے قابل اعتماد دفاعی نظام حاصل کرنے کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایران کے ساتھ 2015ء کے ایٹمی معاہدے کو ختم کرنے کے بعد امریکہ اب خواہش مند ہے کہ ایران کو مزید پابندیوں پر مبنی نیا معاہدہ قبول کرنے پر مجبور کر سکے۔ دوسری جانب اقتصادی جنگ کا شکار ایران خلیج سے تیل کی تجارت میں رخنہ ڈال کر امریکہ اور اس کے عرب اتحادیوں کے لئے بہت بڑا خطرہ بن سکتا ہے۔" اس پھیلتی ہوئی صورت حال کو مزید پھیلا کر صورت حال میں غیر دانشمندانہ اضافہ ہی کرتا ہے جو ذلت آمیز پسپائی کا سبب بن سکتا ہے۔"

اسرائیلی دفاعی تجزیہ نگار اوزی روبن (Uzi Rubin) اور ایرن ایٹزیون (Eran Etzion) کا کہنا ہے کہ ایران نے طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائل اور راکٹ تیار کر لئے ہیں جو درست سمت گائیڈ کرنے کے نظام سے لیس ہیں اور تذویراتی اہداف کو بخوبی نشانہ بنا سکتے ہیں۔ ایران نے ایسے میزائل اسرائیلی سرحدوں کے نزدیک اور مشرق وسطیٰ میں متعدد ایسے مقامات پر نصب کر رکھے ہیں جو خطے کے تذویراتی توازن کو بدل سکتے ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ امریکہ سمیت کوئی ملک ایران کا مقابلہ نہیں کر سکتا" جس کے خطے میں آٹھ عسکری ٹھکانے بھی ان میزائلوں کی زد میں ہیں۔ "حزب اللہ اکیلے ہی تل ابیب کے کچھ حصے تباہ کر سکتا ہے۔ یہی وہ صلاحیت ہے جسے گیم چینجر (Game Changer) کہتے ہیں۔ اسرائیل کی جنگ لڑنے کی صلاحیت کو توڑنے کے لئے انہیں حزب اللہ کے صرف دو سو ایسے میزائلوں کی ضرورت ہوگی۔" یہی وجہ ہے کہ صدر ٹرمپ اب ایرانی صدر روحانی سے ملنے کے خواہش مند ہیں تاکہ الجھی ہوئی صورت حال کا کوئی حل نکالا جا سکے۔

ٹرمپ کے یار غار مودی کو بھی کچھ ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہے کیونکہ اب کشمیر کے حریت پسندوں کی مدد کے لئے دنیا بھر کے ممالک سے جہادیوں کی آمد شروع ہوگی۔ اس جنگ کا فیصلہ واشنگٹن میں نہیں بلکہ یہاں ہی ہوگا۔ لہٰذا دانشمندی کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

پومپیو کا کہنا ہے کہ "امریکہ سفارت کاری کو کامیاب کرنے کا ہر موقع دے گا" کیونکہ مغربی ایشیا میں تذویراتی برتری کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ دوسری جانب ایرانی صدر حسن روحانی جنرل اسمبلی کے اجلاس میں "ہرمز امن اقدامات" (Hormuz Peace Endeavour (PEACE) کا اعلان کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں جو ایک اہم پیش رفت ہے۔

ماضی کے کچھ درخشاں حقائق ہیں جنہیں ہمیشہ یاد رکھا جانا چاہیے کہ کس طرح معمولی ہتھیاروں نے جنگ کے رخ بدل دیے ہیں، مثلاً:

☆1987ء میں اسٹنگر میزائلوں نے روس کو افغانستان سے پسپائی پر مجبور کر دیا تھا۔

☆1995ء میں بوسنیا کے مسلمانوں نے (Green Arrow Anti Tank Missiles) کی مدد سے سربیا کے قاتلوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا تھا اور جنگ ختم ہو گئی۔

☆2007ء میں فری فلائنگ راکٹوں کی وجہ سے حزب اللہ نے اسرائیل کو شکست دی تھی۔

ایران، شام، عراق، لبنان اور غالباً یمن کے حوثیوں کے پاس بھی اسی طرح کے گائیڈنس کے نظام سے لیس میزائل اور ڈرونز ہیں جس کے سبب پورے مشرق وسطیٰ کا تذویراتی توازن تبدیل ہو چکا ہے۔ پاکستان کے پاس بھی اپنا تذویراتی توازن قائم رکھنے کے لئے ایٹمی قوت کی بجائے ایسے ہی ہتھیاروں پر انحصار بہت سود مند ہوگا۔

سوال:...... کشمیر کے حوالے سے بھارت کے ساتھ ہمارے معاملات نرم پالیسی کا شکار نظر آتے ہیں جبکہ آپ کا کہنا ہے کہ "پاکستان کے لئے ایسے ہی ہتھیاروں پر انحصار ہمارے لئے بہت سود مند ہوگا" اس کی وضاحت کرنا چاہیں گے؟

جواب:...... ہمارے پاس کھلے آپشن موجود ہیں کہ کس طرح اس جمود کو توڑا جا سکتا ہے۔ لائن آف کنٹرول پر بھارت کی اشتعال انگیزیاں اور کشمیریوں پر ظلم و بربریت کو روکنا ضروری ہے۔ کچھ ویسی ہی کاری ضرب لگانے کی ضرورت ہے جیسے ایران نے لگائی ہے اور ترکی نے امریکہ کی پرواہ کئے بغیر شام کی سرحدوں کے ساتھ اپنے مفادات عسکری قوت سے

حاصل کئے۔ ہمیں اس ضمن میں سخت اقدامات کرنا لازم ہیں کیونکہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔

جنرل قاسم سلیمانی کے قتل کے بعد صورت حال:

سوال:...... امریکہ نے جنرل قاسم سلیمانی کا سفاکانہ قتل کیا۔ اس قتل کے محرکات کیا ہوں گے اور ایران کا متوقع ردعمل کیا ہوگا۔ کیا کسی بڑی جنگ کے امکانات ہیں یا یہ جنگ مشرق وسطیٰ تک محدود رہے گی؟

جواب:...... جنرل قاسم سلیمانی ایرانی فوج کے اعلیٰ ترین عہدے دار تھے جو مشرق وسطیٰ کے ساتھ ساتھ افغانستان میں بھی جاندار کردار کے حامل تھے۔ درحقیقت آج مشرق وسطیٰ میں انہیں طاقتور ترین شخصیت سمجھا جاتا تھا۔ امریکی خفیہ ایجنسی کے مطابق جنرل سلیمانی امریکی فوجیوں اور خطے میں امریکی مفادات پر حملوں کی وسیع پیمانے پر منصوبہ بندی کر رہے تھے لہٰذا امریکہ نے انہیں ختم کرنا ضروری سمجھا۔ جنرل قاسم سلیمانی کو قتل کرنے کے لئے ڈرون کیو نائن ریپر (Q-9 Reaper) استعمال کیا گیا جو 2007ء سے زیر استعمال ہے اور معنی خیز صلاحیتوں کا حامل ہے۔ یہ ڈرون عراق میں امریکی فوجی اڈے سے داغا گیا جسے بارہ ہزار کلومیٹر دور ناویڈا (Nevada) سٹیٹ سے امریکی سائبر کمانڈ کنٹرول کر رہی تھی۔ "درحقیقت جنرل سلیمانی کا قتل موساد نے کیا ہے، ٹرمپ نے تو صرف ٹریگر دبایا ہے۔" موساد تو ایران کے پانچ ایٹمی سائنسدان پہلے ہی قتل کر چکا ہے۔

ایران کے پاس بھی کیو نائن ریپر جیسی صلاحیت کے حامل ڈرون ہو سکتے ہیں کیونکہ چند سال قبل ایران نے فضائی خلاف ورزی کرنے والا ایک ایسا ہی ڈرون مار گرایا تھا اور اس کی ریورس انجینئرنگ کر کے ڈرون بنا لیا تھا۔ یران نے طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائل اور راکٹ بھی تیار کر لئے ہیں اور ان ہتھیاروں کو مختلف مقامات پر متعین کر دیا ہے جنہیں سائبر کمانڈ کی یونٹیں مختلف مقامات سے کنٹرول کرتی ہیں۔ اب ایٹمی معاہدے سے نکلنے کے بعد ایران کو ایٹمی مدافعت (Nuclear Deterrence) کے فوائد حاصل ہوں گے۔

سائبر اور اے ون ٹیکنالوجی کی صلاحیت حاصل کر لینے سے ایران محدود جنگ لڑنے کے قابل ہے جیسا کہ ایران کے سپریم لیڈر آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ "ایک سخت ردعمل امریکہ کا منتظر ہے۔" جبکہ امریکہ کے سابق وائس پریذیڈنٹ نے ٹرمپ کی اس حرکت کو ناعاقبت اندیشانہ آپریشن قرار دیا ہے جو "بارود کے گودام میں چنگاری پھینکنے کے مترادف ہے کیونکہ زمانہ امن میں ایک سینئر سرکاری افسر کو کھلے عام قتل کرنا کھلی دہشت گردی ہے۔"

جنرل قاسم سلیمانی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے ایران کے پاس ایک بہتر متبادل راستہ ہے کہ روایتی جنگ کی بجائے سائبر وار کی صلاحیتوں کو عمل میں لائے اور عراق' شام' یمن اور لبنان میں زمینی فوج سے منسلک رکھے۔ افغانستان میں بھی ایران کو خاصا اثر ورسوخ اور عزت کا مقام حاصل ہے۔ ان مقامات سے پورے مغربی وسطی ایشیا میں موجود امریکی تنصیبات اور فوجیوں کے خلاف کامیاب کاروائیاں کی جا سکیں گی۔ ایران نے پہلے ہی پینتیس ایسے مقامات کا تعین کر رکھا ہے۔ ایران کے لئے یہ ایک مکمل جنگ ہوگی جو زمینی فوج کی مدد سے سائبر ٹیکنالوجی کی بنیاد پر لڑی جائے گی۔ یہ حکمت عملی ایران کو محدود پیمانے پر جنگ کی صلاحیت مہیا کرے گی۔

قم میں مسجد جمکران پر سرخ پرچم لہرانے کے فیصلے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایرانی سپریم لیڈر آیت اللہ سید علی خامنہ ای نے امریکہ کو اس کی فاش غلطی کی سزا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے جو پورے مشرق وسطی کے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گا اور ہمسایہ ممالک پر اس کے بہت مہلک اثرات مرتب ہوں گے۔ جنگ کا ہدف صرف امریکی فوج اور مفادات ہی نہیں ہوں گے بلکہ اصل ہدف اسرائیل ہوگا جو خطے میں تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

ایران گذشتہ چار دہائیوں سے امریکہ اور اسرائیل کے ہاتھوں گوناں گوں مسائل سے دوچار ہے اور اب اس خطرے سے نجات حاصل کرنے کا مناسب وقت ہے۔ ٹیکنالوجی کے میدان میں امریکہ اور اسرائیل کو جو برتری حاصل ہے اس کا توڑ یہی ہے کہ میزائیلوں' ڈرونز'

راکٹوں کے ساتھ ساتھ ایران' شام' یمن' لبنان اور غزہ کے ہزاروں خودکش بمباروں کے ذریعے خصوصا اسرائیل کو نیچا دکھایا جا سکتا ہے۔ جیسے جیسے جنگ طویل ہوگی' ہمسایہ ممالک سے جہادیوں کی آمد شروع ہو جائے گی جو جنگ میں نئی روح پھونک دیں گے۔ اس طرح یہ ایک شدید خونی جنگ ہوگی جو اسرائیل کے لئے مہلک اور خطے میں تیل پیدا کرنے والے ممالک اور تیل پر انحصار کرنے والے ممالک سب کے لئے یکساں ضرر رساں ہوگی۔ چین کو شدید مسائل کا سامنا ہوگا جسے آبنائے ہرمز کے ذریعے تیل کی سپلائی ہوتی ہے۔ ایران اسے بند نہیں کرے گا بلکہ خود امریکہ اسے بند کردے گا کیونکہ ایسا کرنے سے شمال مغربی یورپ سے خودان کی سپلائی لائن محفوظ رہے گی۔

روس اور چین اس جنگ میں شامل نہیں ہوں گے اور فریقین کو صبر و برداشت کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ امریکہ کو افغانستان کے بعد ایک اور شرمناک شکست سے دوچار ہوتا دیکھنا چاہیں گے۔ ترکی' ملائشیا اور انڈونیشیا ایران کی مدد کریں گے جبکہ پاکستان 1980's کی ایران عراق جنگ کے دوران اپنائی جانے والی پالیسی پر کاربند رہتے ہوئے فریقین کو امن و احتیاط کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیتا رہے گا لیکن پاکستان کو شدید فرقہ وارانہ شورش کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ درحقیقت اس صورت حال سے خلیج کا پورا خطہ جغرافیائی و سیاسی اعتبار سے شدید عدم استحکام کا شکار ہو جائے گا۔

عالمی جنگ کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ اہل دنیا گذشتہ چار دہائیوں سے مسلم ممالک پر ڈھائے جانے والے مظالم اور تباہی و بربادی کے مناظر دیکھتے رہے ہیں۔ افغانستان' شام' عراق' صومالیہ' لیبیا اور یمن پہلے ہی تباہ ہو چکے ہیں۔ اب ایران ہدف ہے اور اس جنگ کے دوران بھی تماشا دیکھتے رہیں گے۔ اقوام متحدہ جیسی عالمی تنظیمیں اور ان کے ذیلی مالی ادارے اپنے آپ کو غیر جانبدار ہی رکھیں گے جبکہ فلسطین اور کشمیر کے مجاہدین آزادی کو اپنے مقاصد میں کامیابی ہو سکتی ہے کیونکہ اسرائیل کو اس جنگ کی ہولناکی کا شدت سے سامنا ہوگا اور بھارت کے اندر علیحدگی پسند تنظیمیں اور شدید سیاسی ابتری جو خود مودی کی ہندوتوا پالیسی کے

سبب پیدا ہوئی ہے وہ بھارت کے لئے عتاب ثابت ہوگی۔ بھارت جو امریکہ کا اسٹریٹجک ڈیفنس پارٹنر ہے' معاہدے کی رو سے ایران کے خلاف جنگ کے دوران امریکہ کی مدد کرنے کا پابند ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ بھارت اپنے آپ کو اس جنگ سے بچانے کے لئے کیا راستہ اختیار کرتا ہے۔ یہ انتہائی دلچسپ بات ہوگی۔

ایرانیوں کو اپنے ایٹمی اثاثوں اور سہولیات کو درپیش خطرات کا شدت سے احساس ہے جنہیں پہاڑوں میں خندقیں کھود کر محفوظ کر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود امریکہ کو یہ صلاحیت حاصل ہے کہ ایف ۳۵ جنگی جہاز اور بی ۵۲ بمبار جہازوں کے ذریعے نئے ہتھیار استعمال کر کے ان اثاثوں کو نقصان پہنچا سکے جیسا کہ ٹرمپ نے دھمکی دی ہے۔ ایران کے پاس ایف ۳۵ کے خلاف دفاعی صلاحیت محدود ہے جو ان کے لئے خاصے نقصان کا سبب بن سکتا ہے۔

امریکہ اور اسرائیل کا ممکنہ رد عمل

سوال:۔۔۔۔ ابھی ہم جنگ کی بات کر رہے تھے کہ ایران نے عراق میں واقع دو امریکی ڈرون اڈوں پر حملہ کر دیا ہے۔ آپ کا تجزیہ صحیح تھا کہ ایران امریکی اڈوں پر حملہ کر کے بدلہ لے سکتا ہے اور ایسا ہی ہوا۔ اب اس کے بعد امریکہ کا رد عمل کیا ہوگا؟

جواب:۔۔۔۔ امریکہ اپنی خفت مٹانے کے لئے بار بار یہ کہہ رہا ہے کہ اس حملے میں ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔ All is well اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دے رہا ہے کہ ہم بھرپور جواب دیں گے لیکن ابھی امریکہ کے اتحادیوں خصوصا یورپین یونین اور اسرائیل کی جانب سے تحمل و برداشت کا تقاضہ کیا جا رہا ہے۔ اس لئے کہ یورپ کو خوف ہے کہ ان کی اقتصادیات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا اور اسرائیل کو خوف ہے کہ اس کے وجود کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اس لئے ٹرمپ نے اپنے غرور اور تکبر کے زہر کا گھونٹ پیتے ہوئے ایران پر مزید سخت اقتصادی پابندیاں لگانے کا فیصلہ کیا ہے اور ساتھ ہی بامقصد مذاکرات کا پیغام بھی دیا ہے۔ ان اقدامات کے نتیجے میں دنیا بے شک ایک بڑی تباہی سے بچ گئی ہے لیکن امریکہ کے عالمی سپر طاقت ہونے کی حیثیت کو بڑی ضرب لگی ہے جو غیر متوقع تھی۔

اس کے سبب اب مشرق وسطی میں اہم تذویراتی و سیاسی تبدیلیوں کے امکانات ہیں۔ وہ اس لئے کہ امریکہ اور اسرائیل کا گٹھ جوڑ جو پورے مشرق وسطی کے سیاسی و عسکری معاملات پر حاوی تھا اب کمزور پڑ جائے گا اور اسرائیل اپنے عرب پڑوسیوں سے معاملات طے کرنے پر مجبور ہوگا۔ رہبر انقلاب امام خمینی کا پیغام ہے کہ "مزاحمت و استقامت کی راہ مزید مستحکم عزم و حوصلے کے ساتھ باقی رہے گی اور یقینی طور پر یہ کامیابی اس مبارک راہ پر گامزن رہنے والوں کے قدم چومے گی۔"

جنرل اسلم بیگ پر دہشت گردوں کی معاونت کا الزام:

سوال:۔۔۔۔ جنرل قاسم سلیمانی کے قتل کے بعد عالمی میڈیا نے اپنے تبصروں کے ساتھ ساتھ ایک تصویر بھی انٹرنیٹ پر دکھائی جو غالبا 1989ء کی ہے جس میں قاسم سلیمانی کو آپ کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ قاسم سلیمانی کو چراٹ میں کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی۔ اس تصویر کا کیا مقصد ہے؟

ایران کے جنرل قاسم پاکستان کے دورے کے دوران جنرل اسلم بیگ کے ساتھ

جواب:...... یہ تصویر یقیناً سی آئی اے نے جاری کی ہے اور ایسے ظاہر کیا گیا جیسا کہ جنرل قاسم سلیمانی کو چراٹ میں کمانڈو ٹریننگ دی گئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ 1989ء میں ایرانی پاسداران انقلاب کا ایک وفد جنرل محسن رجائی کی زیر قیادت پاکستان آیا تھا جس میں قاسم سلیمانی بھی شامل تھے۔ اس وقت وہ Iranian Revolutionary Guard Corps - IRGC کے ڈویژنل کمانڈر تھے۔ انہوں نے ایران عراق جنگ میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے تھے۔ یہ ساری کہانی بنانے اور مجھے قاسم سلیمانی کے ساتھ دکھا کے یہ تاثر دیا گیا ہے کہ لوگ مجھے بھی عالمی دہشت گرد سمجھنے لگیں جیسا کہ امریکی میڈیا اور خود ٹرمپ نے واضح کر دیا ہے کہ "ہم نے اسامہ بن لادن کو مارا' ابوبکر البغدادی کو مارا اور اب قاسم سلیمانی کو مارا ہے اور اس کے بعد دوسرے دہشت گردوں کو بھی جلد ٹھکانے لگائیں گے۔"

سوال:...... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے آپ نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس سے امریکی مارے گئے ہوں یا امریکیوں کے مفادات پر ضرب لگی ہو تو پھر ٹرمپ آپ کو عالمی دہشت گردوں کی فہرست میں کیوں شامل کرنا چاہتا ہے؟

جواب:...... بے شک میں نے جنرل قاسم سلیمانی اور ابوبکر البغدادی کی طرح ایسی کوئی کاروائی نہیں کی جس میں امریکی مارے گئے ہوں لیکن میری سوچ اور مشورے بے شک امریکہ اور اسرائیل کے لئے شکست اور شرمندگی کا باعث بنے ہیں۔ پہلی مثال یہ ہے حزب اللہ اسرائیل جنگ کے دوران میں نے ایرانی وفد کو مشورہ دیا تھا کہ حزب اللہ' اسرائیل پر میزائیلوں اور راکٹوں کی بارش کر کے اس کی عسکری قوت کو بے بس بنا دے اور ایسا ہی ہوا اور اسرائیل کو شرمناک شکست اٹھانا پڑی۔

دوسرا مشورہ میں نے حال ہی میں اپنے مضمون میں دیا ہے کہ "اگر جنگ ہوتی ہے تو ایران' شام' عراق' یمن اور غزہ کی جانب سے راکٹوں' میزائیلوں اور ڈرونز کی بارش ہوگی اور ہزاروں خودکش حملہ آوروں کے حملے اسرائیل کو بے بس کر دیں گے۔" یہ ایسی کارگر تدبیر ہے جس کا اسرائیل تو کیا امریکہ کے پاس بھی کوئی توڑ نہیں ہے۔ امریکہ اور اسرائیل کو اس

خطرے کی سمجھ آ گئی اور اگر بات آگے بڑھی تو اسرائیل کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ اسی لئے سب سے زیادہ شور اسرائیل نے مچایا اور امریکہ پر زور ڈالا کہ خدا کے لئے اس تنازعہ کو آگے مت بڑھائیں اور ندامت کا کڑوا گھونٹ پیتے ہوئے ٹرمپ نے ایران کے خلاف تادیبی کاروائی کو مزید سخت اقتصادی پابندیوں تک محدود رکھا ہے۔

ایران اور چین کے درمیان تزویراتی شراکت:

سوال:...... حال ہی میں ایران اور چین کے درمیان "تزویراتی شراکت" کے معاہدے کے مسودے کی تیاری پر کام ہو رہا ہے جس میں چین کی جانب سے ایران میں کئی منصوبوں میں سرمایہ کاری کی جائے گی۔ آپ کا اس بارے کیا تبصرہ ہے؟

جواب:...... درحقیقت یہ معاہدہ ایک زوردار دھماکہ ہے کہ جس کے سبب کرشماتی حقائق وجود میں آئے ہیں۔ جس طرح آج سے تقریباً پینتالیس (45) سال قبل وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے درہ خنجراب کے راستے شاہراہ قراقرم کھول کر چین کے ساتھ تزویراتی روابط قائم کئے تھے جس کی بدولت دونوں ملکوں کی افواج کے درمیان تزویراتی محور کی بنیاد پڑی تھی جو اب پاکستان چین اقتصادی راہداری (CPEC) کی صورت اختیار کر چکی ہے جسے Belt and Road Initiative (BRI) کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ایران نے گذشتہ چالیس سالوں تک امریکہ کی جابرانہ اقتصادی پابندیوں اور بندشوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا ہے' اس نے ان زنجیروں کو توڑنے کا فیصلہ کرتے ہوئے چین کے BRI منصوبے کو خوش آمدید کہا ہے جس نے خطے کے تزویراتی نقشے کو بدل کے رکھ دیا ہے۔ اس معاہدے کے مسودے میں اہداف ان الفاظ میں بیان کئے گئے ہیں:

> "ایشیا کی دو عظیم اور قدیم ترین تہذیبیں جو تجارتی' اقتصادی' سیاسی' ثقافتی اور سلامتی کے رشتوں میں بندھی ہیں اب متعدد باہمی اور کثیرالجہتی مفادات کے حوالوں سے ایک دوسرے کے تزویراتی شراکت دار بن جائیں گے۔"

معاہدے میں ایک سو کے لگ بھگ ایسے منصوبے شامل ہیں جن میں چین سرمایہ کاری

کرے گا جبکہ ایران آئندہ پچیس (25) سالوں تک چین کو رعایتی قیمتوں پر تیل فراہم کرے گا۔ چین کی طرف سے چار سو بلین امریکی ڈالر کی سرمایہ کاری سے اب ایران کے لئے چین کی کرنسی Renminbi میں تجارت کے متعدد مواقع حاصل ہوں گے۔

تذویراتی دفاعی شراکت داری' ایرانی افواج کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کو ترقی دینے کا سبب بنے گی جیسا کہ 1980-90 کے عرصے میں پاکستان نے حاصل کی تھی۔ اس وقت ایران کے لئے سب سے اہم ہدف اسرائیل کے F35 فضائی طیاروں کے خطرے کو شکست دینا ہے۔ اطلاعات کے مطابق حال ہی میں ان طیاروں نے کئی تنصیبات اور Natanz میں واقع ایرانی ایٹمی تنصیبات کو نقصان پہنچایا ہے۔ Post Diehl خبرنامہ کے مطابق گذشتہ چند ہفتوں میں اسرائیل ایسی کاروائیوں کا مرتکب ہو رہا ہے جن کا مقصد پراسرار انداز سے ایران کے ایٹمی و میزائل پروگراموں اور دیگر صنعتی اور بنیادی ڈھانچے کے خلاف خفیہ عسکری جارحیت جاری رکھنا ہے۔ سینٹری فیوج کی پیداواری سہولتوں' میزائل تیار کرنے والی فوجی سہولتوں' پاور پلانٹس' ایلومینیم اور کیمیکل تیار کرنے والی فیکٹریوں اور میڈیکل اسٹور پر پراسرار دھماکے ہوئے۔ گذشتہ ہفتے خلیج فارس میں واقع بشہر (Bushehr) کی بندرگاہ میں بھڑک اٹھنے والی آگ سے سات بحری جہاز تباہ ہوئے۔ اسرائیلوں نے اپنے آپ کو ان کاروائیوں سے بری الذمہ رکھنے کے لئے کوئی اقدامات نہیں اٹھائے۔'' معاہدہ یہ بھی کہتا ہے کہ ''مشترکہ فوجی تربیتی مشقوں' تحقیقی کاوشوں' اسلحہ کی ترقی اور انٹیلی جنس معلومات کے تبادلے کے ذریعے فوجی تعاون کو فروغ دیا جائے گا۔ یعنی تعاون کی حدیں آسمان تک ہیں۔

سوال:...... تذویراتی و دفاعی شراکت کے علاوہ بھی متعدد معاہدوں پر دستخط ہوئے ہیں۔ کچھ تفصیل بتانا چاہیں گے؟

جواب:...... ایران میں بنیادی ڈھانچے (Infrastructure) کی بہتری کے لئے چین ایک سو بیس بلین امریکی ڈالر کی سرمایہ کاری کرے گا جس کی شروعات ایران کے شہر تہران سے چین کے صوبہ سنکیانگ کے شہر ارمچی (Urumqi) کو ملانے والی 2,300 کلومیٹر

طویل شاہراہ کو ترقی دینے سے ہوگی جسے پہلے ہی پاکستان چین اقتصادی راہداری کے منصوبے کے تحت بننے والی ارمچی تا گوادر شاہراہ سے ملایا جا چکا ہے۔ جب اس شاہراہ کی تعمیر مکمل ہو جائے گی تو اس سے وسطی ایشیا کے ساتھ روابط ممکن ہوں گے اور اس سے آگے ترکی کے راستے یورپ تک پہنچ آسان ہوگی اور امکان ہے کہ بہت جلد یوریشیا بھی اسی سیاسی اور اقتصادی اتحاد کا حصہ بن جائے گا۔

سوال:...... مبصرین نے ان معاہدوں کو کرشماتی حقائق کا نام دیا ہے۔ ان معاہدوں کی تفصیل کیا ہے؟

جواب:...... منصوبے میں چاہ بہار سے زاہدان تک 628 کلومیٹر طویل شاہراہ بنانے کا بھی ذکر ہے جسے افغانستان کے شہر زرنج تک وسعت دی جا سکے گی۔ تہران سے مشہد کو ملانے والی 900 کلومیٹر ریلوے لائن کو ترقی دینا اور الیکٹرانک سسٹم سے لیس کرنا بھی ترجیحات میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ تہران سے قم اور اصفہان تک تیز رفتار ریلوے کو مکمل کرنے کا ایک اور منصوبہ بھی ہے جسے شمال مغربی شہر تبریز تک توسیع دی جائے گی کیونکہ یہ علاقہ تیل' گیس اور اس سے متعلق دیگر معدنیات کا مرکز ہے۔ تبریز سے انقرہ تک گیس پائپ لائن بچھانے کا منصوبہ پہلے سے موجود ہے۔

تیل کی مصنوعات کی صنعت: 280 بلین امریکی ڈالر کا بڑا حصہ ایران میں تیل اور گیس کی صنعت کو ترقی دینے پر صرف کیا جائے گا جسے امریکی پابندیوں کی وجہ سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

مواصلاتی رابطے اور سائبر سپیس (Cyber Space): معاہدے کے مسودے میں اس امر کا بھی ذکر ہے کہ ایران کے مواصلاتی نظام کو ترقی دینے کے لئے چین فائیو جی (5G) کا ڈھانچہ بھی تعمیر کرے گا۔ اس طرح چین کی معروف کمپنی Huawei ایرانی مارکیٹ میں داخل ہو جائے گی۔ اس کمپنی پر امریکہ کی جانب سے عائد پابندیوں کی وجہ سے برطانیہ اور آسٹریلیا سمیت دنیا کے کئی ممالک نے اس کمپنی کے ساتھ کاروبار کرنے پر پابندی لگا دی ہے۔ چین

اپنے BeiDou نظام کی بدولت ایران کے سائبر نظام سے متعلق افراد کو تربیت فراہم کرے گا جس سے ایران کے لئے چین کی طرح اپنے اردگرد "عظیم آتشی دیوار" قائم کرنا آسان ہو جائے گا۔

تذویراتی اہمیت کے حامل منصوبے: مثلاً جبوتی بیس (Djibouti Base)، گوادر پورٹ، خلیج فارس میں واقع قشم کا جزیرہ، آبادان کے نزدیک ماکو کا آزاد تجارتی علاقہ؛ گوادر اور چاہ بہار کی بندرگاہیں؛ چاہ بہار سے 350 کلومیٹر کے فاصلے پر بندر جسک اور وہاں کے آزاد تجارتی علاقے کی سہولتیں چین کو حاصل ہوں گی جو مغربی دنیا اور امریکی اقتصادی مفادات کے لئے براہ راست چیلنج ہوں گے۔

سوال:...... چین نے اپنی اقتصادی حکمت عملی کو عروج پر پہنچایا ہے جبکہ امریکہ اپنی عسکری قوت کے بل بوتے پر عمل پیرا ہے اور ناکام ہے۔ کیوں؟

جواب: اس بدلتے ہوئے تذویراتی ماحول کے پس پردہ کرشماتی حقیقت (Magical Realism) کا نام دیا گیا ہے اور نئے عالمی نظام کے خدوخال بھی نمایاں ہیں جیسا کہ یہ دانشمندانہ تحقیق بتاتی ہے:

"ایران کی گردن پر سے امریکہ کا گھٹنا ہٹ چکا ہے۔"

"عالمی سوچ اور طاقت کے توازن میں ڈرامائی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔"

"بلند ترین تعلیمی شرح رکھنے کے باوجود امریکہ تعلیم اور عام فہم کے اوصاف سے عاری نظر آتا ہے۔"

"چین، پاکستان، افغانستان، ایران اور وسطی ایشیاء پر مشتمل ایک نیا تذویراتی اقتصادی نظام قائم ہونے جا رہا ہے جو روس کے لئے بڑا اہم ہے کہ وہ بھی اس میں شامل ہو جائے تاکہ اس کے لئے بحر عرب کے گرم پانیوں تک پہنچنا آسان ہو جائے۔"

"یہ تمام صورت حال پاکستان کے لئے حوصلہ افزا ہے۔"

دوسری اہم بات یہ ہے کہ چین دنیا کا واحد ملک ہے جس نے حالیہ دہائیوں میں تصادم

اور جبر و استبداد کی راہ اپنائے بغیر دنیا کی دوسری بڑی اقتصادی قوت ہونے کا مقام حاصل کیا ہے جبکہ امریکہ نے عراق، لیبیا، شام، یمن، صومالیہ، افغانستان اور دیگر متعدد مسلم ممالک کے خلاف غیر منصفانہ جنگیں لڑیں جس پر چھ ٹریلین امریکی ڈالر خرچ ہوئے اور آٹھ لاکھ سے زیادہ لوگ قتل ہوئے اور کروڑوں لوگ بے گھر ہوئے ہیں۔ اب ظلم و استبداد کے بادل چھٹنے شروع ہوئے ہیں، ایک نئی صبح طلوع ہو رہی ہے۔" الحمد اللہ

سوال:...... ان حالات میں پاکستان کے لئے سنہری مواقع بھی ہیں اور خطرات بھی، بہتر حکمت عملی کیا ہوگی؟

جواب:...... پاکستان کو چاہیے کہ بدلتے ہوئے حالات کو موقع غنیمت سمجھے اور ایران اور افغانستان کے ساتھ ہر سطح پر اپنے روابط کو مستحکم کرے۔ ایران تا پاکستان گیس پائپ لائن کے منصوبے کو مکمل کرنے کے ساتھ ساتھ سڑک اور ریلوے لائن کے رابطے قائم کرے۔ کوئٹہ سے زاہدان ریلوے کے نظام کو بہتر بنائے۔ کوئٹہ اور پشاور سے اندرون افغانستان سڑک اور ریلوے لائن کو توسیع دے۔ امریکہ اور اس کے ایشیا پیسفک کے اتحادی، پاکستان کے تذویراتی مفادات کی راہ میں رکاوٹیں ڈالنے کی کوشش کریں گے جس کے سدباب کے لئے حکمت عملی مرتب کرنا ضروری ہے۔

سوال:...... مودی ہندوتوا نظریہ کی تکمیل کے لئے پاکستان کے خلاف سازشوں کا مرتکب ہو رہا ہے۔ کشمیر میں ظلم و ستم کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ اس ظلم کو روکنے کے لئے ہماری کیا حکمت عملی ہو سکتی ہے؟

جواب:...... مودی نے فروری ۲۰۱۹ء کی ناکام سرجیکل اسٹرائیک کے بعد کہا تھا کہ "کاش میرے پاس رافیل طیارے ہوتے تو میں بدلہ لیتا۔" اب مودی کے پاس یہ ہتھیار تو موجود ہے لیکن بدقسمتی سے انہیں بڑی مشکل کا سامنا ہے کیونکہ بھارت اس وقت اپنی مسلح افواج کی اندرونی کمزوریوں کے مسائل سے دوچار ہے اور ان میں اتنی سکت نہیں کہ مودی کے عزائم کو کندھا دے سکیں، مثلاً:

(۱)..... بھارت اپنی مسلح افواج کی تنظیم نو میں مصروف ہے جس کی وجہ سے وہ عملی طور پر کسی بڑی عسکری کاروائی کے قابل نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان اپنی مسلح افواج کی تنظیم نو 1980-90 کے عرصے میں مکمل کر چکا ہے اور اس کے تمام جنگی منصوبے فوجی مشقوں میں باقاعدہ طور پر جانچے اور پرکھے جا چکے ہیں۔

(۲)..... پاکستان نے اپنا اہم جنگی ٹینک' بحری جہاز' سب میرین اور کثیر الجہتی کردار کے حامل فضائی طیارے خود تیار کرنے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے جبکہ بھارت کو یہ صلاحیت حاصل نہیں ہے۔ رافیل طیارے جو انہوں نے حالیہ عرصے میں اپنی فضائیہ میں شامل کئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں چین کے J-20 طیارے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔

(۳)..... بھارتی پائلٹوں کو رافیل طیاروں کی جنگی مہارت حاصل کرنے کے لئے وقت درکار ہوگا۔

(۴)..... بھارت کی تقریباً تمیں فیصد پیادہ فوج درجن بھر اندرونی تحریکوں سے نمٹنے میں الجھی ہوئی ہیں جن میں کشمیر کی تحریک آزادی بھی شامل ہے جو اب منطقی انجام کے قریب ہے۔ لہٰذا پیادہ فوج کی کمی کے باعث زمینی دفاع کمزور ہوگا اور اس کی اپنی حملہ آور فوج کو تحفظ مہیا کرنے کی صلاحیت بھی محدود ہوگی۔

(۵)..... کشمیری نوجوان اپنے عظیم قائد سید علی گیلانی کی قیادت میں بے مثال قربانیاں دے رہے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ ظلم کی زنجیریں ان کے خون کے شعلوں سے پگھلیں گی' قراردادوں اور احتجاج سے نہیں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔

(۶)..... بھارتی فوج کو نسلی اختلاف (Caste system) کی وجہ سے افسروں کی کمی کا سامنا ہے جو ایک بڑی کمزوری ہے۔

(۷)..... فروری 2019 میں بالاکوٹ سرجیکل اسٹرائیک میں ناکامی اور لداخ کے محاذ پر چینی سپاہیوں کے ہاتھوں اٹھائی جانے والی ہزیمت کے سبب بھارت کی مسلح افواج کی عزت اور وقار کو زبردست نقصان پہنچا ہے۔

(۸)..... اپنے تمام پڑوسی ممالک کے ساتھ کشیدہ تعلقات کی وجہ سے بھارت سیاسی طور پر تنہا ہو چکا ہے جو اس کی قومی سلامتی کے لئے شدید خطرہ ہے۔

سوال:..... ضرب کاری (Fundamental Blow) کی پالیسی کو عمل میں لانے کا پاکستان کے لئے اس سے بہتر وقت اور کیا ہو سکتا ہے' جس پالیسی کا مطلب ہے کہ دشمن کی سرحدی دفاعی لائن کو توڑ کر کھلا راستہ مہیا کیا جائے تا کہ ہماری حملہ آور فوج اپنے اہداف کی جانب پیش قدمی کر سکے۔ اس پیش قدمی میں ہمارے الخالد ٹینک کا اہم کردار ہے جو اپنی رفتار فائر پاور' حفاظت اور میدان جنگ میں اپنا لوہا منوانے کے اعتبار سے کوئی ثانی نہیں رکھتا؟

جواب:..... ہمارا الخالد ٹینک' جسے ''زمینی جنگ کا بادشاہ'' کہا جاتا ہے' پہلے اس کی تیاری اور صلاحیت کے بارے میں جاننا ضروری ہے۔ جہاں تک ضرب کاری حکمت عملی کا تعلق ہے' اس کا تذکرہ بعد میں کروں گا۔

ہمارے اہم جنگی ٹینک الخالد۔1 نے 17 اگست 1988 کو امریکہ کے مایہ ناز ٹینک Abraham M1A1 کو عملی میدان میں شکست دے کر اپنے سفر کا آغاز کیا۔ ہمارے اس ٹینک میں جرمنی کے Leopard II کا پاور پیک (انجن) فٹ کیا گیا تھا لیکن امریکی دباؤ میں آ کر جرمنی نے انجن کی سپلائی بند کر دی۔ مجبوراً ہمیں یوکرائن سے ان کے ٹینک کے انجن کے لئے بات چیت کرنا پڑی اور 1996 تک یوکرائن کے 300 ٹینکوں کے علاوہ 400 الخالد ٹینک تیار ہو کر میدان میں آ چکے تھے۔ اسی دوران ہمارے T-59, T-62, T-85 ٹینک بھی اپ گریڈ ہو چکے تھے' متعدد خوبیوں کا حامل الضرار ٹینک بھی انہیں میں سے ایک ہے۔

ہمارے ہنرمند کاری گروں نے ٹینکوں کو اپ گریڈ کرنے میں اتنی مہارت حاصل کر لی ہے کہ آج الخالد۔1 کی صورت میں یہ ہمارے سامنے ہے۔ وہ مایہ ناز ہتھیار ہے جسے جنگ کا بادشاہ کہا جاتا ہے کیونکہ اس ٹینک میں اتنی خوبیاں ہیں کہ ہماری جارحانہ دفاع کی حکمت عملی کی تائید میں زمینی اور فضائی جنگ کا حسین امتزاج پیش کرتے ہوئے دور تک اہداف کو کامیابی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس حکمت عملی کو بروئے کار لایا جائے تو الخالد ٹینک کی

دھاڑ اور جے ایف 17 کی گھن گرج' بھارت میں انبالہ تک سنائی دے گی اور جنوب میں گہرے سمندروں میں ہمارے سپر سونک کروز میزائلوں (Super Sonice Cruise Missiles) سے بچنے کے لئے بھارتی نیوی کے طیارہ بردار جہاز آئی این ایس وکرامادتیا (INS Vikramaditya) کو اپنی حفاظت کے لئے پناہ گاہ کی ضرورت ہوگی۔

سوال:— آپ نے اپنے مضامین میں ضرب کاری (Fundamental Blow) کا تذکرہ کیا ہے' اس نظریے کی وضاحت کرنا پسند کریں گے؟

جواب:— میں کسی مبالغہ آرائی سے کام نہیں لے رہا بلکہ یہ حقیقت ہے کہ ہماری سخت جان اور آزمودہ مسلح افواج' جن کا شمار دنیا کی بہترین مسلح افواج میں ہوتا ہے' دشمن کو سبق سکھانے کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں۔ الحمدللہ ہماری افواج میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ایک مضبوط حکمت عملی کے تحت اپنے دفاعی مقاصد حاصل کر سکتی ہیں۔ یہ حکمت عملی کیا ہے اور کن حالات میں اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے' چند مثالیں پیش کرنا چاہوں گا جس سے حقیقت واضح ہو جائے گی:

پہلی مثال: ۱۹۷۱ء میں جب میں وار کورس کر رہا تھا تو ہمارے چیف انسٹرکٹر بریگیڈئر محمد احمد نے مثال بیان کی کہ نپولین کے خلاف جنگ میں برطانوی بریگیڈ محاصرے میں آ گیا۔ بریگیڈ کمانڈر نے اپنے افسروں کو بلایا اور کہا:

> "سنو! اچھی خبر یہ ہے کہ ہمارا دشمن سامنے ہے' دائیں اور بائیں بھی ہے' پیچھے بھی ہے' بھاگ کر جائے گا کدھر۔ ہم حملہ کریں گے' ہمارا ہدف وہ پہاڑی ہے جو یہاں سے دو میل دور ہے۔ بھرپور تیاری کرو' حملہ کرو' اس کی دفاعی لائن توڑ کر رکھ دو اور سورج طلوع ہونے سے پہلے اس پہاڑی پر اپنا علم بلند کر دو۔" کمانڈر کے حکم پر عمل ہوا اور دشمن پسپا ہو گیا۔

دوسری مثال: سوویت یونین کے ٹوٹ جانے کے بعد کریمیا (Cremia) کا علاقہ یوکرین (Ukraine) کے ساتھ شامل کر لیا گیا تھا۔ روس کے صدر پیوٹن نے فوجی کارروائی کر

کے اس علاقے کو اپنی مملکت کا حصہ بنا لیا۔ امریکہ اور دوسرے ممالک شور مچاتے رہے لیکن کچھ نہ کر سکے۔ ایک ہی ضرب کاری سے معاملہ حل ہو گیا۔

تیسری مثال: ابھی اسی سال کا واقعہ ہے کہ ترکی نے شام کے ساتھ سرحدوں پر کہ جہاں سے شامی باشندے ہجرت کر گئے تھے' وہاں کردوں کو لا کر آباد کر دیا تھا کہ جس سے ترکی کا ایک نیا فرنٹ کھل گیا تھا: ترکوں نے اقوام متحدہ سے یا کسی اور سے مداخلت کی درخواست نہیں کی بلکہ اعلان کر دیا کہ ترکی طاقت کے زور سے کردوں کو نکالے گا اور وہاں ان شامی باشندوں کو آباد کرے گا جن کی اکثریت اب ترکی میں پناہ گزین تھی۔ امریکہ کے فوجی بھی وہاں موجود تھے مگر وہ نکل گئے اور ترکی نے ایک ہفتے کے اندر اپنی سرحدوں کو محفوظ بنا لیا۔

ایران اسرائیل مخاصمت کی بدلتی صورت حال:

سوال:— اسلامی دنیا اس وقت بدترین تفرق اور بے راہ روی کا شکار ہے اور امریکی ظلم و بربریت کا سب سے بڑا شکار ایران ہے لیکن اس کے باوجود ایران نے بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ اپنی عسکری قوت کو ایک نئی جہت دی ہے کہ جس کے سبب ایران' اسرائیل کو ایک شرمناک شکست سے دوچار کر سکتا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟

جواب:— جی ہاں یہ حقیقت ہے کہ عالم اسلام منقسم ہے حتیٰ کہ او آئی سی (OIC) نے بھی ایران کو کانفرنس میں شرکت کی اجازت نہیں دی کیونکہ ایسا کرنا اس کے آقا سعودی عرب کے لئے ناقابل قبول ہے جنہوں نے عمران خان کو کوالالمپور کانفرنس میں شرکت سے بھی روک دیا تھا حالانکہ یہ کانفرنس عالم اسلام کو درپیش مسائل کے حل کے لئے ایک مثبت اور موثر کردار ادا کر سکتی تھی۔

اس کے باوجود یہ امر باعث اطمینان ہے کہ ایران گزشتہ چار دہائیوں سے جابرانہ پابندیوں کے باوجود نہ صرف اپنے قومی وقار اور غیرت کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوا ہے بلکہ دنیا کی اکلوتی سپر پاور کی جانب سے پیش کردہ چیلنجز کے خلاف طاقتور جذبہ حریت کی بھی مثال قائم کی ہے۔ صرف بائیس میزائلوں کے پہلے ہی حملے میں ایران نے پختہ ٹھکانوں میں

دیکھے ہوئے امریکی فوجیوں کے دماغی توازن کوخراب کر دیا ہے اور ابھی تک امریکی اس صدمے سے نہیں نکل سکے ہیں۔

اس پس منظر میں اندازہ لگائیں کہ جب اسرائیل پر متعدد اطراف سے ہزاروں کی تعداد میں راکٹوں اور میزائلوں کی بارش ہوگی تو اس پر کیا گزرے گی۔عنقریب دنیا یہ منظر بھی دیکھے گی۔ لہٰذا اسرائیل کو ایک نئی قسم کی جنگ کا سامنا ہوگا جس کے خلاف اس کے پاس کوئی دفاعی صلاحیت نہیں ہے۔یہ خطرہ 2006ء میں لڑی جانے والی حزب اللہ اسرائیل جنگ کی مثال ہوگا جس میں اسرائیل کو شکست اٹھانا پڑی تھی اور 2015ء میں افغانستان میں لڑی جانے والی قندوز کی جنگ کی حکمت بھی اس میں شامل ہوگی۔آسان الفاظ میں اس جنگ کا نقشہ کچھ اس طرح ہوگا:

> ''اسرائیل کے خلاف جنگ' پہلے مرحلے میں متعدد اطراف سے فری فلائٹ راکٹوں' میزائلوں اور ڈرونز کے حملوں سے شروع ہوگی جو اسرائیل کے ائرڈوم ڈیفنس کے نظام اور عوام کے حوصلے کو بھی تباہ کر دے گی۔اس کے بعد دھماکہ خیز بارود سے بھری گاڑیاں مختلف اطراف سے دفاعی حصاروں کو توڑ دیں گی اور ہزاروں کی تعداد میں خودکش بمباروں کے اسرائیل کے اندر گھسنے کی راہ ہموار ہو جائے گی جس سے دشمن کے دل و دماغ دہل جائیں گے اور وہ بھاگ جائیں گے جیسے قندوز میں چھ ہزار فوجی بھاگ گئے تھے۔''

یہ ایک حقیقت ہے کہ حزب اللہ کے ساتھ جنگ سے پہلے اسرائیل کو آگاہ کر دیا گیا تھا لیکن اسرائیل نے پرواہ نہ کی اور ایک شرمناک شکست اٹھانا پڑی۔اسی طرح آج ایران کی جانب سے جس طرح کے خطرے کا سامنا ہے وہ بڑا واضح ہے اور بہتر ہوگا کہ اسرائیل احتیاط کا دامن پکڑے۔امریکہ اور اس کے پٹھوؤں اسرائیل اور بھارت کے سامنے یہی راستہ ہے کہ وہ مودی اور ٹرمپ کے نام نہاد امن منصوبوں کو عملی جامہ نہ پہنائیں بلکہ کشمیریوں اور فلسطینیوں کے ساتھ گفت و شنید کی راہ اختیار کریں تاکہ مسائل کا ایسا باوقار اور قابل عمل حل

تلاش کیا جا سکے جو تمام فریقین کے لئے قابل قبول ہو۔

ایران کی جوابی کاروائی:

سوال:...... ایران اور اسرائیل تصادم کے تذویراتی محرکات کے بارے میں آپ کا کیا تبصرہ ہے؟

جواب:...... ایرانی جنرل قاسم سلیمانی کو امریکی سپاہیوں کے قتل کے الزام میں قتل کر دیا گیا تھا۔اس کے فوراً بعد امریکہ اور اسرائیل نے ایران کو سزا دینے کی غرض سے خطے میں فوجیں جمع کیں لیکن ایران نے براہ راست تصادم میں کودنے کی بجائے موثر مزاحمتی (Deterrence) حکمت عملی اپنانے کو ترجیح دی اور اعلان کیا کہ:

> ''اگر ایران پر حملہ کیا جاتا ہے تو جوابی کاروائی متعدد سمتوں سے فری فلائٹ راکٹوں' میزائلوں اور ڈرونز کے حملوں سے ہوگی جس سے اسرائیل کا آئرن ڈوم نامی ائرڈیفنس سسٹم ناکارہ ہو جائے گا اور عوام کے حوصلے پست ہو جائیں گے۔ اس کے بعد بارود سے بھری گاڑیاں اسرائیل کے حفاظتی حصاروں کو توڑ دیں گی جس سے خودکش بمباروں کو اسرائیلی سرحدوں کے اندر داخل ہونے کا راستہ مل جائے گا اور وہ تباہی پھیلے گی جس سے دشمن کے اوسان خطا ہو جائیں گے۔''

یہ صورت حال اسرائیل کے وجود کو مٹا کر رکھ دیتی' جس کا ادراک کرتے ہوئے انہوں نے خلیج فارس کا محاصرہ کرنے والے بحری بیڑے سمیت پسپائی اختیار کر لی۔

سوال:...... اطلاعات کے مطابق 'خفیہ حکمت عملی'' (Stealth Strategy) کے تحت ففتھ جنریشن (Fifth Generation) کے لڑاکا طیارے ایف ۳۵ (F-35) استعمال کرتے ہوئے ایران میں متعدد اہداف کو نشانہ بنانے کا فیصلہ کیا جس کے خلاف ایران کے پاس دفاع کی صلاحیت محدود ہے:

جواب:...... اسرائیل ایسی کاروائیوں کا مرتکب ہو رہا ہے جن کا مقصد پراسرار طریقے سے ایران کے ایٹمی و میزائل پروگراموں اور دیگر صنعتی اور بنیادی ڈھانچے کو نشانہ بنانا ہے۔

سینیری فیوج کی پیداواری سہولتوں' میزائل تیار کرنے والے فوجی ٹھکانوں' پاور پلانٹس اور کیمیکل فیکٹریوں پر پراسرار دھماکے ہوئے۔ گذشتہ ماہ خلیج فارس میں واقع بشہر کی بندرگاہ میں بھڑک اٹھنے والی آگ سے سات بحری جہاز تباہ ہو گئے تھے۔ اسی طرح ۲۰۰۶ء میں اسرائیل کی شکست کا انتقام اور لبنان میں حزب اللہ کو سزا دینے کے لئے بیروت کی بندرگاہ پر زوردار دھماکہ کیا گیا۔ ایران کو تنہا کرنے کے لئے شیعہ سنی تنازعات کو ہوا دینے کا عمل عروج پر ہے۔ ۱۹۷۹ء میں رونما ہونے والے انقلاب ایران کے بعد امریکہ ایران کو خطے میں سنی عرب ممالک کے لئے خطرے کے طور پر پیش کرتا رہا ہے اور انہیں اربوں ڈالر کا امریکی اسلحہ اور عسکری سازوسامان فروخت کیا ہے۔ اب جبکہ خطرہ سامنے ہے تو ان ممالک کے لئے اسرائیل سے دفاعی اسلحہ خریدنے کا راستہ کھل گیا ہے۔

جوابی کاروائی کرتے ہوئے ایران نے بغیر وقت ضائع کئے چین کے ساتھ تذویراتی دفاعی شراکت داری قائم کر لی ہے۔ اس تذویراتی شراکت نے ایک سیاسی طوفان برپا کر دیا ہے جو نئے عالمی نظام کے خدوخال واضح کرتا ہے۔ چین نے ایسا مالی نظام وضع کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے جو امریکہ اور اس کی ''دباؤ میں رکھنے'' والی پالیسی کی شکست ہے۔ پہلی بار ایسا ہوا ہے کہ چین کے ''اقتصادی نظام'' نے ''اقتصادی مزاحمت'' قائم کی ہے جو ایران سمیت اس حکمت عملی کی دفاعی چھتری کے نیچے آنے والوں کو تحفظ فراہم کرے گی۔

چین کے ''اقتصادی نظام'' نے جارحیت کی مرتکب قوتوں کے خلاف بامعنی اقتصادی مزاحمتی (Economic Deterrence) نظام قائم کر لیا ہے جو ایران کو اسرائیل کی نئی خفیہ حکمت عملی (Stealth Strategy) کے خلاف تحفظ فراہم کرتی ہے جبکہ امریکہ نے ''ظلم و وحشت'' (Shock & Awe) اور ''انتہائی دباؤ'' (Extreme Pressure) کے ہتھکنڈوں کے ذریعے گذشتہ چار دہائیوں سے متعدد مسلم ممالک کے خلاف جارحانہ کاروائیاں کرتے ہوئے انہیں تباہ کر کے رکھ دیا ہے اور آٹھ ملین سے زائد مسلمانوں کو قتل کر دیا ہے اور اب ایران اور دیگر کے خلاف' اسرائیل کے ساتھ تعاون کر رہا ہے جس سے مشرق وسطی کا پورا خطہ

تباہی سے دوچار ہو جائے گا۔ بلاشبہ واقعات کے اس اژدہام نے صورتحال کو الجھا کے رکھ دیا ہے۔ مشرق وسطی کو اس قسم کی سیاسی و تذویراتی شکل دینے سے عربوں کو نہ ختم ہونے والی باہمی دشمنی اور ہلاکت کی آگ میں جھونکا گیا ہے۔

سوال:...... اس وقت اسرائیل کو ایف ۳۵ طیاروں کی وجہ سے فضائی برتری اور انٹیلی جنس کی سہولیات حاصل ہیں جس کی وجہ سے ایران آسان ہدف ہے۔ ان خطرات سے نمٹنے کے لئے کیا اقدامات کئے جا سکتے ہیں؟

جواب:...... اس کا انحصار چین پر ہے کہ تصادم کے اس حساس نوعیت کے منظر نامے کا توڑ تلاش کرنے کی صلاحیت تلاش کرنے میں اسے کتنا وقت درکار ہے۔ چین کا لڑاکا طیارہ جے۲۰ (J-20) ' بھی ففتھ جنریشن کا ہے۔ شاید یہ طیارہ امریکی ایف ۳۵ طیاروں کے خلاف موثر کاروائی کرنے کی صلاحیت کا حامل ہو مگر یہ بات جانتے ہوئے کہ بیرونی خلا میں سیٹلائٹ کو مار گرانے کی صلاحیت رکھنے والے چین کے لئے ایف ۳۵ طیاروں کو مار گرانا کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ جب ایسا ہوگا تو اسرائیل کی ''خفیہ حکمت عملی'' اور تکنیکی صلاحیتوں کے میدان میں حاصل مزاحمتی برتری کا غرور خاک میں مل جائے گا۔

پاکستان کے لئے ممکنہ راستے:

سوال:...... آپ کی نظر میں پاکستان کے لئے مناسب اقدامات کیا ہو سکتے ہیں؟

جواب:...... ایران اور پاکستان کو چین کی فراخدلانہ امداد کے باوجود' امریکہ اور سعودی عرب کے ساتھ تعلقات کے سبب' پاکستان کو اس صورت حال میں غیر جانبدار رہنے کا مشورہ دے گا۔ لہٰذا اب ہمیں ایٹمی صلاحیت کی بجائے اپنی ''مزاحمتی صلاحیت'' کے بارے دوسرے وسائل پر سوچنا چاہیے۔ روایتی مزاحمت کی قیمت اور فری فلائٹ راکٹوں اور پیٹریاٹ میزائلوں کی قیمت کا فرق ہی ہماری مزاحمتی صلاحیت کا جوہری عنصر ہے۔ ہماری نیک خواہشات امن کے خواہاں عرب ممالک کے ساتھ ہیں لیکن فلسطینیوں کے خون کی قیمت پر نہیں۔ اس لئے کہ بہت جلد جب اسرائیلی وزیراعظم متحدہ عرب امارات کا دورہ کرے گا اور

اسرائیل کا قومی ترانہ بجایا جائے گا' جس کا پیغام ہے:

''اس وقت تک ہمارے دشمنوں کو وحشت زدہ ہونے دو' مصر اور کنعان میں بسنے والوں کو کانپنے دو' بابیلون کے شہریوں پر کپکپی طاری رہنے دو' ان کے آسمانوں پر ہماری طرف سے مصائب و دہشت جاری رہنے دو' جب ہم ان کے سینوں میں اپنا نیزہ داخل کریں گے اور ان کا بہتا ہوا خون اور ان کے سروں کو کٹا ہوا دیکھیں گے۔''

اس پیغام میں مسلمانوں کے قتل عام کا واضح پیغام ہے' یعنی خون بہے گا' مہذب دنیا خاموش رہے گی لیکن قانون فطرت ہے:

جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

مہذب دنیا فلسطین اور کشمیر کے مجاہدوں کے قتل پر خاموش ہے لیکن ظالم کے ہاتھوں پر لگے ہوئے خون کے دھبے یہ پیغام دے رہے ہیں کہ ''اللہ تعالیٰ کی یہ رضا ہے (سورۃ الحج کی آیت ۴۰) کہ یہ ظلم ناکام ہوکر رہے گا' جس طرح جرمن نازی یہودیوں کو ختم نہیں کر سکے' یہودی' فلسطینیوں کے جذبہ آزادی کو نہیں دبا سکتے' اور بھارت کشمیریوں کی حق خودارادیت کی جدوجہد کو نہیں دبا سکتا'' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا مقصود کچھ اور ہے:

''اگر اللہ تعالیٰ ایک کو دوسرے کے خلاف نہ ہٹاتا رہتا تو راہبوں کے صومعے اور عیسائیوں کے گرجے' یہودیوں کے عبادت خانے اور مسلمانوں کی مسجدیں' جس میں اللہ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے گرائی جا چکی ہوتیں۔ اور جو شخص اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ اس کی ضرور مدد کرتا ہے۔'' (الحج آیت ۴۰)

کشمیر اور فلسطین کے مسائل کے حل کا ''احمقانہ'' منصوبہ:

سوال:...... بڑے تعجب کی بات ہے کہ یکے بعد دیگرے کشمیر کی حیثیت کو مودی نے بدلنے کا فیصلہ کیا اور امریکی صدر نے فلسطین سے متعلق بڑے ہی مضحکہ خیز امن منصوبے کی تجویز پیش کی ہے۔ اس بڑی سازش کے بارے آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب:...... یقیناً یہ ایک بڑی سازش ہے جو' وارسا پلان' کا حصہ ہے جس کے تحت امریکہ اپنے دونوں تذویراتی دفاعی شراکت داروں کے مضموم عزائم کو تقویت دے کر ایران کو نیچا دکھانا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ امریکہ کے تذویراتی شراکت داروں نے اقوام متحدہ کی سات دہائیاں قبل پاس ہونے والی قراردادوں کو روندتے ہوئے مسئلہ کشمیر اور فلسطین پر یک طرفہ حل مسلط کر دیا ہے جس سے عالم اسلام میں شدید اضطراب پایا جاتا ہے۔ درحقیقت دو مختلف علاقوں میں تصادم کی مختلف نوعیت کی وجہ سے پورے علاقے کا مستقبل خطرے سے دوچار ہو چکا ہے۔

کشمیر کی تحریک آزادی کے اندرونی محرکات مضبوط ہیں جو اب ایک ابلتے ہوئے لاوے کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور طاقت کے بل بوتے پر انہیں نہیں دبایا جا سکتا۔ اب تک تو یہ تحریک پرامن ہے لیکن اگر کشمیریوں پر بھارتی ظلم وستم کا سلسلہ بدستور جاری رہا تو یہ تحریک پرتشدد ہو جائے گی۔ کشمیر کے اندر سے جہادی گروپ ابھریں گے جو دنیا بھر سے آنے والے جہادیوں کے ساتھ مل کر ویسی ہی صورت حال پیدا کر دیں گے جیسی افغانستان میں روسی اور امریکی قبضے کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ مودی کی جانب سے کشمیر کو ضم کرنے کے اقدامات واپس نہیں لئے جائیں گے جس سے تصادم مزید خون خرابے کا باعث بنے گا۔ خالصتان کی تحریک سے مقبوضہ کشمیر میں متعین آٹھ لاکھ سے زائد بھارتی فوجیوں کی مشکلات میں مزید اضافہ ہوگا اور یہ بات کہ ''پاکستان دوسروں کی جنگ میں شامل نہیں ہوگا'' کے فیصلے کا بھی امتحان ہوگا۔

امریکی تجاویز پر فلسطین کا ممکنہ ردعمل:

فلسطین کی تحریک کے اندرونی محرکات کمزور ہیں کیونکہ ان کی قیادت منقسم ہے لہٰذا فلسطینی مجبور ہیں کہ تقدیر کے لکھے پر صبر کر لیں اور سوچنے پر مجبور ہیں کہ:

ثابت قدم رہ کر مزاحمت جاری رکھنے سے ہی اسرائیل کے لئے مشکلات اور چیلنجز پیدا کئے جا سکتے ہیں کیونکہ اگر مزید کچھ ملنے کی توقع نہ ہو تو جو کچھ حاصل ہے اسی پر اکتفا کرنا

بہتر ہے۔

فلسطین کی منقسم قیادت اور آدھی عرب دنیا کا ٹرمپ کے امن منصوبے کو قبول کر لینا ایک المیہ ہے جس سے ٹرمپ کو اپنی من مرضی کا حل مسلط کرنے کی جرات ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ فلسطینیوں کی نہ کوئی آواز ہے نہ کوئی حق ہے۔ انہیں تو بے بس قیدیوں کے کیمپ میں ڈال دیا گیا ہے جہاں دنیا نہ ان کی آواز سنتی ہے اور نہ حقائق جاننے کی کوشش کرتی ہے۔

ٹرمپ کے نظریہ امن سے فلسطینیوں کو نہ صرف مذاکراتی عمل میں شمولیت کے حق سے محروم کر دیا گیا ہے بلکہ انہیں اپنی ہی سرزمین پر آزادی اور قومی وقار سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔ اس منصوبے کی رو سے مشرقی یروشلم پر اسرائیل کے قبضے کی بھی منظوری دے دی گئی ہے۔ منصوبے کی شرائط کو چار سال کے دوران قبول کیا جانا لازم ہے ورنہ اسرائیل مزید فلسطینی علاقوں پر قبضہ کر لے گا۔ یہ منصوبہ اسرائیل میں بیٹھ کر ٹرمپ کے داماد اور امریکی سفیر ڈیوڈ فرائڈ مین (David Friedman) نے تیار کیا ہے جس کا ہر پہلو مضحکہ خیز ہے مگر امریکی صدر نے اس منصوبے کو انتہائی عجلت میں من وعن قبول کر لیا ہے۔ "فلسطینی کس کے خلاف احتجاج کریں۔ وہ تو اسی کشمکش میں مبتلا ہیں کہ ان کے اندرونی مسائل کا حل محمود عباس کے پاس ہے یا اسرائیل کے پاس۔"

فلسطین کا مسئلہ غیر ارادی طور سے ایران سے متعلق ہو گیا ہے اور القدس کے کمانڈر جنرل قاسم سلیمانی کے قتل کے بعد فلسطین کے تصادم میں نئی جہت آئی ہے۔ امریکیوں کو ہرگز گمان نہیں تھا کہ ایران اس قدر جلد بھرپور جوابی کاروائی کرتے ہوئے عراق میں امریکی فوجی ٹھکانوں کو نشانہ بنائے گا اور افغانستان میں کاروائی کرتے ہوئے امریکی فضائیہ کے اعلیٰ تکنیکی صلاحیتوں کے حامل جہاز کو مار گرائے گا۔ خیال ظاہر کیا جا رہا ہے کہ خطے میں دہشت گردوں کے خلاف آپریشن کا مرکزی کردار سی آئی اے کا اعلیٰ عہدیدار جو آیت اللہ مائیک (Ayatollah Mike) کے نام سے مشہور تھا' اس حادثے میں ہلاک ہو گیا

ہے۔ تبھی تو گھبراہٹ کے عالم میں اسرائیل نے امریکہ پر زور دیا کہ صورت حال کو مزید بگڑنے نہ دیا جائے کیونکہ اس طرح جنگ سے اسرائیل کے وجود کو خطرات لاحق ہو جائیں گے۔

جرنیلوں کے باہمی تعلقات:

سوال:...... عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ جنرل کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ جب کوئی افسر جنرل بن جائے تو وہ جونیئر افسروں سے دوستی تو کجا' واقفیت بڑھانے میں بھی عار محسوس کرتا ہے۔ میں خود ایک مرتبہ ایک ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل سے ملنے گیا تو وہ مجھ سے مل کر تو بہت خوش ہوئے لیکن آنکھوں میں آنسو لیئے' انہوں نے شکایت کی' "کوئی مجھ سے ملنے نہیں آتا' میں بڑی تنہائی محسوس کرتا ہوں۔

معروف شاعر میجر ضمیر جعفری نے بھی ایک نظم لکھی تھی:

اس اونچی لال حویلی میں
اک میجر جنرل رہتا ہے

اس نظم میں انہوں نے جنرل کی تنہائی کی تصویر کشی کی ہے۔ آپ کا کیا تجربہ ہے؟

جواب:...... (مسکراتے ہوئے) نہیں' میرا تجربہ بالکل مختلف ہے۔ ان تمام افسروں اور جوانوں سے' جن کے ساتھ میں نے کام کیا ہے' میرے قریبی تعلقات ہیں۔ میں اپنے سٹاف کا پہلے ذکر کر چکا ہوں' وہ کئی دہائیوں سے میرے ساتھ ہیں۔ جب میں نے "فرینڈز" قائم کی تو کئی افسر اور دوست میرے ساتھ آ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ عزت اس وقت کماتے ہیں جب سروس میں ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں' انصاف سے کام لیں اور ان کی عزت نفس کا خیال رکھیں تو وہ آپ کی عزت کرتے ہیں اور یہ عزت ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جاری رہتی ہے۔ ان یونٹوں کے افسر اور جوان' جنہیں آپ نے کمانڈ کیا ہوتا ہے۔ آپ کے دل کے بہت قریب ہوتے ہیں اور ان سے زندگی بھر کا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ قومی سلامتی کے امور کے متعلق میرے پختہ عزم' میری

تحریروں اور تبصروں نے دوستوں اور خاندان کے ہمراہ ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی کو کہیں زیادہ بامعنی اور لطف اندوز بنادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر ہمیشہ خصوصی کرم رہا ہے اور مجھے صحت وتندرستی والی طویل عمر عطا کی ہے۔

سوال: ...... آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ اپنے کیریر میں خطرناک اتار چڑھاؤ کے باوجود آپ جنرل کے عہدے تک جا پہنچے۔ دوسرے جرنیلوں کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے ہیں؟

جواب: ...... بہت اچھے تعلقات ہیں۔ جنرل بننے کے بعد بھی ہم انسان ہی رہتے ہیں۔ انسان مل جل کر معاشرے میں رہتے ہیں۔ دوسرے انسانوں کے بغیر ان کا گزارہ ممکن نہیں۔ ہم آپس میں ملتے رہتے ہیں' خیالات اور تحائف کا تبادلہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ مجھے ایک تقریب یاد آئی:

فور سٹار جرنیلوں کی کہکشاں:

6 دسمبر 2018ء کو چیئرمین جوائنٹ چیف آف سٹاف کمیٹی جنرل زبیر محمود حیات اور نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی کے صدر لیفٹیننٹ جنرل ماجد احسان نے تینوں سروسز کے تمام فور سٹار جنرل' ایڈمرل اور ائر چیف مارشل کو نیشنل ڈیفنس یونیورسٹی میں Four Star Alumni کے قیام کے سلسلے میں دعوت دی۔ اس تقریب میں مندرجہ ذیل اعلیٰ افسران شریک ہوئے:

آرمی	نیوی	فضائیہ
جنرل شمیم عالم خان	ایڈمرل کرامت رحمٰن نیازی	ائر مارشل محمد عباس خٹک
جنرل محمد یوسف خان	ایڈمرل عبدالعزیز مرزا	ائر مارشل کلیم سعادت
جنرل محمد عزیز خان	ایڈمرل محمد افضل طاہر	ائر مارشل تنویر محمود احمد
جنرل احسن سلیم حیات	ایڈمرل نعمان بشیر	ائر مارشل راؤ قمر سلیمان
جنرل احسان الحق	ایڈمرل محمد آصف سندھیلہ	ائر مارشل طاہر رفیق بٹ

جنرل اشفاق پرویز کیانی		ایڈمرل ذکاء اللہ
جنرل راشد محمود		
جنرل زبیر محمود حیات		

تخلیق کائنات پر تدبر کی ضرورت:

بڑی باوقار تقریب تھی جس میں سب سے سینئر جنرل کی حیثیت سے مجھے خطاب کے لئے ایک بریف (Brief) دیا گیا۔ حسب عادت میں نے اس بریف کی جگہ اپنے خیالات پیش کرنے کی اجازت مانگی جو مجھے مل گئی۔ میں نے اپنی بات کا آغاز اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پاک سے کیا۔

"ایمان رکھنے والوں کے لئے' آسمانوں اور زمین میں قدرت کی نشانیاں ہیں۔"

(سورۃ الجاثیہ)

عقل والے' علم والے اور لاکھوں انسانوں کی کمان کرنے والے' حقوق العباد کی ذمہ داریاں پوری کرنے والوں کا یہ ایک نایاب اجتماع تھا جن سے خطاب کرنا میں نے اپنے لئے بڑی سعادت سمجھا۔ میں نے خطاب کیا:

جب کچھ نہ تھا تو رب ذوالجلال ہی کی ذات ساری کائنات تھی اور انسان کا خیال دل یزداں میں جاگزیں تھا جس کے لئے کائنات تخلیق کرنا مقصود تھا تا کہ اس کا امتحان لیا جائے کہ کس طرح انسان راہ حق اختیار کرتا ہے اور مقصود الٰہی کو پہنچتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کلام پاک میں کئی بار تخلیق کائنات کا ذکر کیا ہے:

☆ اللہ ہی تو ہے جس نے چھ دنوں میں سات آسمان پیدا کئے اور ویسی ہی زمینیں جن میں اللہ تعالیٰ کے احکام اترتے رہتے ہیں۔ (الطلاق ۶۵' آیۃ ۱۲)

☆ بے شک تمہارے پروردگار کا ایک دن تمہارے حساب کی رو سے ہزار سال کے

برابر ہے۔ (الحج ۲۲' آیۃ ۴۷)

اور سورۃ حم السجدہ میں زمان و مکاں کے حوالے سے تخلیق کائنات کا عمل اور ترتیب تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہے:

"اے پیغمبر! آپ کہہ دیجئے کہ تم اس اللہ کا انکار کرتے ہو اور اس کے شریک مقرر کرتے ہو جس نے دو دنوں میں زمین پیدا کر دی۔ سارے جہانوں کا پروردگار وہی ہے اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ گاڑ دیے اور اس میں برکت رکھ دی اور اس میں رہنے والوں کی غذاؤں کی مقدار بھی مقرر کر دی' کل چار دنوں میں۔ پھر آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا جو دھواں تھا۔ پس آسمانوں اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں خوشی سے آملو یا ناخوشی سے' دونوں نے عرض کیا ہم بخوشی حاضر ہیں' پس (باقی) دو دنوں میں سات آسمان بنا دیے اور ہر آسمان میں اور وہاں کی دنیا کو اس کے مناسب احکام کی وحی بھیج دی اور ہم نے "آسمان دنیا کو" چراغوں سے زینت دی اور اس کی نگہبانی کی۔ یہ تدبیر اللہ غالب و دانا کی ہے۔" (حم السجدہ ۴۱' آیۃ ۹ تا ۱۲)

سب سے پہلے اللہ تعالی نے انسان کے لئے دنیا تخلیق کی۔ دنیا جو کائنات کے مقابلے میں ایک ذرے کے برابر ہے۔ اس کو بنانے میں دو (۲) دن لگے یعنی ہمارے دو ہزار سال اور اس دنیا کو انسان کے لئے اور اللہ کی تمام مخلوق کے لئے قابل زیست بنانے اور سجانے میں مزید دو (۲) دن لگے اور باقی دو (۲) دنوں میں ساری کائنات تخلیق کر دی اور آسمان دنیا کو چاند اور ستاروں سے روشن کر دیا اور آسمانوں اور زمین کی تمام نعمتیں انسان کے لئے مسخر کر دیں۔ اس کائنات کی وسعتوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے جو ہزاروں نوری سال پر محیط ہے اور انتہائی تیز رفتاری سے اپنے مرکز یعنی رب ذوالجلال کی جانب سمٹتی جا رہی ہے۔

اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے اپنے ہاتھوں سے بنایا اور ان میں اپنی روح

پھونک دی۔ علم عطا کیا اور وہ مقام عطا کیا جو صرف اللہ تعالی کی ذات کے لئے ہے' یعنی اپنی ہی تخلیق کو معبود کا درجہ عطا کیا۔ فرشتوں اور جنات کو حکم دیا کہ سجدہ کرو۔ ابلیس نے انکار کیا' فرشتوں نے عرض کیا' "یارب ہم دن رات آپ کی عبادت کرتے ہیں' ہر حکم بجا لاتے ہیں اور تو انسان کو با اختیار بنا کر اور اپنا نائب مقرر کر کے دنیا میں بھیج رہا ہے وہ تو بڑا فتنہ پھیلائے گا۔"

اللہ تعالی نے فرمایا "مجھے اس سے بھی آگے کچھ مقصود ہے۔ میں انسان کو اپنا با اختیار نائب بنا کر دنیا میں کیوں بھیج رہا ہوں' میں جانتا ہوں' تم نہیں جانتے۔" (البقرۃ ۲ آیۃ ۳۰)۔ فرشتے اور جنات سجدہ ریز ہو گئے۔ ابلیس نے نافرمانی کی اور تا قیامت انسانوں کو گمراہ کرنے کی اجازت مانگ لی۔

اللہ تعالی نے روشن کتاب عطا کی جو نور ہدایت ہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا جو مشعل راہ بھی ہیں اور نشان منزل بھی۔ انسان' اللہ تعالی کو دنیا کی تمام ذی روح سے زیادہ محبوب ہے۔ اس محبت کا تقاضا ہے کہ انسان اس قربت کی اتھاہ گہرائیوں کو سمجھے اور ہر اس شے سے محبت کا سلیقہ اپنائے جو اللہ کی محبت سے عبارت ہے۔

خالق کائنات نے جہاں انسان کو اتنا عظیم شرف بخشا ہے وہاں اسے ایک بڑے مشکل امتحان میں بھی ڈال دیا ہے کہ وہ مقصود الہی کے حصول کے لئے راہ حق اختیار کرے' جس کی تلاش کے لیے اللہ تعالی نے بار بار ہم انسانوں کو خبردار کیا ہے کہ اس عالی مقام تک پہنچنے کے لئے "ہم نے تمہیں کان عطا کئے ہیں' تم سنتے نہیں' آنکھیں دی ہیں تم دیکھتے نہیں' دل دیا ہے تم سوچتے نہیں۔" (الاعراف ۷' آیۃ ۱۷۹)

مندرجہ بالا تجزیے سے بہت سے سوالات ذہن میں آتے ہیں۔ ان میں سے صرف چند سوالات پیش کر رہا ہوں۔ سوچئے گا اور غور کیجئے گا:

ا:..... اس کرہ ارض کو بنانے اور سنوارنے میں اللہ تعالی کے چھ ہزار سال لگے۔ یہ طویل مدت حکمت ربانی کی دلیل ہے۔ تخلیق کائنات کا یہ عمل بگ بینگ (Big Bang)

کیسے کہا جا سکتا ہے؟

۲:۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ نے سات آسمان بنائے اور ویسی ہی دنیائیں بھی' جہاں اللہ تعالیٰ کے احکامات اترتے رہتے ہیں۔ کیا دوسری دنیاؤں میں ہماری دنیا کی طرح باشعور مخلوق موجود ہے' جن پر اللہ کے احکامات اترتے ہیں؟

۳:۔۔۔۔ یہ دنیا جسے اللہ تعالیٰ نے اتنے پیار سے بنایا ہے' اس سے ترک دنیا کیسے ممکن ہے جبکہ ہماری زندگی کا اسلوب یہ ہے کہ ہم اس دنیا کے ہی ہو کے نہ رہ جائیں۔

۴:۔۔۔۔ ہمارے دین کی بنیادیں حقوق اللہ اور حقوق العباد کے ستونوں پر قائم ہیں جبکہ اس دنیا سے اللہ کی محبت اور مخصوص توجہ اس بات کی متقاضی ہے کہ ہمارے دین کا تیسرا ستون حقوق الارض تسلیم کر لیا جائے تو حق ادا ہو جائے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ لاپرواہ انسانی عمل کے سبب ہماری دنیا خطرناک حالات سے دوچار ہے جسے ماحولیاتی سلامتی (Environmental Security) کا نام دیا گیا ہے۔ اپنا فرض سمجھتے ہوئے اگر بنی نوع انسان نے تدابیر اور احتیاط سے کام نہ لیا تو خود اس کا اپنا وجود خطرے میں پڑ جائے گا۔ خالق کائنات نے کتنے پیار سے یہ دنیا بنائی ہے' سجائی ہے اور زمین و آسمان کی تمام نعمتیں انسان کے لئے مسخر کر دی ہیں تو انسان پر حقوق الارض واضح ہوتا ہے۔

۵:۔۔۔۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''میں تمہارے اور دل کے درمیان حائل ہوں۔

(الانفال:۲۴)

لامحدود اور محدود کا تصور اللہ کے اس حکم سے واضح ہے۔ سوال یہ ہے کہ ''اللہ لامحدود ہے اور انسانی وجود محدود ہے' تو ایک لامحدود حقیقت محدود انسانی وجود میں کیسے سما سکتی ہے؟

حقوق اللہ' حقوق العباد اور حقوق الارض کی ادائیگی رضائے الٰہی ہے' مقصود الٰہی بھی ہے۔ یہی ہماری عارضی زندگی کا کٹھن سفر ہے جو اللہ' انسان اور دنیا کی محبتوں سے عبارت ہے۔ ایک اتھاہ سمندر کی مانند ہے جس کی گہرائیوں میں ''مقصود الٰہی'' کا گوہر پنہاں ہے جسے

پالینا ارتقائے آدمیت ہے۔

ہر سال یوم شہداء بڑی عقیدت و احترام سے منایا جاتا ہے۔ جی ایچ کیو میں تقریب منعقد ہوتی ہے جس میں شہداء کے لواحقین کو خصوصی طور پر مدعو کیا جاتا ہے اور ان کے احترام میں افواج پاکستان' سیاسی و سفارتی اور قوم کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی محترم شخصیات کو دعوت دی جاتی ہے۔ بڑی پروقار تقریب ہوتی ہے۔ 2017ء کو منعقد ہونے والی ایسی ہی ایک تقریب میں افواج پاکستان کے تینوں شعبوں کے 4 اسٹار حاضر سروس و ریٹائرڈ آفیسرز کا ایک گروپ فوٹو ہے جو بڑا یادگار ہے' جسے میں 4 اسٹار گلیکسی کہتا ہوں' جس کا ایک فرد ہونا میرے لئے بڑا اعزاز ہے۔

THE FOUR STAR GALAXY 2017

جی ایچ کیو میں ہونے والے ایک اجتماع میں مسلح افواج کے حاضر سروس اور ریٹائرڈ سربراہوں کا گروپ فوٹو

ہماری شناخت کی پہچان کی علامتیں:

سوال:۔۔۔۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے میرے سوالوں کے جواب بڑے تحمل اور سکون سے دیے: آخری سوال' بحیثیت قوم اور امت مسلمہ کے ایک رکن کے ہماری پہچان کیا ہے؟

جواب:.....جنرل صاحب کچھ دیر خاموش رہے' پھر مجھے اپنے ساتھ ملحقہ مہمانوں کے کمرے (Visitors Room) میں لے گئے۔دیوار پر لگی ایک بڑی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

جنرل اسلم بیگ کے گھر میں لگی ہوئی خانہ کعبہ کی تصویر جسے وہ امت مسلمہ کی پہچان کی علامت کہتے ہیں

☆یہ دیکھئے' یہ خانہ کعبہ کی تصویر ہے جو تقریباً135 سال پرانی ہے۔اس کے چاروں اطراف ہمارے چار بزرگ اماموں کے حجرے ہیں: امام شافعیؒ، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، جنہوں نے ہماری نظریاتی اور دینی سوچ اور قدروں کو اللہ اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے راستے اور مقام پر قائم رکھا ہے اور ہماری نظریاتی سمت قائم رکھی ہے۔

☆یہ ہمارا نیشنل اسٹینڈرڈ ہے۔'اللہ اکبر'اس کی شان ہے کہ کسی کے آگے سرنگوں نہیں ہوتا۔یہ ہماری شان اور پہچان ہے۔

☆دوسری طرف بری فوج کا علم ہے جو ہمارے عزم و ہمت کا نشان ہے' جس کی عظمت کے لئے ہر سپاہی فصیل جاں سے آگے گذر جانے میں معراج آدمیت سمجھتا ہے۔

☆سبحان اللہ' کیا ہی شان والی پہچان ہے۔

☆''گھڑی یہ بتاتی ہے کہ ہر گذرتا ہوا لمحہ ہماری مستعار زندگی سے عبارت ہے۔اسے ضائع مت ہونے دو۔اس کی ہر ٹک ٹک ہمارے دلوں کی دھک دھک ہے' جو دراصل حق' حق کی صدا ہے جو ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اللہ ہمارے وجود اور دل کے درمیان حائل ہے اور متقاضی ہے کہ زندگی کے اہم فیصلے کرتے وقت دل سے سوچ' دل سے رجوع کرو۔کامیابی کی ضمانت یہی ہے۔''ماشاء اللہ۔

کرنل اشفاق حسین کے قلم سے جنٹلمین سیریز

● جنٹلمین بسم اللہ:۔۔۔۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی میں کیڈٹ کے شب و روز۔ پاک فوج کے ہر افسر پر گزرنے والے ہوش ربا لمحات کی شگفتہ اور مجسم داستان۔ نوجوانوں میں بے انتہا مقبول۔

● جنٹلمین الحمد للہ:۔۔۔۔ کمیشن ملنے کے بعد مصنف کے تجربات۔ شمالی علاقوں کی بلندیوں سے کراچی جیسے بارونق شہر تک مصنف جہاں بھی گئے پیش آمدہ واقعات کی دلچسپ کہانی لکھ دی جیسے مارشل لاء ہیڈ کوارٹر میں کھلنے والے شگوفے، ایک جنرل کی گرفتاری اور دیگر کئی واقعات۔

● جنٹلمین اللہ اللہ:۔۔۔۔ سعودی عرب میں ان علاقوں کا شگفتہ سفر نامہ جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے جیسے مدائن صالح، مغائر شعیب، اصحاب اخدود کی بستی، تاریخ کے جھروکوں میں جھانکتا دلچسپ سفر نامہ۔ پاک فوج اور سعودی جیش کے درمیان مترجم کے فرائض انجام دیتے ہوئے عربی کی قلابازیاں۔

● جنٹلمین سبحان اللہ:۔۔۔۔ مختلف اخبارات و رسائل میں چھپنے والے مضامین کا انتخاب۔ صحرائے تھر میں زندگی گزارنے کی مشکلات۔ صومالیہ کا سفر نامہ اور حیدر آباد جیل میں ایک مجرم کو پھانسی دیے جانے کا آنکھوں دیکھا حال۔ ملٹری کالج جہلم کی ری یونین اور فوج میں فائرنگ کے مقابلوں کی رپورتاژ۔ نئے صحافیوں کے لیے مشکل اور پیچیدہ موضوعات پر رپورٹ لکھنے کے لیے رہنما کتاب۔

● جنٹلمین استغفر اللہ:۔۔۔۔ مصنف کی کتاب Witness to Blunder کا اردو ترجمہ۔ کارگل کی مہم جوئی کے بارے میں اصل حقائق۔ نوجوان افسروں کی بے جگری سے لڑنے والی بہادری اور شجاعت کی عظیم سچی کہانیاں۔

● جنٹلمین فی الارض اللہ:۔۔۔۔ مصنف نے قرآن میں مذکور مقامات کا مشاہدہ کرنے کے لیے مصر، اردن، عراق اور ترکی کا سفر کیا۔ عراق میں وہ اسامہ بن لادن کے ساتھی ہونے کے الزام میں گرفتار بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے امریکہ، لندن اور یورپ کے کئی شہروں جیسے فرانس، بلجیم، فن لینڈ کا سفر بھی کیا۔ یہ کتاب انہی ممالک کا سفر نامہ ہے۔ انداز بیان اتنا دلچسپ کہ قاری خود کو ان کے ساتھ ساتھ محسوس کرتا ہے۔ گھر بیٹھے آدھی دنیا کی سیر کرنے کے لیے دلچسپ کتاب۔

دوسری کتابیں

● فاتح سبونہ:۔۔۔۔ پاک فوج کے سب سے زیادہ تمغہ یافتہ افسر میجر شبیر شریف کی سوانح حیات۔ پاکستان ملٹری اکیڈمی سے انہوں نے اعزازی شمشیر حاصل کی۔ 1965ء کی جنگ میں ستارۂ جرأت حاصل کیا اور 1971ء کی جنگ میں نشانِ حیدر، جو ایک منفرد اعزاز ہے۔ سسپنس سے بھرپور، شجاعت اور ذہانت کے دلچسپ واقعات۔

● Witness to Blunder:۔۔۔۔ کارگل کی جنگ کے بارے میں اصل حقائق۔ سینیٹر پروفیسر خورشید احمد، جنرل مرزا اسلم بیگ، ممتاز صحافی ایاز میر اور اس وقت کے سیکرٹری برائے امور خارجہ شمشاد احمد خان کے مفصل اور نئے انداز کے تبصرے۔ ہمارے افسروں کی بہادری کی ہوش ربا سچی کہانیاں۔

● امریکہ سے ہجرت:...... ایک امریکی لڑکی کی دلچسپ کہانی جو نیویارک کے ایک خوشحال یہودی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ سچائی کی تلاش میں انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ اس کے بعد وہ مستقل طور پر پاکستان آ گئیں۔ انہوں نے یہیں ایک پٹھان خاندان میں شادی کی اور یہیں وفات پائی۔ اسلام سے سچی محبت کی ایمان افروز کہانی۔ ان کی انگریزی کتاب At home in Pakistan کا انتہائی سلیس اور رواں ترجمہ۔

● برف کے قیدی:...... انگریزی کتاب Alive کا اردو ترجمہ۔ ایک رگبی ٹیم کی کہانی جن کا جہاز جنوبی امریکہ کے برف پوش پہاڑوں میں گر کر تباہ ہوگیا۔ جب جہاز میں موجود کھانے پینے کی اشیاء ختم ہوگئیں تو مجبوراً انہیں مرجانے والے مسافروں کی لاشیں کھانا پڑیں۔ بچ نکلنے کا راستہ ڈھونڈنے کی مہم کی تجسس بھری، رونگٹے کھڑے کردینے والی سچی کہانی۔
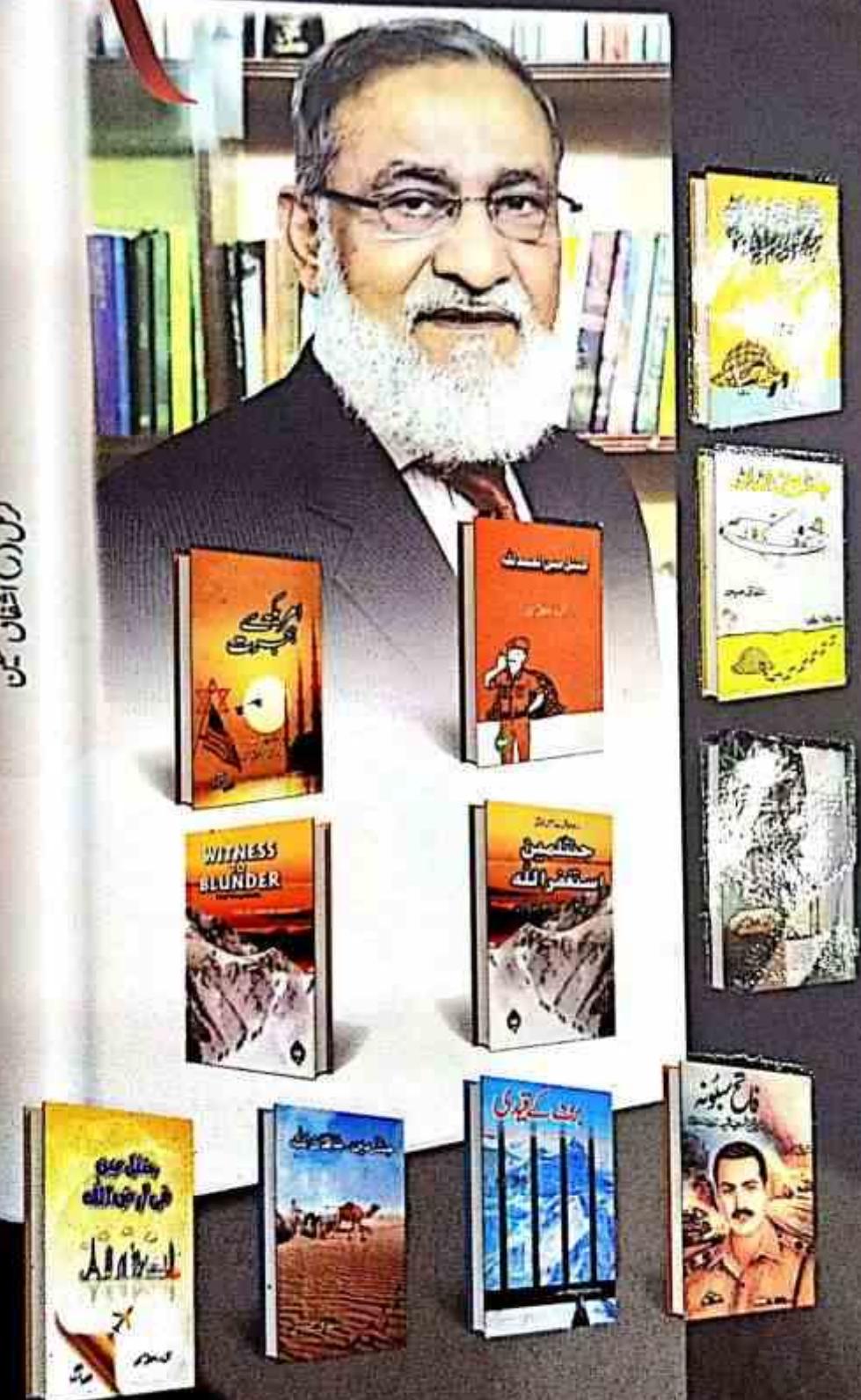
● عربی کے سولہ سبق:...... جو لوگ عرب ممالک میں بولی جانے والی عربی اور قرآن کو براہ راست سمجھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے ایک مختصر کتاب۔ عربی گرائمر کے پیچیدہ اور مشکل قواعد کو مصنف نے انتہائی آسان زبان میں بیان کیا ہے جس سے قارئین کتاب سے بھرپور استفادہ کرسکتے ہیں۔ تمام اسباق ریکارڈ کر کے انٹرنیٹ پر بھی ڈال دیے گئے ہیں جس سے افہام وتفہیم میں مزید مدد ملتی ہے۔

☆......☆......☆

Scanned with CamScanner